اُردو ڈائجسٹ

ستمبر ۲۰۲۰ء

www.urdudigest.pk
urdudigest.pk

خوش گوار موسم میں
ان گنت تماشائی
اپنی اپنی ٹیموں کو
داد دینے آتے ہیں
اپنے اپنے پیاروں کا
حوصلہ بڑھاتے ہیں
میں الگ تھلگ سب سے
بارہویں کھلاڑی کو
ہوٹ کرتا رہتا ہوں
بارہواں کھلاڑی بھی
کیا عجب کھلاڑی ہے
کھیل ہوتا رہتا ہے
شور مچتا رہتا ہے
داد پڑتی رہتی ہے
اور وہ الگ سب سے
انتظار کرتا ہے
ایک ایسی ساعت کا
ایک ایسے لمحے کا
جس میں سانحہ ہوجائے
پھر وہ کھیلنے نکلے
تالیوں کے جھرمٹ میں
ایک جملۂ خوش کن
ایک نعرۂ تحسین
اس کے نام ہوجائے
سب کھلاڑیوں کے ساتھ
وہ بھی معتبر ہوجائے
پر یہ کم ہی ہوتا ہے
پھر بھی لوگ کہتے ہیں
کھیل ہے کھلاڑی کا
عمر بھر کا رشتہ ہے
عمر بھر کا یہ رشتہ
چھوٹ بھی تو سکتا ہے
آخری وِسل کے ساتھ
ڈوب جانے والا دل
ٹوٹ بھی تو سکتا ہے
تم بھی افتخار عارف
بارھویں کھلاڑی ہو
انتظار کرتے ہو
ایک ایسے لمحے کا
ایک ایسی ساعت کا
جس میں حادثہ ہوجائے
جس میں سانحہ ہوجائے
تم بھی افتخار عارف
تم بھی ڈوب جاؤ گے
تم بھی ٹوٹ جاؤ گے

شہر کراچی اور اس کے مکین بھی بارھویں کھلاڑی ہیں، انتظار کرتے ہیں
ایک ایسی ساعت کا، ایک ایسے لمحے کا جس میں سانحہ ہوجائے پھر وہ کھیلنے نکلیں...

PakistaniPoint

اُردو ڈائجسٹ

ستمبر 2020ء
محرم الحرام 1442ھ
جلد نمبر 60 شمارہ نمبر 9

urdudigest.pk | www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: سیّد عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
ڈیزائنر: کاشف شہزاد
کمپوزر: رانا محمد سلیم

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
کاشرہ کرم: 0307-0060707

سالانہ خریداری 740 روپے کی بچت کے ساتھ

خریداری کے لیے رابطہ subscription@urdudigest.pk
فون: +92-42-35290707

پاکستان 2115 کے بجائے 1375 روپے میں۔
بیرون ملک 110 امریکی ڈالر اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ
درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس اپنی تحریریں اِس پتے پر بھیجیں

G-III, 325 جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 130 روپے

طابع وناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ مکلوڈ روڈ سے چھپوا کر سن آباد لاہور سے شائع کیا

ایگزیکٹو ایڈیٹر نوٹ

تخریب کے پردے میں ہی تعمیر ہے ساقی

مون سون بارشوں کے حالیہ سلسلے نے عروس البلاد کراچی میں تباہی مچادی۔ شہر بارش کے پانی میں ڈوب گیا۔ ڈی ایچ اے اور کلفٹن کے علاقوں میں چھے سے سات فٹ پانی کھڑا ہے۔ مارکیٹوں اور دکانوں میں موجود اربوں روپے کا تجارتی سامان کچرے کا ڈھیر بن چکا۔ کوڑے کرکٹ اور گندگی سے سارا شہر تعفن اور بدبو کی آماج گاہ بنا ہوا ہے۔ بارش کا پانی آسمان سے باتیں کرتی عمارتوں کی بنیادیں کمزور کررہا ہے جو کسی بھی وقت زمین بوس ہوجانے کے خطرے سے دوچار ہیں۔ سڑکیں اور انڈر پاس پانی سے بھر گئے اور کتنے ہی شہری اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایسی آفت کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی۔

کیا امیر، کیا غریب سبھی اس کی زد میں ہیں۔ اہل کراچی بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں اور ان میں حکومتی اداروں کے خلاف غیض وغضب بڑھتا جارہا ہے۔ یہی مرتبہ پوش آبادیوں کے مکین سڑکوں پر مظاہرے کررہے اور اپنے ٹیکسوں کا حساب مانگ رہے ہیں۔ سیلاب سے ہونے والے نقصان کا اندازہ دو سو ارب روپے سے زیادہ ہے۔

خدا خدا کر کے کرونا کی وبا کا زور کم ہوا تھا اور بدحال معیشت اس کے اثرات سے ابھی نکلی نہ تھی کہ بارش اور سیلاب کی شکل میں ایک اور آزمائش سے اہل وطن دوچار ہوگئے۔ قدرتی آفات کو روکنا کسی کے بس میں نہیں ہوتا لیکن بہتر حکمت عملی سے نقصان کم سے کم کیا جاسکتا ہے۔ کراچی کا مگر المیہ یہ ہے کہ نہ تو حکومتوں نے اس شہر کی منصوبہ بندی میں دلچسپی لی اور نہ ہی عوام الناس نے کسی ندی نالے پر غیر قانونی تعمیرات سے گریز کیا۔ شہر سے گزرنے والے برساتی نالوں پر عمارات کھڑی کردی گئیں اور پانی کی گزرگاہیں تنگ ہوتی گئیں۔ مزید ظلم بلدیہ عظمیٰ کے کارپردازوں نے برساتی نالوں میں سیوریج ڈال کر کیا جس سے یہ ٹھوس فضلات سے بھر گئے۔ نتیجتاً بارش کے پانی کو شہر سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہ ملا اور وہ شہر بھر میں گندگی اور تباہی کی داستانیں رقم کرتا چلا گیا۔

دوسری طرف معاشی پنڈت، ایک ابھرتے ہوئے خطرے کی

PakistaniPoint

اطلاع دے رہے ہیں۔ کرونا وبا کے اثرات کم کرنے کے لیے حکومتوں نے بینکوں سے قرضے لے کر اور نوٹ چھاپ کر عوام میں پیسے تقسیم کیے جس سے وقتی ریلیف ضرور ملا مگر اب جب یہ قرض واپس کرنے ہیں تو حکومتوں کے پاس پیسہ نہیں جس سے نادہندگی کی ایک بڑی لہر جنم لے سکتی ہے جو مستقبل میں قلّتِ زر (Deflation) کو پیدا کرے گی۔ قلّتِ زر کسی بھی معیشت کے لیے نہایت خطرناک امر ہے۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے اشیا کی خریداری نہیں ہوتی، نتیجے میں کمپنیاں مصنوعات کی پیداوار کم ہونے پر ملازموں کو نوکریوں سے نکالنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ یوں بے روزگاری کا سیلاب معاشرے کو انارکی اور خانہ جنگیوں میں دھکیل دیتا ہے۔

کٹھن حالات کا سامنا ہر قوم کو کرنا پڑتا ہے لیکن قدرت انھی میں آگے بڑھنے کے مواقع بھی پوشیدہ رکھتی ہے۔ مسائل سے نمٹنے کے لیے منصوبہ بندی، مستقل مزاجی سے محنت اور صبر ایسی خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وہ عوامل ہیں جن پر کاربند ہو کر ہمارا عظیم ہمسایہ ملک چین غربت اور معاشی مسائل کی دلدل سے نکل کر دنیا میں بطور سپر پاور اپنی حیثیت منوا چکا۔ چینی قوم نے چاول کی کاشت کرنے والے کسان سے مستقل مزاجی، محنت اور صبر کے ساتھ نتائج کے انتظار کا مزاج سیکھا۔ چینی صدیوں سے چاول اُگا رہے ہیں۔ دنیا نے چاول کا بیج اور اس کی کاشت کا طریقہ انھی سے سیکھا۔ گندم، مکئی اور کماد کی نسبت چاول دس سے بیس گنا زیادہ محنت مانگتا ہے، جس کا آغاز زمین کی تیاری سے ہوتا ہے مثلاً پانی کی سطح یکساں رکھنے کے لیے کھیت ہموار کرنا، پانی ضائع ہونے سے بچانے کے لیے کھیت کے گرد خاص انداز سے منڈیریں بنانا، کھیت میں مٹی کی اوپری سطح نرم رکھنا تاکہ پنیری لگانے میں آسانی ہو اور نچلی سطح سخت جس سے پانی زمین میں جذب نہ ہو۔ بہترین پیداوار کے لیے درجنوں اقسام کے بیجوں سے زمین کی زرخیزی اور آب و ہوا مدّنظر رکھتے ہوئے بہتر انتخاب کرنا کسان کی ذہانت اور فنی مہارت پر منحصر ہوتا ہے۔ دھان کی پنیری خاص طریقے سے بنائی گئی کیاریوں میں اُگائی جاتی ہے، پھر چند ہفتوں بعد اسے بڑی احتیاط کے ساتھ کبڑے ہو کر چلچلاتی دھوپ میں کھیت میں لگایا جاتا ہے اور اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ ہر پودے کے درمیان ایک جیسا فاصلہ رہے۔ فصل کو متعدد مواقع پر کھاد کی ضرورت پڑتی ہے، جس کی مقدار اور وقت کا تعین بہت اہم ہوتا ہے کیونکہ بے وقت یا زیادہ کھاد پیداوار کو سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ فصل سے جڑی بوٹیاں تلف کرنے کے لیے کسان کو روزانہ کھیت میں چکر لگانا پڑتے ہیں۔ فصل پکنے تک تقریباً تین ماہ کھیت میں پانی کی سطح مقررہ حد میں رکھنے کے لیے کسان کو بہت مستعد رہنا ہوتا ہے۔ دلدلی زمین میں بار بار پانی کی سطح جانچتے ہوئے اس بات کا اہتمام بھی کرنا پڑتا ہے کہ پانی دھوپ سے گرم ہو کر فصل کو نقصان نہ پہنچائے۔ جب فصل پکنے کے قریب ہوتی ہے تو چوہے فصل پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ ان کا شکار کرنے کے لیے سانپ بھی کھیتوں میں بسیرا کر لیتے ہیں۔ کسان کو چوہوں اور سانپوں کی دوہری مصیبت سے نمٹنا ہوتا ہے۔ کئی مرتبہ کسان سانپ ڈسنے سے اپنی جان بھی ہار جاتے ہیں۔ فصل کے پکنے پر کسان اپنے رشتے داروں اور دوستوں کو اکٹھا کر کے ٹیم بناتا اور ایک ہی ہلے میں بڑے منظم انداز سے تمام فصل کاٹ کر اٹھا لیتا ہے تاکہ وقت ضائع کیے بغیر اگلی فصل بوئی جا سکے۔ چاول کی کاشت کے دوران کسان ان تمام مراحل سے گزرتا ہے جن سے ایک راہنما کا واسطہ پڑتا ہے۔ منصوبہ بندی، ٹیم سازی، محنت، حالات کے مطابق حکمت عملی میں تبدیلی، یکسوئی اور صبر ایسے معاملات ہیں جو قوموں کو بامِ عروج تک پہنچاتے ہیں۔

کرونا اور قدرتی آفات کے ذریعے خالقِ کائنات نے ہمیں یہ پیغام دیا ہے کہ ہم اپنا چلن درست کر لیں۔ ہر شعبہ میں ماضی کی غلط کاریوں کی تلافی کریں، ذاتی مفادات کی خاطر اجتماعی مفادات قربان نہ کریں اور مصیبت کی اس گھڑی کو وطن کی تعمیرِ نو کا موقع سمجھیں۔ بقول شاعر

تخریب کے پردے میں ہی تعمیر ہے ساقی
شیشہ کوئی پگھلا ہے تو پیمانہ بنا ہے

طیب اعجاز قریشی

پڑھیے، پڑھائیے اور لطف اٹھائیے

فہرست

ستمبر 2020

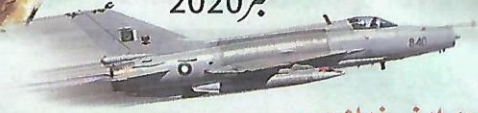

کچھ اپنی زبان میں

انصاف کے آسان حصول کا نظام ... آزاد، غیر جانبدار، حرص و ہوس سے پاک عدلیہ ناگزیر ہے — الطاف حسن قریشی — 11

ہم کہاں کھڑے ہیں

مسائل کی یلغار میں سلامتی کا راستہ ... معیشت کی زبوں حالی نے ہمیں کاسۂ گدائی تھما دیا — الطاف حسن قریشی — 13

عالمِ تمام

گریٹر اسرائیل ... کیا اسرائیلی حکومت کی تیسرے ہیکلِ عثمانی کی تعمیر تک رسائی ہوجائے گی؟ — سید عاصم محمود — 19

محرم الحرام

سیدہ زینبؓ کی شانِ استقامت ... وہ اپنے والد اور والدہ کی خطابت کی امین تھیں — ڈاکٹر سید افسر امام زیدی — 34

یادِ رفتگاں

بلریا گنج سے جنت البقیع تک .... بانکے رام جو ڈاکٹر ضیا الرحمٰن کے نام سے امر ہوگئے — عرفان صدیقی — 41

دفاعِ پاکستان

6 ستمبر اور شہدا کا خون ... لا الہ الا اللہ پڑھنے والی قوم دنیا کے لیے سیسہ پلائی دیوار ہے — مولانا امیر حمزہ — 111

افسانے/کہانیاں

محبت فاتح عالم ... نفرت کے جلتے الاؤ کو مساوات کے ایک فیصلے نے گلزاروں میں بدل دیا — جاوید اقبال — 55

مواخات مدینہ ... کیا ۱۴۰۰ سال بعد بھی ہم اس قابل نہیں کہ اس کارِ خیر کا حصہ بن سکیں — صبیحہ عماد — 70

اور بتی بجھ گئی ... وہ دو گہرے آنسو اپنے اندر ایک انمول راز سموئے ہوئے تھے — ہری کانت/جہانگیر عباسی — 175

شیشہ ... ایسے معصوم شکوہ کناں کی کہانی جس کا کوئی راز داں نہ تھا — فرینک او کانر/حسن ہاشمی — 188

جاسوسی کی دنیا

"را" پاکستانی ایٹم بم کے تعاقب میں ... بھارتی اسپائی چیف کے قلم سے ڈرامائی داستان — ابو صارم — 57

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

اس صدی کے سب سے بڑے محدث

ڈاکٹر ضیاالرحمٰن اعظمی

کی حیرت افزا کہانی

عرفان صدیقی کے قلم سے 41

طنز و مزاح

اک حسرتِ تعمیر... گھر بنانے کی چاہ میں میاں بیوی کی لطیف نوک جھونک — رفیع الدین احمد 149

رضیہ کی رضائی... ان کی زبان پر بیٹی کے سسرال میں بس جانے کی دعا مستقل رہتی — منصور احمد ملک 161

اُردو کی آخری کتاب... مزاح کی دنیا کے بے تاج بادشاہ کے سدا بہار قلم کی جولانیاں — ابن انشا 169

کاغذی ہے پیرہن... مصنف کی زبانی اخبار بینی کے دلچسپ و مزیدار فوائد و نقصانات — ڈاکٹر رؤف پاریکھ 185

گھاس کی جڑیں... نادان عوام نہیں جانتے کہ اُن کی بھلائی یا برائی کس بات میں ہے — ابوالامتیاز۔س مسلم 196

اب پچھتائے کیا ہوت... اپنی موت کے مناظر جاگتی آنکھوں سے دیکھنے والی چلبلی لڑکی کی کہانی — زیبا عزیز 205

طب و صحت

گڈبائے شوگر... بے شمار نیم حکیموں اور فریبوں سے روشناس کروانے والی بیماری کا احوال — ایڈووکیٹ زاہد عرفان 105

کالا موتیا... یہ آنکھوں کے امراض کا ایک مکمل گروہ ہے مگر اندھاپن نہیں کہلاتا — ڈاکٹر رضوان سید 210

آپ بیتی

سفر بخیر مسافر من... شہریت کا لباس بدلنے سے اندر کا خالص پاکستانی مر نہیں جاتا — ڈاکٹر انیس الرحمٰن 97

تاریخ بند

انگریز کلرک نے اسلامی ہندوستان پر قبضہ کیونکر جمایا؟... تاریخ کے اوراق پلٹتی ناقابلِ فراموش حقیقت — سید عاصم محمود 74

ناقابلِ فراموش

مرنے کے بعد... برسوں بعد چچا کی یاد آنے پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے — مقبول جہانگیر 137

حقیقت میں ڈھلتا ڈراؤنا خواب

"گریٹر" اسرائیل

یہودیوں کے انوکھے عقیدے کی

تخیر خیز داستان 19

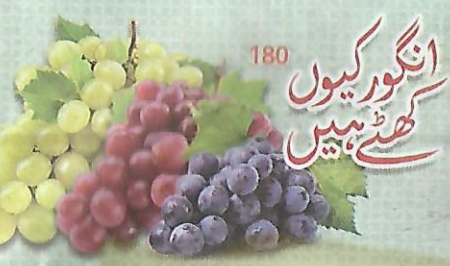

انگور کیوں کھٹے ہیں 180

کشمیر کی آشا 121

سیر و سیاحت

کشمیر کی آشا... کشمیری عوام پاکستانی پرچم حاصل کرنے کے لیے چھینا جھپٹی کرتے ہیں — قاضی ظہور الدین — 121

غذائیات

انگور کھٹے ہیں... رس بھرے دیدہ زیب پھل کا نافع تذکرہ، جسے دیکھ کر جی للچا جائے — محمد عثمان حمید — 180

فخر پاکستان

صائمہ سلیم اور نرجس ماڈلوالہ کا روشن سفر... جنھوں نے وطنِ عزیز کی شان میں چار چاند لگا دیے — عافیہ مقبول جہانگیر — 89

منتخب کالم

بھٹو، ضیاالحق اور دائیں بازو کے صحافی... سیاسی زندگی کے عجب رنگ دکھلاتی تاریخ کا آئینہ — رؤف طاہر — 95

مشورہ حاضر ہے

منفی رویوں کا زہر... ہمارا معاشرہ انسانیت اور اخلاق کے جواہر سے انتہائی محروم کیوں ہے؟ — ڈاکٹر فیاض ہرل — 129

روداد

ہجرت ہی مقدر... ہزار دشواریوں کے باوجود اپنی راہ پر ڈٹے رہنے والے کمانڈر کی کہانی — لیفٹیننٹ کمانڈر (ر) علی محمد بھٹی — 153

فکر و آگہی

روح کی تبدیلی... خوش قسمت لوگ انسانیت کے گروہ میں زیادہ خوبصورت بن کر اُبھرتے ہیں — اشفاق احمد — 165

سائنس و ٹیکنالوجی

بلیک باکس... ایک بے حد مفید ڈیوائس جو فضائی حادثوں کی گتھیاں سلجھا دیتی ہے — رانا محمد شاہد — 201

کھیل کھلاڑی

اولمپک کھیل... عالمی بھائی چارہ اور مثبت محرکات کو جنم دینے والی حسین روایت — شیخ عبدالحمید عابد — 213

مستقل سلسلے

شعر و سخن ... 217 — تبصرہ کتب ... 221 — چمن خیال ... 228 — اردو کہاوتیں ... 199

PakistaniPoint

دنیا کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی

”را“ پاکستانی ایٹم بم کے تعاقب میں

اُن دِنوں کی ڈرامائی اور طلسماتی کہانی 57

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کا قرآن

شہید کا درجہ

تو ایسے اشخاص بھی ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا
یعنی انبیاء اور صدیقین اور شہداء اور صالحین اور یہ بہت اچھے رفیق ہیں۔ (سورہ النساء۔69)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جاتے ہیں ان کے بارے میں یہ نہ کہو
کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تمہیں خبر نہیں۔ (سورہ البقرہ۔154)

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے گئے ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں
کھاتے پیتے ہیں وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی
اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں
کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے وہ خوش ہوتے ہیں
اللہ کی نعمت اور فضل سے اور اس بات سے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں فرماتے۔ (سورہ آل عمران۔169-171)

ایمان والوں میں کچھ مرد ایسے ہیں کہ انھوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اسے سچ کر دکھلایا
پھر بعض تو ان میں سے وہ ہیں جنہوں نے اپنا ذمہ پورا کر لیا اور بعض ان میں سے
(اللہ کی راہ میں جان قربان کرنے کے لیے) راہ دیکھ رہے ہیں اور وہ ذرہ (برابر) نہیں بدلے۔

(الاحزاب 23)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صلی اللہ علیہ وسلم

رسول اللہ کا فرمان

شہید کا درجہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
شہداء جنت کے دروازے پر دریا کے کنارے ایک محل میں رہتے ہیں اور ان کے لیے صبح شام جنت سے رزق لایا جاتا ہے۔
(مسند احمد۔ مصنف ابن ابی شیبہ۔ المستدرک۔ صحیح علی شرط مسلم)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
جب بندے قیامت کے دن حساب کتاب کے لیے کھڑے ہوں گے تو کچھ لوگ اپنی تلواریں گردنوں پر اُٹھائے ہوئے آئیں گے
ان سے خون بہ رہا ہوگا وہ جنت کے دروازوں پر چڑھ دوڑیں گے پوچھا جائے گا یہ کون ہیں۔
جواب ملے گا یہ شہداء ہیں جو زندہ تھے اور انہیں روزی ملتی تھی۔
(الطبرانی۔ مجموعہ الزوائد)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
کوئی شخص جنت میں داخل ہونے کے بعد یہ تمنا نہیں کرے گا کہ اسے دنیا میں لوٹایا جائے
یا دنیا کی کوئی چیز دی جائے سوائے شہید کے کہ وہ تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں لوٹایا جائے اور دس بار شہید کیا جائے
یہ تمنا وہ اپنی (یعنی شہید کی) تعظیم (اور مقام) دیکھنے کی وجہ سے کرے گا۔ (بخاری۔ مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:
قرض کے سوا شہید کے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ ایک روایت میں
الفاظ اس طرح ہیں اللہ کے راستے میں قتل ہو جانا قرض کے سوا ہر گناہ کا کفارہ ہے۔
(مسلم شریف)

انصاف کے آسان حصول کا نظام

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن مجید میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کتاب مقدس میں یہ حکم بھی موجود ہے کہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرو چاہے وہ تم پر بہت شاق ہی کیوں نہ گزرے۔ ہماری سیاسی جماعتیں اپنے انتخابی منشور میں یہ وعدہ ضرور شامل کرتی ہیں کہ ہم انصاف لوگوں کی دہلیز پر پہنچائیں گے، مگر اس بلند بانگ دعوے پر عمل درآمد دیکھنے میں نہیں آتا۔ اسی وجہ سے ہمارے معاشرے میں بڑے پیمانے پر معاشرتی بگاڑ پھیلتا جارہا ہے، جرائم بڑھ رہے ہیں اور قانون کی حکمرانی روز بروز معدوم ہوتی جارہی ہے۔ مقدمات کے فیصلے بعض اوقات سالہا سال لٹکے رہتے ہیں اور غریب لوگ دھکے کھاتے اور بے انصافی کی چکّی میں پستے چلے جاتے ہیں۔ عدالتی فیصلوں میں تاخیر کے اسباب مقدمات کی بھرمار، عدالتوں کی مایوس کن حد تک کمی اور منصفوں کے تقرر کا غیر معیاری نظام ہیں۔

ہمیں عوام کے لیے انصاف کے حصول کو آسان اور یقینی بنانے کو اپنی اوّلین ترجیحات میں شامل کرنا اور بنیادی اہمیت کے قدم اُٹھانا ہوں گے۔ ہر سطح پر مقدمات کے تناسب سے عدالتوں اور جج صاحبان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ جج صاحبان کی کارکردگی مثالی ہونی چاہیے۔ ہمیں بے اختیار جسٹس اے آر کارنیلیس، جسٹس رستم کیانی، جسٹس شفیع الرحمٰن، جسٹس شبیر احمد، جسٹس عبدالحلیم، جسٹس ظفر صمدانی اور جسٹس سجاد علی شاہ یاد آتے ہیں۔ اُنھوں نے قانون کی حکمرانی قائم کرنے، عدلیہ کی آزادی کا تحفظ کرنے اور بلاخوف وخطر مقدمات کا فیصلہ سنانے کی اعلیٰ روایات قائم کی تھیں۔ وہ عظمت کا مینار تھے اور زیادہ تر مقابلے کے امتحان کے ذریعے جوڈیشری میں آئے تھے۔ جسٹس اے آر کارنیلیس نے 1955ء میں فیڈرل کورٹ کے ایک متنازع فیصلے میں اپنا اختلافی نوٹ لکھا تھا جو گورنر جنرل ملک غلام محمد کے خلاف دستور ساز اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیز الدین خاں نے دائر کیا تھا۔ اب ہماری بدقسمتی سمجھیے کہ چیف جسٹس محمد منیر نے دستور ساز اسمبلی کی تحلیل کو جائز قرار دے دیا تھا۔ اس فیصلے نے پاکستان کی سیاسی اور آئینی تاریخ کا رُخ غلط سمت میں موڑ دیا اور قانون کا ایک ہولناک خلا پیدا ہوگیا تھا۔ فاضل جسٹس کارنیلیس نے اپنے اختلافی فیصلے میں اس غلط روش کے آگے بند باندھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بعدازاں چیف جسٹس محمد منیر نے ایک بیان میں اس امر کا اعتراف کیا تھا کہ اُنھوں نے وہ فیصلہ سیاسی دباؤ میں صادر کیا تھا۔ ایوب خاں کے دورِ آمریت میں جسٹس کیانی نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے جرأت اور ذہانت سے قانون کی حکمرانی کی پاسداری کا فریضہ ادا کیا، وہ تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ جسٹس کیانی نے ایوب خانی مارشل لا کی ناک میں نکیل ڈال دی تھی۔ اسی طرح جسٹس شبیر احمد نے دورانِ مارشل لا کور کمانڈر لاہور کو عدالت میں طلب کرکے اُن کے غیر قانونی احکام کی وضاحت طلب کی تھی اور اُنھیں کالعدم قرار دے دیا تھا۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے اپنے ایک تاریخی فیصلے میں یہ قرار دیا کہ اعلیٰ عدلیہ کے سب سے سینئر جج، چیف جسٹس کے منصب پر فائز ہوں گے۔ اس طرح ایک دیرینہ تنازع ختم ہوا اور ایگزیکٹو کے اختیارات محدود ہو

گئے۔ جسٹس ظفر صدانی جو قانون کی باریکیوں کو خوب سمجھتے تھے اور اپنے منصب کی ذمے داریوں کا گہرا ادراک رکھتے تھے، اُنھوں نے جنرل ضیاء الحق کے مارشل لا میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی ضمانت لی تھی اور جسٹس مولوی مشتاق نے اُن کے ایوب خاں کی قید سے رہائی کے احکام جاری کیے تھے۔

دراصل 1960ء کی دہائی تک اعلیٰ عدلیہ کے جج صاحبان سول سروس سے آتے تھے یا وکلا برادری سے لیے جاتے تھے اور حکومتِ وقت اُن کا انتخاب کرتی تھی۔ گزشتہ چند عشروں سے وہ صرف وکلا برادری اور لوئر جوڈیشری سے لیے جارہے ہیں۔ اب مشاہدہ یہ ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل اور صوبائی بار ایسوسی ایشن کے عہدے دار ہائی کورٹ بینچ کے لیے سلیکٹ ہو جاتے ہیں۔ ایڈووکیٹ جنرل کا تقرر حکومت کرتی ہے جن کا تعلق پیشۂ وکالت سے ہوتا ہے اور سیاسی وابستگیاں رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ سیاست میں فعال ہوتے ہیں اور تعلقاتِ عامہ کی بنیاد پر اعلیٰ عدالتوں میں پہنچ جاتے ہیں، چنانچہ اعلیٰ عدالتوں میں غیر جانب داری اور میرٹ کا عنصر محدود ہوتا جارہا ہے۔ زوال آمادہ صورتِ حال سے نکلنے کا راستہ یہ ہے کہ اعلیٰ جوڈیشری کی سلیکشن ماضی کی طرح مقابلے کے امتحان کے ذریعے بھی کی جائے جس میں وہ تمام وکلا بیٹھنے کے مجاز ہوں جو پندرہ سالہ پریکٹس کا تجربہ رکھتے ہوں، البتہ بار ایسوسی ایشن کے عہدے داروں کو اس میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔

ایک زمانے میں ڈسٹرکٹ اور سیشن جج بھی ایک طے شدہ کوٹے کے مطابق ہائی کورٹ کے جج بنتے تھے اور آج بھی بنتے ہیں، لیکن اُن کا معیار بلند کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ اُن کو مختلف تربیتی مراحل سے اس طرح گزارا جائے کہ وہ رِٹ پٹیشن کی سماعت کرنے، آئین کی صحیح تشریح کرنے اور بروقت فیصلہ سنانے کی اہلیت سے مالا مال ہو جائیں۔ پوری طرح تربیت یافتہ اور تجربے کار سیشن جج صاحبان جب ہائی کورٹ کے بینچ میں بیٹھیں گے، تو اعلیٰ عدالتوں کا معیار بلند کرنے میں یقیناً معاون ثابت ہوں گے۔

ہمارے خیال میں تمام سیاسی جماعتیں اس اہم ترین مسئلے پر پوری توجہ مرکوز کریں گی اور عدالتی نظام کی بہتری میں سرگرم حصّہ لیں گی۔ بار بار کی فوجی مداخلت کے باعث آج ہماری عدالتوں کی حالت کسی طور بھی قابلِ رشک نہیں۔ عدالتی کارکردگی کو پُراعتماد کرنے کے لیے ہماری پارلیمان اور ہماری سول سوسائٹی بطورِ خاص ہمارے وکلائے کرام کو بالغ نظری، بلند ہمتی اور تخلیقی اُپج کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ انصاف کا حصول جس قدر مکمل ہوتا جائے گا، اس کے پیشِ نظر ایک ایسے نظام کو تقویت پہنچانا لازمی ہے جو غیر ضروری مقدمہ بازی کے رجحان کی حوصلہ شکنی کرنے کے ساتھ ساتھ مقدمات میں انتہائی تاخیر کا سدِباب کر سکے اور عدالتوں سے باہر مقدمات کے تصفیے میں کارگر ثابت ہو۔ ایک آزاد، غیر جانب دار، حرص و ہوس سے پاک اور قابلِ اعتماد عدلیہ معاشرے کی بقا اور ارتقا کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے جس کا تحفظ ہم سب کی ذمے داری ہے۔ حالات نے ثابت کر دیا ہے کہ عدالتی اصلاحات وقت کا سب سے اہم تقاضا ہے جس کی تیاری اور مؤثر نفاذ کے لیے قومی سطح پر کوئی تحریک اُٹھنی چاہیے۔ اگر سوسائٹی کے طاقت ور مراکز سہل انگاری کا شکار ہوتے رہے، تو انصاف کے آسمان حصول کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا اور ریاست کے اداروں کے مابین توازن قائم نہیں رہے گا اور خلقِ خدا ناانصافیوں کے ہاتھوں بلکتی رہے گی۔

الطاف حسن قریشی

پاکستان کا اقتصادی دارالحکومت پانی میں ڈوب رہا ہے،
ملکی معیشت گرداب میں ہے، معاشرتی ہم آہنگی کا دُور دُور تک نام ونشاں نہیں،
تحریکِ انصاف کے پیارے لمبی اننگ کھیلنے کے شادیانے بجا رہے ہیں۔

مسائل کی یلغار میں سلامتی کا راستہ

مستقبل کے حالات کا تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پاکستان تحریکِ انصاف کو اقتدار میں آئے دو سال مکمل ہو چکے ہیں، مگر نجانے آج بھی ایسا کیوں لگتا ہے کہ عوام کے محبوب لیڈر جناب عمران خاں کنٹینر پر کھڑے اپنی ہی حکومت کے خلاف طوفان اُٹھائے ہوئے ہیں اور نت نئے مسائل کے انبار لگاتے جا رہے ہیں۔ بظاہر وہ اپوزیشن کو چور، لٹیرے اور ڈاکو کے القاب سے پکارتے ہیں، لیکن باطن میں اپنی صفوں میں پائے جانے والے شاطروں، خائنوں اور چال بازوں سے خوف زدہ ہیں۔ اُن سے نبرد آزما ہونے کے لیے طرح طرح کے داؤ پیچ استعمال کرتے رہتے ہیں جن سے حکمرانی کا تخت لرزہ براندام رہتا ہے اور وقفے وقفے سے 'آج گیا یا کل گیا' کی افواہیں سننے میں آتی ہیں۔ اب زمانہ یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ پہلے شرفا اپنی کہی ہوئی بات پر جان دے ڈالتے تھے، مگر اپنی آن پر حرف نہیں آنے دیتے تھے۔ آج وعدے سے پھر جانا قیادت کا عظیم وصف قرار پایا ہے، اب معتبر رہی نہ کسی معتبر کی بات۔

یہ امر پریشان کن ہے کہ روز روز موقف بدلنے سے داخلی اور خارجی چیلنجوں میں بڑی سنگینی در آتی جا رہی ہے۔ پالیسی اور منصوبہ بندی کا فقدان پہلے سے کہیں زیادہ نظر آ رہا ہے۔ معیشت قابو میں نہیں اور مہنگائی، بدانتظامی اور بے روزگاری نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ حکومت کی طرف سے اقتصادی بحالی کے مژدے سنائی دے رہے ہیں، لیکن ماہرین کہتے ہیں کہ اس وقتی اُبھار کے اسباب کچھ اور ہیں اور بحالی کا غلغلہ محض ایک افسانہ ہے۔ معیشت دان فرحان بخاری کی رائے میں جو 'ہیرے' آئی ایم ایف سے بھاری مشاہروں پر ادھار لیے گئے ہیں، وہ پاکستانی معیشت کے اصل مسائل سے یکسر بے خبر ہیں، اس لیے ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور اگلی اسائنمنٹ کے لیے میدان ہموار کرتے جاتے ہیں۔ اُن کا اصل مشن پاکستان کو آئی ایم ایف کا غلام بنائے رکھنا ہے۔ بخاری صاحب کا تجزیہ ہے کہ زراعت کو مضبوط بنیادوں پر ترقی اور توسیع دیے بغیر پاکستان کی معیشت مستحکم نہیں ہو سکتی، جبکہ ہم نے کسانوں کے حالات بگاڑنے اور زراعت کو تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی ہے۔ اب یوں لگتا ہے کہ زراعت پیشہ لوگوں کو فصلیں اُگانے میں خسارے کا سودا نظر آ رہا ہے، اس لیے

وہ معاش کے دوسرے ذرائع تلاش کرنے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی بے تدبیری اور ناقص حکمت عملی سے گندم کی نئی فصل آنے کے فوراً بعد ہی اس کی قلت پیدا ہوگئی اور آٹے کی قیمتیں تقریباً دوگنا ہو چکی ہیں۔ یہی معاملہ چینی کا بھی ہے جس کی قیمت دو مہینوں کے اندر پچاس روپے کلوگرام سے ایک سو دس روپے کلوگرام تک جا پہنچی ہے، مگر تحریکِ انصاف کے جیالوں اور حکومت کے موج ظفر موج ترجمانوں کا دعویٰ ہے کہ ہم نے بے مثال کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اے اللہ! ہمیں اپنے حکمرانوں کی مبالغہ آرائی اور کذب بیانی پر اُترنے والے عذاب سے محفوظ رکھنا!

معیشت کی زبوں حالی کے باعث ہم کاسۂ گدائی ملکوں ملکوں لیے پھرتے ہیں اور ہماری آنکھیں بھیک دینے والوں کے سامنے جھکی رہتی ہیں اور ہم اُن کے احسانات کے نیچے دبے جا رہے ہیں۔ اس بے کسی کا سب سے بڑا سبب ملک کے اندر سیاسی محاذ آرائی اور غیر یقینی صورتِ حال ہے جسے حکمران طبقہ اپنے 'ذوقِ شجاعت' میں ہوا دے رہا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیاسی ہم آہنگی اور مفاہمت کی فضا قائم رکھنے میں بنیادی کردار حکومت کا ہوتا ہے، مگر اس کے بعض پُرجوش کرتا دھرتا ہر آن آستینیں چڑھائے جنگ جوئی کا مظاہرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ اُنھیں پارلیمان کا وہ اجلاس سُونا سُونا اور اُجڑا اُجڑا محسوس ہوتا ہے جس میں گالم گلوچ کا معرکہ برپا نہ ہو۔ مقصود یہ کہ کوئی سنجیدہ بحث نہ ہونے پائے اور کسی دیدہ ور کی بات نہ سنی جائے۔ یہی منظر نامہ ٹی وی سکرینوں پر شام ڈھلے اُبھرنے لگتا ہے۔ پی ٹی آئی کی ہائی کمان نے اپنے 'جان بازوں' کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے کہ وہ سنجیدہ ماحول میں تلخی پیدا کریں اور بدزبانی کے جوہر دکھاتے ہوئے کسی کو سچ بات نہ کرنے دیں۔ اِس امر کی حتی المقدور کوششیں جاری ہیں کہ اہم ترین ملکی معاملات پر اتفاقِ رائے پیدا نہ ہونے پائے اور اس خلفشار میں حکومت کو زیادہ سے زیادہ جابرانہ اختیارات حاصل اور استعمال کرنے کا جواز مل جائے۔ آج کل پارلیمان میں اینٹی منی لانڈرنگ کا ترمیمی بل زیرِ بحث ہے جس میں تجویز کیا گیا ہے کہ حکومت کسی بھی شہری کو وارنٹ کے بغیر بھی حراست میں لے سکے گی۔ ڈراوا یہ دیا جا رہا ہے کہ اگر یہ قانون فوری طور پر منظور نہ کیا گیا، تو ایف اے ٹی ایف پاکستان کو بلیک لسٹ میں دھکیل دے گا جو مادرِ وطن کے لیے تباہ کن ہوگا۔ کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے اِس شور شرابے سے عالمی سطح پر پاکستان کا اعتبار کم ہوتا جا رہا ہے اور خارجہ تعلقات میں بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ ہمارے برادرانہ دوست ممالک سے دیرینہ رشتے سخت دباؤ میں آچکے ہیں جو آنے والے مہینوں میں شدید ترین مصائب کا باعث بن سکتے ہیں۔

شرقِ اوسط میں پچھلے دنوں دو بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جن کے اثرات براہِ راست پاکستان پر مرتب ہو سکتے ہیں۔ ایک تبدیلی پاک۔سعودی عرب تعلقات میں کشیدگی کی صورت میں اور دُوسری متحدہ عرب امارات کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے سے پیدا ہوئی ہے۔ بظاہر ان تبدیلیوں کا ظہور ناگہانی طور پر ہوا ہے، مگر کچھ عوامل ایک مدت سے خاموشی کے ساتھ ان محاذوں پر سرگرمِ عمل تھے۔ پاکستان نے شاہ فیصل (شہید) کے زمانے میں سعودی مالیات کا ایک مضبوط نظام قائم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا جبکہ پاکستانی ورک فورس نے انفراسٹرکچر کی تعمیر میں موسم کی شدید سختیاں جھیلی تھیں اور پاک فوج نے سعودی عرب کا دفاعی ڈھانچہ تیار کرنے میں بھرپور تعاون کیا تھا۔ اس کے جواب میں سعودی عرب بھی ہر آڑے وقت میں ہمیں دل کھول کر مالی امداد فراہم کرتا رہا۔ خانہ کعبہ پر جب دہشت گردوں نے قبضہ

کرلیا تھا، تو پاکستان کے کمانڈوز نے جان پر کھیل کر انھیں دبوچ لیا تھا، البتہ اِن گہرے تعلقات کو پہلا جھٹکا وزیرِ اعظم نواز شریف کے تیسرے دورِ حکومت میں اُس وقت لگا جب سعودی عرب نے پاکستان سے یمن میں فوجیں بھیجنے پر اصرار کیا۔ اِس دوستانہ درخواست پر قومی اسمبلی میں بحث ہوئی اور اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ سامنے آیا کہ یمن میں فوجیں نہیں بھیجی جائیں گی، البتہ حرمین شریفین کی حفاظت کے لیے ہماری فوجیں حاضر ہیں۔ اسی قسم کا فیصلہ جنرل اسلم بیگ نے اُس وقت کیا جب عراق نے کویت پر قبضہ کرکے سعودی عرب کی سلامتی کے لیے سنگین خطرات پیدا کردیے تھے۔ معاشی اور سیاسی تجزیہ نگاروں کی نگاہ میں یہ ایک غیر دانش مندانہ فیصلہ تھا۔ اگر پاکستان اُس وقت کھلے ظرف کے ساتھ سعودی عرب میں ایک ڈویژن فوج بھیج دیتا، تو وہ اس کے تمام بیرونی قرضے ادا کردیتا جو آج تک ہماری معیشت پر بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ مصر نے اس بحران میں اپنی فوجیں بھیج کر بیس ارب ڈالر کے قرضوں سے جان چھڑالی تھی۔

قومی اسمبلی نے جب یمن میں فوجیں بھیجنے سے انکار کیا، اُس وقت وزیرِ اعظم نواز شریف غیر ملکی دورے پر تھے اور اُنہیں قرارداد کے بعض الفاظ پر بڑا دُکھ ہوا تھا۔ بعد ازاں اُنھوں نے کمالِ دانائی سے سعودی حکمرانوں کی ناراضگی بھی دور کردی اور تعلقات میں کوئی بڑا رخنہ بھی نہیں پڑنے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ نواز شریف کی تیسری بار کی حکومت کو معاشی بحران سے نکالنے کے لیے سعودی حکومت نے ڈیڑھ ارب ڈالر فراہم کیے۔ تحریکِ انصاف کی حکومت آئی، تو سعودی عرب اُس کی مدد کو بھی پہنچا اور اسٹیٹ بینک میں بھاری رقم جمع کرائی اور تین سال تک ادھار پر پٹرول فراہم کرنے کا عندیہ دیا۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد عمران حکومت کے سرکاری دانش وروں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ مسئلۂ کشمیر پر اوآئی سی وہ کردار ادا کرنے سے گریزاں ہے جو اسے مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم کی حیثیت سے ادا کرنا چاہیے تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ مقبوضہ کشمیر کو بھارت کے اندر ضم کرنے کے انتہائی حساس مسئلے پر مسلم وزرائے خارجہ کی کانفرنس بلائی جائے، مگر سعودی عرب جو اس تنظیم کا روحِ رواں ہے، وہ قدرے تذبذب سے کام لیتا رہا۔ اس پر ہمارے پُرجوش وزیرِ خارجہ جناب شاہ محمود قریشی نے پریس کانفرنس میں سعودی عرب کے بارے میں غیر سفارتی لب ولہجہ اختیار کیا اور یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ مسلم ملکوں کا ایک علیحدہ بلاک بنایا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ پاکستان آپ کی خواہش کے مطابق ملائیشیا کانفرنس میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس پریس کانفرنس سے پاک۔سعودی عرب تعلقات میں ایک زلزلہ سا آگیا، تاہم اب زخموں کی رفوگری کا عمل جاری ہے۔ پاکستان کے فہمیدہ سپہ سالار سعودی عرب گئے، مگر اُن کی ملاقاتیں شاہ سلمان اور طاقت ور ولی عہد محمد بن سلمان سے نہیں ہوئیں، البتہ نائب وزیرِ دفاع سے تمام نازک مسائل پر نہایت مفید بات چیت ہوئی ہے۔ دراصل چین کا ایران کے قریب آجانے سے معاملہ قدرے پیچیدہ اور گنجلک ہوگیا ہے۔ اس اُلجھی ہوئی صورتِ حال کے تناظر میں انسانی حقوق کی دبنگ وزیرِ محترمہ شیریں مزاری نے کھلے بندوں پاکستان کے دفترِ خارجہ اور وزیرِ خارجہ پر یہ الزام لگایا ہے کہ اُنھوں نے مقبوضہ کشمیر کو بھارتی عذاب سے نجات دلانے کے لیے ایک بھی سنجیدہ کوشش نہیں کی اور برادر ملکوں سے تعلقات بھی خراب کرلیے ہیں۔ ہماری سیاسی اور عسکری قیادتوں کو سعودی عرب کے ساتھ تعلقات میں پہلی جیسی گرم جوشی لانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلنا ہوں گے، تاہم اُمید رکھنی چاہیے کہ نصف صدی پر محیط برادرانہ تعلقات کسی بھی وقت جوش ماریں گے۔ شرط یہ ہے کہ من چلوں

کے 'ذوقِ شجاعت' پر قابو پایا جائے اور غیر ذمے دارانہ روش اختیار کرنے والوں کا کڑا محاسبہ ہوتا ہوا نظر آئے۔

اسی دوران یہ خبر آئی کہ متحدہ عرب امارات نے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اس خبر سے پورے خطے میں ایک بھونچال سا آ گیا ہے۔ اَن گنت سوالات اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور خدشات کے سائے گہرے ہوتے جارہے ہیں۔ اب یہ دیکھنا ہوگا ہے کہ پاکستان پر اِس فیصلے کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ہم خلیجی ممالک سے دینی اور تاریخی رشتوں میں جڑے ہوئے ہیں جن میں سعودی عرب کا اثر و رسوخ سب سے زیادہ ہے۔ اس امر کا قوی امکان پایا جاتا ہے کہ عرب امارات کے بعد سلطنت عمان اور سوڈان بھی اِسے تسلیم کرنے کا اعلان کردیں گے۔ مصر اور اُردن کے پہلے ہی اِس کے ساتھ سفارتی روابط قائم ہیں۔ سعودی عرب نے اپنے وقار اور عظمت کے عین مطابق اسرائیل کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا ہے، تب مجھے خادم الحرمین شریفین جلالۃ الملک شاہ فیصل کا وہ اِنٹرویو یاد آیا جو میں نے اُن سے اکتوبر 1967ء میں جدہ میں لیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے اِس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ہم اسرائیل کا وجود ختم کر کے دم لیں گے اور جلد ہی مسجدِ اقصیٰ میں نماز اَدا کریں گے۔ اقوامِ متحدہ نے جب صیہونی ہتھکنڈوں کے دباؤ میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کیا، تو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اسے ایک ناجائز ریاست قرار دیا تھا اور پاکستان نے اقوامِ متحدہ میں اس کی باقاعدہ رکنیت کی بھرپور مخالفت کی تھی۔ اسرائیل نے امریکی پشت پناہی اور سائنس و ٹیکنالوجی میں حیرت انگیز ترقی سے زبردست اقتصادی اور عسکری طاقت حاصل کرلی اور 1967ء کی عرب۔اسرائیل جنگ میں فلسطینیوں کے بہت بڑے علاقے، مغربی اُردن اور شام کی جولان چوٹیوں پر قبضہ کرلیا۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے سلامتی کونسل کی قراردادیں پامال کرتے ہوئے اِن علاقوں سے فلسطینیوں کو بے دخل کر کے یہودی بستیاں بساتا چلا جارہا ہے۔

ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ اسرائیل سالہا سال کی منصوبہ بندی سے ہمارے علاقوں کی طرف بڑھتا آرہا ہے اور خلیجی ممالک کی بہت بڑی مارکیٹ میں اس کے لیے بے پناہ کشش پائی جاتی ہے۔ اس نے بھارت کے ساتھ دفاعی تعلقات میں بڑی وسعت پیدا کرلی ہے اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کو زیرِ نگیں رکھنے اور پاکستان کو گزند پہنچانے کے لیے اسے جدید ترین اسلحہ اور پیلٹ گنیں فراہم کررہا ہے۔ اس کے علاوہ انفارمیشن ٹیکنالوجی، دواسازی اور ہر طرح کی مشینری کی برآمدات میں وہ بہت آگے نکل گیا ہے۔ وہ ہیرے جواہرات کاٹ کر اور انھیں پالش کر کے کثیر زرِمبادلہ کمارہا ہے۔ حالات سے ظاہر ہے کہ اسرائیل اور خلیجی ریاستوں کے مابین تجارتی تعلقات میں وسعت پیدا ہوگی اور اسرائیل کے مال بردار جہاز ہمارے قریبی سمندروں میں سے گزریں گے اور یوں ہماری اور اس خطے کی سلامتی کے لیے خطرات جنم لیں گے۔ تیزی سے بدلتا ہوا عالمی منظرنامہ جنوبی اور مشرقی ایشیا پر یقیناً اثرانداز ہوگا۔ آج زمینی حقائق یہ ہیں کہ خلیجی ممالک، اسرائیل اور امریکا ایران سے بہت خائف ہیں اور اس کی طاقت پر کاری ضرب لگانے کی منصوبہ بندی کررہے ہیں۔ اسرائیل زیادہ سے زیادہ اسلحہ فروخت کرنے کے لیے خلیجی ممالک میں ایران کے خوف کو مزید ہوا دے گا اور اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرے گا۔ امریکا خلیجی ممالک کا بوجھ اتارنا اور اَپنے داخلی مسائل پر توجہ دینا چاہتا ہے۔ اُس کے بحرین اور قطر میں فوجی اڈے ہیں۔ وہ انھیں اسرائیل اور بھارت کی تحویل میں دے کر اُنھیں اِس خطے کی چودھراہٹ سونپ سکتا ہے۔ یہ صورتِ حال پاکستان کے لیے یقیناً حددرجہ

تشویش ناک ہوگی اور اِسے غیر معمولی تدبر اور دُور بینی کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔

حکیم الاُمت ڈاکٹر محمد اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح فلسطینی مسئلے کو عرب کے بجائے مسلم اُمہ کا مسئلہ سمجھتے تھے، اِس لیے پاکستان اِسرائیل کے لیے سدِ راہ ثابت ہوا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات میں اسے اپنے موقف میں اِتنی تبدیلی لانا ہوگی کہ اصولی موقف کی روح بھی قائم رہے اور عالمی برادری میں ایک مثبت کردار اَدا کرنے کا راستہ بھی کھلا رہے۔ مناسب طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ پاکستان اسرائیل کو بنیادی شرائط کی پابندی پر مجبور کرے۔ پہلی یہ کہ وہ فلسطین کی ریاست کو کھلے ذہن کے ساتھ تسلیم کرے۔ دوسری یہ کہ فلسطینیوں کے بنیادی حقوق کا پوری طرح احترام کیا جائے۔ تیسری یہ کہ 1967ء کی جنگ میں سرزمینِ فلسطین سے چھینے گئے تمام علاقے واپس کیے جائیں۔ چوتھی یہ کہ یہودی بستیاں ختم کی جائیں اور ان علاقوں میں فلسطینیوں کو آباد کیا جائے۔ پانچویں یہ کہ بیت المقدس کو اسرائیلی دارالحکومت قرار دینے کا فیصلہ واپس لیا جائے اور آخری یہ کہ فلسطینیوں کے ساتھ جو ظلم روا رکھا گیا ہے اور اُن کی معیشت کو جس بے دردی کے ساتھ تباہ کیا گیا ہے، اُس کا زرِ تلافی ادا کیا جائے۔ اِن شرائط کی تکمیل کے بعد اسلامی دنیا سے مشاورت سے اسرائیل کو تسلیم کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے۔ اِن تمام اُلجھے ہوئے معاملات میں پاکستان کی اقتصادی اور فوجی طاقت ہی فیصلہ کُن کردار اَدا کرے گی، اس لیے قوم کو اپنی تمام توانائیاں سیاسی اور معاشی استحکام پر مرکوز کر دینا ہوں گی۔ اب جبکہ ہم آئی ایم ایف کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہمارے بعض برادر ممالک سے تعلقات بھی کسی قدر کشیدہ ہیں، چین کے ساتھ معاملات میں بھی سرد مہری کی خبریں گردش کر رہی ہیں اور پاکستان کا سب سے بڑا اَور معاشی دارالحکومت کراچی پانی میں ڈوب رہا ہے، تو تحریکِ انصاف کے بڑبولے خوشی کے شادیانے بجا رہے ہیں اور سیاسی حریفوں کو چھٹی کا دودھ یاد دِلانے کی مجاہدانہ کوششوں میں سرگرداں ہیں۔

کراچی جو بعض جائزوں کے مطابق تین کروڑ آبادی کا شہر ہے، وہ گزشتہ تیس برسوں سے ناقابلِ تصور عذاب سے گزرتا آیا ہے۔ پہلے ایم کیو ایم نے شہر میں بہت خون بہایا اور بوری بند لاشوں پر اپنے اقتدار کا تخت سجایا۔ بھتے اور قتل و غارت گری زندگی کا معمول بن گئے تھے۔ الطاف بھائی کی فسطائیت نے دانش مندی کے چشمے خشک اور جمہوریت کی قبا چاک کر ڈالی تھی۔ اُن کے بعد جو حکمران آئے، وہ اپنی سیاسی سلطنت قائم کرنے میں لگے رہے۔ حکومت کی رِٹ کمزور پڑتی گئی اور مافیاؤں کے جتھے ریاست کی قوت سے بھی زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ بلدیاتی ادارے جو شہر کے عمدہ بندوبست اور اس کے مسائل حل کرنے میں پیش پیش ہوتے اور اس کی معاشرتی بہبود میں کلیدی کردار اَدا کرتے ہیں، اُن کے ساتھ صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا۔ اس کے علاوہ سندھ کی حکمران جماعتوں نے کراچی کے لیے اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی کرنے کے بجائے سرکاری محکموں اور ترقیاتی اداروں میں اپنے کارکن بھرتی کر دیے جن کو مال بنانے اور اپنا اثر و نفوذ قائم رکھنے کے سوا اَور کسی بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بھاری رشوتیں لے کر ذمے دار افسر اِن لوگوں کے پلاٹوں پر قبضہ کراتے اور نالوں اور ندیوں پر کئی کئی منزلہ عمارتوں کی ناجائز تعمیر کی نگرانی کرتے رہے۔ ہزاروں سرکاری ملازمین نے شہر کی صفائی سے ہاتھ کھینچ لیا اور جا بجا کچرے کے ڈھیر لگتے چلے گئے۔ بدانتظامی اور مجرمانہ غفلت کے باعث کراچی کا پورا انفراسٹرکچر تباہ ہوگیا ہے۔ ماضی کا دیانت داری سے

جائزہ لیا جائے، تو یہ حقیقت اُجاگر ہوتی ہے کہ میئر عبدالستار افغانی اور ناظم نعمت اللہ خاں نے کراچی میں یادگار ترقیاتی کام کیے۔ جناب مصطفیٰ کمال کے عہد میں بھی ترقیاتی کام ہوئے، مگر اُن میں کچھ غیر ضروری پُل اور فلائی اوور بھی تعمیر ہوئے اور ناظم صاحب گورنر بننے کے خواب بھی دیکھنے لگے۔ اِن دنوں دھواں دھار بیان بازی اور الزام تراشی کا ہولناک سلسلہ جاری ہے جبکہ حالات غیر معمولی اتحاد اور جذبۂ ایثار کا تقاضا کر رہے ہیں۔ ہماری فوج ریسکیو آپریشن بھی کر رہی ہے اور اِمداد بھی فراہم کر رہی ہے۔ سیاسی جماعتوں کو مشکل کے وقت آگے آنا اور شکستہ حال عوام کا ہاتھ تھامنا ہوگا۔

کراچی میں خوفناک ایمرجنسی پیدا ہوجانے کے باعث صوبے اور مرکز نے مشترکہ کمیٹی قائم کی ہے جس میں فوجی اداروں کی نمائندگی بھی ہے، مگر مسلسل موسلا دھار بارشوں کے سبب پانی کی ہلاکت خیز موجوں میں کراچی ڈوب رہا ہے۔ مکان ڈوب رہے ہیں، سڑکیں ڈوب رہی ہیں اور بستیاں تیزی سے ڈوب رہی ہیں۔ عام شہریوں کے دل ڈوب رہے ہیں کہ ان کے لیے بے سروسامانی بڑھتی جارہی ہے۔ اربابِ حکومت کی منطق یہ ہے کہ بارش نے گزشتہ تیس برسوں کا ریکارڈ توڑ ڈالا ہے اور ایسے میں صبر کے سوا اور کوئی چارہ نہیں، مگر یہ ایک نہایت بودی دلیل ہے۔ انگلستان میں آٹھ نو مہینے چھاجوں پانی برستا رہتا ہے، مگر اس کے نکاس کے ایسے شاندار انتظامات کیے گئے ہیں کہ ساتھ ساتھ پانی نکلتا جاتا ہے۔ یہی انتظامات کراچی اور پاکستان کے دوسرے شہروں میں کیوں نہیں کیے جاسکتے؟ یہ مسائل جو ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بنتے جارہے ہیں، ان پر مستقل مزاجی سے توجہ دینے کے بجائے پچھلے دنوں تحریکِ انصاف کے چار پیارے اپنی دوسالہ کارکردگی پر پریس کانفرنس میں قوالی کی صورت میں پیش کر رہے تھے۔ وہ آنکھیں مٹکا مٹکا کر اور گردنوں کو خم دے دے کر ایک ہی بات بار بار دُہرا رہے تھے کہ اب ہم لمبی اننگ کھیلیں گے اور اپوزیشن کو کسی طور اپنے ساتھ نہیں ملائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں غرورِ نفس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھے! اگر حکمرانوں کے مزاج میں ٹھہراؤ نہیں ہوگا، تو ملکی معاملات میں استحکام کا حصول روز بروز محال ہوتا جائے گا۔

تاریخی تناظر میں صاف نظر آرہا ہے کہ ساری خرابیوں کا محور اچھے نظم و نسق (گڈ گورننس) کا بڑھتا ہوا فقدان ہے۔ ریاست اور سوسائٹی کے درمیان اعتماد کا رشتہ بہت کمزور پڑ گیا ہے۔ احتساب کے تباہ کن اور انتقام سے معمور نظام نے سول بیوروکریسی کو خوف زدہ اور معاملاتِ زندگی میں ایک ہیجان برپا کر دیا ہے۔ ایسے میں ہمیں اپنی سیاسی، معاشی اور تعلیمی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ سیاسی سطح پر پارلیمان کی معیاد پانچ سال کے بجائے چار سال کردی جائے اور کسی بھی شخص کو دو بار سے زائد انتخابات لڑنے کی اجازت نہ ہو۔ اِس تبدیلی سے سیاسی موروثیت کا خاتمہ ہوسکے گا۔ اسی طرح انتخابات کے لیے نگران حکومتیں قائم کرنے کے بجائے الیکشن کمیشن کو زیادہ سے زیادہ مضبوط، آزاد اور غیر جانب دار بنایا جائے۔ نیب کا ادارہ قائم رکھنا ہے، تو اس کے چیئرمین کا انتخاب پاکستان کے چیف جسٹس، وزیرِ اعظم اور اپوزیشن لیڈر کی مشاورت سے کیا جائے اور ملزم کو ضمانت کا حق دیا جائے۔ معیشت کے حوالے سے اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ کراچی یا دوسرے علاقوں میں پٹرول کو اسٹور کرنے کے معقول انتظامات ہوں۔ جب پٹرول کی قیمت پچیس ڈالر فی بیرل ہوگئی تھی، تو ہم بڑے پیمانے پر پٹرول کا ذخیرہ کرکے اپنی معیشت کو بحران سے نکال سکتے تھے۔ ایک فیصلہ یہ بھی کرنا ہوگا کہ سرکاری ملازمین اپنے بچوں کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم دلانے کے پابند ہوں۔ سلامتی کا یہی راستہ ہے۔ ◆◆

حقیقت میں ڈھلتا ڈراؤنا خواب

گریٹر اسرائیل

کیا اسرائیلی حکومت تیسرے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کرلے گی؟

سید عاصم محمود

17 اگست 2020ء کی بات ہے، امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ بسلسلہ اپنی انتخابی مہم ریاست ویسکونسن کے شہر، اوشکوش پہنچے۔ وہاں انھوں نے ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ''ہماری حکومت اپنے سفارت خانے کو اسرائیل کے دارالحکومت، یروشلم لے گئی۔ ہم نے یہ کام اناجیلیوں کی خاطر انجام دیا۔ اس پر اناجیلی بہت خوش ہیں۔ حقیقتاً وہ یہود سے زیادہ خوش ہیں۔''

بیت المقدس کا طریق صفرونیوس

اسی دن ٹرمپ نے فوکس ٹی وی نیٹ ورک نے ایک پروگرام، فوکس اینڈ فرینڈز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا: ''ہم نے اناجیلیوں کے لیے اسرائیل اور متحدہ عرب امارات کا معاہدہ دوستی کرایا ہے۔ اس سے ان کو فائدہ پہنچے گا۔ یہ اسرائیل کے لیے سودمند ہے۔ اناجیلی اسرائیل سے محبت کرتے ہیں۔''

آخر یہ اناجیلی (Evengelist) کون ہیں جن کی خاطر ٹرمپ دنیائے اسلام کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے امریکی سفارت خانہ تل ابیب سے مسلمانوں کے قبلہ اوّل، بیت المقدس لے گئے۔ انھی کے لیے ٹرمپ نے اسرائیل اور یو اے ای کے مابین معاہدہ بھی کرا دیا جس نے اسلامی دنیا میں بھونچال کی سی کیفیت پیدا کر ڈالی۔ اناجیلی عیسائیوں کی اصلیت جاننے کے لیے ہمیں تاریخ کی پنہائیوں میں جھانکنا ہوگا۔

مسلمانوں نے آزادی دلوائی

جب حضرت عیسیٰؑ نے جنم لیا تو فلسطین میں آباد یہود کا حکمران طبقہ کرپٹ ہو چکا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اس کرپٹ نظام کے خلاف آواز اٹھائی تو انھیں شہید کر دیا گیا۔ (تاہم اللہ تعالیٰ نے انھیں زندہ اوپر اٹھا لیا) دنیائے مغرب میں عیسائیت پھیلی تو عیسائی بادشاہ یہود کے دشمن بن گئے۔ انھوں نے کئی یہودی مار ڈالے اور انھیں اپنے ممالک سے نکال باہر کیا۔ بیت المقدس میں ان کا داخلہ بند ہو گیا۔ جبکہ برباد شدہ ہیکل سلیمانی کی جگہ عیسائی کوڑا پھینکنے لگے۔

638ء میں مسلمانوں نے بیت المقدس فتح کر لیا۔ شہر کے بطریق، صفرونیوس سے ان کا معاہدہ ہو گیا۔ صفرونیوس نے ہتھیار ڈالتے ہوئے ایک شرط یہ رکھی تھی کہ یہود کو یروشلم میں آباد نہیں کیا جائے گا۔ عیسائی مؤرخین لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروقؓ نے یہ شرط تسلیم کر لی۔ مگر بعدازاں انھوں نے

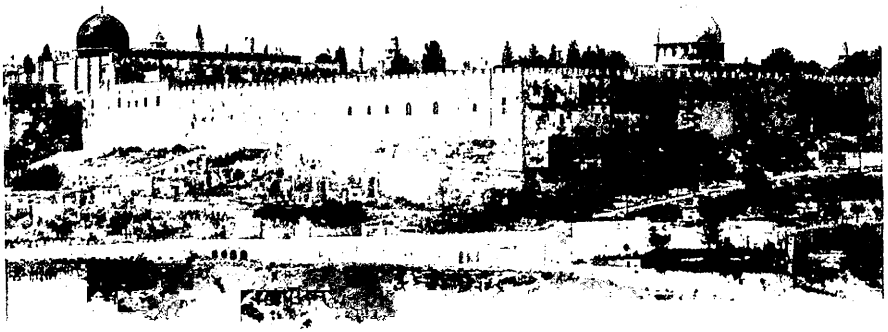

مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ

بیت المقدس کے نزدیک یہود کو آباد ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ یہی نہیں، مذہبی تہواروں پر انھیں یروشلم میں کوہِ زیتون پر عبادت کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ یوں عیسائیوں کے پانچ سو سالہ ظالمانہ اقتدار کے بعد یہود پہلی بار آزادی سے بیت المقدس میں گھومنے پھرنے لگے۔ انھیں عیسائیوں کے دورِ ابتلا سے مسلمانوں ہی نے رہائی دلوائی۔

خلیفہ دوم نے حرم الشریف کا مقام بھی کوڑے کرکٹ سے صاف کرایا اور ممکن ہے کہ وہاں نماز ادا فرمائی ہو۔ مسلمانانِ عالم کا عقیدہ ہے کہ اسی جگہ سے نبی کریم ﷺ معراج کی رات اپنے رب سے ملنے آسمانوں پر تشریف لے گئے تھے۔ یہ مقام ہمارا قبلہ اول رہا اور مسلمان اسے خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کے بعد تیسرا مقدس ترین مقام سمجھتے ہیں۔ آج حرم الشریف میں مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ ہمارے آثارِ مقدسہ واقع ہیں۔ یہود اس مقام کو اپنا ہیکل سلیمانی قرار دیتے ہیں۔

اگلی صدیوں میں دنیائے مغرب و مشرق میں یہود دھتکاری ہوئی قوم بنے رہے۔ عیسائی خصوصاً ان سے شدید نفرت کرتے تھے۔ نبی کریم ﷺ نے عرب میں مقیم یہود سے معاہدہ دوستی فرمایا مگر وہ دغا باز اور مکار نکلے۔ چنانچہ ان سے جنگیں ہوئیں اور انھیں پسپا کر دیا گیا۔ آنے والے برسوں میں مسلمان حکمرانوں نے عام طور پر یہود سے مشفقانہ سلوک کیا اور انھیں اپنی سلطنتوں میں بطور ذمی بسنے کی اجازت دی۔ بعض یہود خصوصاً اندلس اور بغداد میں اعلیٰ عہدوں پر بھی فائز رہے۔ اس زمانے میں یورپی ممالک میں یہود کے ساتھ جانوروں جیسا سلوک ہوتا تھا۔

عیسائیت کی تیسری شاخ

1517ء کے بعد جرمنی میں (یونانی آرتھوڈوکس کلیسا اور رومن کیتھولک کلیسا) کے بعد عیسائیت کی تیسری بڑی شاخ، پروٹسٹنٹ عیسائیت نے جنم لیا۔ اس کے قیام میں ان یہود کا کردار ہو سکتا ہے جو بظاہر عیسائی ہو گئے تھے مگر مذہبی عقائد کے حوالے سے یہودی رہے۔ انھیں ''کرپٹو'' یا خفیہ یہود کہا جاتا ہے۔

اسی زمانے تک رومن کیتھولک کلیسا کے سربراہ، پوپ کرپٹ ہو چکے تھے۔ انھیں دولت و اقتدار کا چسکا لگ گیا تھا۔ پوپ اور دیگر کیتھولک پادریوں کے چلن سے جرمن عوام تنگ تھے۔ یہ عین ممکن ہے کہ کیتھولک کلیسا کے خلاف عوامی غم و غصے سے کرپٹو یہود نے فائدہ اٹھایا جن میں سے کئی چرچوں میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ یہ یہود عیسائیوں سے شدید نفرت کرتے تھے۔ اسی نفرت کی بنا پر انھوں نے عیسائیت کو مزید تقسیم کرنے کی سازش تیار کر لی۔ اگر جرمنی کتب خانوں میں

جا کر تحقیق کی جائے تو بانی پروٹسٹنٹ عیسائیت، مارٹن لوتھر کے ساتھیوں میں کرپٹو یہودی بھی دریافت ہو سکتے ہیں۔

یہ نیا فرقہ جرمنی، برطانیہ، فرانس، ہالینڈ اور سکینڈے نیوین ممالک میں پھیلنے لگا۔ ان ملکوں کے حکمران کیتھولک تھے۔ انھوں نے پروٹسٹنٹ تحریک کو روکنے کی کوشش کیں تو عوامی لیڈروں سے ٹکراؤ ہو گیا۔ لہٰذا کئی عشروں تک یورپ مذہبی جنگوں کا نشانہ بنا رہا۔ لاکھوں عیسائی ان جنگوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ خصوصاً برطانیہ، اسپین، پرتگال اور ہالینڈ میں جان و مال کی زیادہ تباہی ہوئی۔

نئے عقیدے کا جنم

پروٹسٹنٹ بائبل کو "خدا کا قانون" سمجھتے ہیں۔ یہ ان کی دینیات میں بنیادی جزو کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا اعتقاد ہے کہ بائبل میں بہت سی پیش گوئیاں بھی کی گئی ہے۔ ان میں حضرت عیسیٰؑ کا دوبارہ نزول اہم ترین پیش گوئی ہے۔ اسی اعتقاد سے پروٹسٹنٹوں میں ایک عقیدے نے جنم لیا جو آج خصوصاً امریکا اور برطانیہ میں یہود کی مقبولیت اور پسندیدگی کا سب سے بڑا سبب بن چکا۔

اس عقیدے کا اوّلیں حصہ برطانوی پروٹسٹنٹ علما کے ہاں پیدا ہوا جس کے مطابق حضرت عیسیٰؑ یروشلم میں نزول فرمائیں گے۔ پھر عقیدے میں یہ نکتہ شامل ہوا کہ جب تمام یہود، عیسائی ہو جائیں گے تو حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی ہوگی۔ یہود مگر اپنے کرتوتوں کی وجہ سے پوری دنیا میں بکھرے ہوئے تھے۔ اسی لیے عقیدے کا تیسرا نکتہ یہ بنا کہ یہود کو واپس یروشلم لایا جائے تاکہ وہ عیسائی ہو جائیں۔ اس طرح حضرت عیسیٰؑ کا نزول یقینی ہو جائے گا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس عقیدے میں نئے نکات شامل ہوتے رہے۔ پچھلے پانچ سو سال کے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد آج یہ عقیدہ کچھ یہ شکل اختیار کر چکا:

"یہود فلسطین میں دوبارہ اقتدار سنبھال کر یروشلم میں تیسرا ہیکل سلیمانی تعمیر کریں گے۔ جیسے ہی تیسرا ہیکل سلیمانی تعمیر ہوا، حضرت عیسیٰؑ آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ وہ پھر ایک ہزار سال تک دنیا پر حکمرانی کریں گے۔ اس دوران جو یہودی حضرت عیسیٰؑ پر ایمان لائے (یعنی عیسائی ہو گئے) انھیں نجات مل جائے گی۔ اخیر برسوں میں عیسائیوں اور غیر عیسائیوں کے مابین ہرمجدون کے مقام پر "آخری معرکہ" ہوگا۔ غیر عیسائیوں کا لیڈر دجال ہوگا۔ اس جنگ میں فتح کے بعد حضرت عیسیٰؑ اپنے پیروکاروں سمیت جنت میں تشریف لے جائیں گے۔ یوں تمام عیسائی وہاں ہمیشہ کے لیے ہنسی خوشی رہیں گے۔"

دنیا میں پروٹسٹنٹوں کی اکثریت درج بالا عقیدے پر ایمان رکھتی ہے۔ رومن کیتھولک کلیسا اور یونانی کلیسا کے پیروکار نزول مسیح کے تو قائل ہیں مگر وہ اس عقیدے پر زیادہ یقین نہیں رکھتے کہ حضرت عیسیٰؑ کی آمد ثانی کے لیے یروشلم میں یہود کی حکومت ہونا اور ہیکل سلیمانی کا بننا لازمی شرط ہے۔

مارٹن لوتھر، پروٹسٹنٹ ازم کا بانی

پروٹسٹنٹوں کی تعداد

اعداد و شمار کی رو سے دو ارب چالیس کروڑ عیسائیوں میں نوے کروڑ پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں۔ ان میں سے کم از کم ساٹھ کروڑ پروٹسٹنٹ درج بالا عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں۔ انھی

عیسائیوں کو ''اناجیلی عیسائی'' کہا جاتا ہے۔ یہ اناجیلی عیسائی اپنے نظریات پھیلانے کے سلسلے میں بہت سرگرم رہتے ہیں۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر قبضہ کیا، تو انھی اناجیلی عیسائیوں کے پادریوں نے ہندوستانی شہروں اور دیہات میں مشنریاں شروع کی تھیں تاکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کو پروٹسٹنٹ عیسائی بنایا جا سکے۔ مسلمان علما سے ان کے پھڑکئی تاریخی مناظرے بھی ہوئے۔ اناجیلی عیسائیوں میں سے درج بالا عقیدے پر اندھا اعتقاد رکھنے والے ''صہیونی

تیسرے ہیکل سلیمانی کا نقشہ

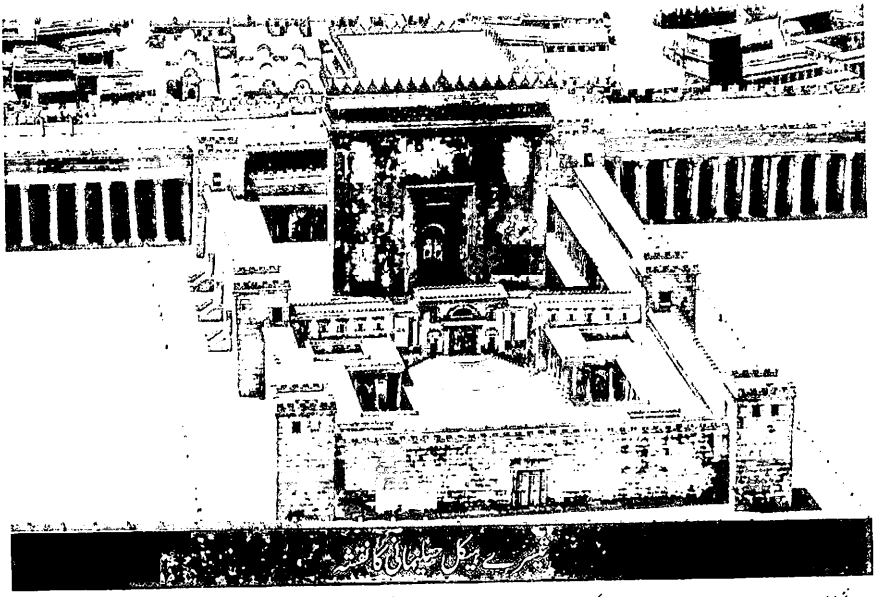

عیسائی'' (Christian Zaionists) کہلاتے ہیں۔

آج امریکا کی 33 کروڑ آبادی میں کم از کم چالیس فیصد پروٹسٹنٹ ہیں یعنی تقریباً تیرہ کروڑ۔ ان میں سے تقریباً سبھی اناجیلی عیسائی ہیں۔ برطانیہ کی بھی کم از کم 40 فیصد آبادی یعنی ڈھائی کروڑ باشندے پروٹسٹنٹ اور اناجیلی عیسائی ہیں۔ دیگر اہم ممالک میں پروٹسٹنٹ آبادی کا تناسب یہ ہے: ڈنمارک (80 فیصد)، ناروے (73 فیصد)، جنوبی افریقا (72 فیصد)، سویڈن (60 فیصد)، نائجیریا (38 فیصد)، کینیڈا (26 فیصد)، جرمنی (26 فیصد) اور آسٹریلیا (23 فیصد)۔

اناجیلیوں کی اہم خاصیت

اناجیلی عیسائیوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہ مل کر کسی معاملے کی حمایت یا مخالفت کرتے ہیں۔ اسی امر نے انھیں مغربی ممالک میں طاقتور گروہ کی حیثیت دے ڈالی۔ جب دنیائے مغرب میں جمہوریت نے جنم لیا اور الیکشن ہونے لگے تو اناجیلی عیسائیوں نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ اب اناجیلی جس سیاسی راہنما کو ووٹ دیتے، وہ ووٹوں کی کثرت کے باعث جیت جاتا۔ اسی لیے سیاست داں اناجیلی عیسائیوں کے ووٹ حاصل کرنے کی خاطر ان کی فرمائشیں پوری کرنے لگے۔ یوں اپنے اپنے مفادات پورے کرنے کے لیے مذہبی عقائد اور سیاست کا ادغام ہو گیا۔

اناجیلی عیسائیوں کے عقائد اور سیاست کے ملاپ کا اعجوبہ سب سے پہلے برطانیہ میں دیکھنے کو ملا۔ ان عقائد میں

سے اہم عقیدہ یہی تھا کہ یروشلم میں یہود کی حکمرانی قائم ہونی چاہیے۔ انا جیلیوں کی حمایت پانے کے لیے برطانوی سیاست داں اس عقیدے کی سرپرستی کرنے لگے۔ برطانیہ میں سر ہنری فنچ (متوفی 1635ء) ایک نمایاں وکیل اور سیاست داں تھا۔ کئی بار رکن پارلیمنٹ منتخب ہوا۔ انا جیلی عیسائیوں کے ووٹ پانے کی خاطر اس نے 1621ء میں ایک کتاب شائع کرائی۔ کتاب میں تمام عیسائیوں پر زور دیا گیا کہ وہ یروشلم میں یہود کی حکومت بحال کرانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ اس نے دعویٰ کیا کہ بائیبل میں خدا نے یہود سے وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں ارض مقدس (فلسطین) کا حاکم بنائے گا۔ یہ پہلا موقع تھا جب برطانوی سیاسی حلقوں سے یہود کی حمایت کے لیے آواز بلند ہوئی۔

برطانیہ میں دوبارہ آمد

دنیا بھر کے سبھی عیسائی زمانہ قدیم سے بے تابی سے حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے منتظر ہیں۔ اسی لیے یہ امر ان کے لیے بڑا اہم بن چکا۔ یہی وجہ ہے، خصوصاً انا جیلی عیسائیوں کے لیے یروشلم میں یہود کی واپسی مذہبی فریضہ بن گئی۔ 1649ء میں انا جیلی عیسائی لیڈر، اولیور کرامویل نے برطانوی بادشاہ چارلس اول کو مار ڈالا۔ کرامویل کا انا جیلی پادری، پیٹر سٹیری یہود کی ''وطن'' واپسی تحریک کا کٹر حامی تھا۔ اس نے دعویٰ کیا: ''کرامویل کی کامیابی نزول مسیح اور یہود کی فلسطین میں واپسی کی نشانی ہے۔''

یہ پیش گوئی تو پوری نہ ہو سکی مگر یہود کے فائدے کا سبب بن گئی۔ کرامویل نے یہود کو دوبارہ برطانیہ آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ 1290ء میں برطانوی بادشاہ، ایڈورڈ اول نے جعلی کرنسی چلانے اور سود لینے کے جرم میں تمام یہود کو سلطنت سے نکال باہر کیا تھا۔ اس طرح ساڑھے تین سو سال بعد یہود دوبارہ برطانیہ واپس آ گئے۔

1000ء تا 1490ء مسلم اندلس یہود کا سب سے بڑا مرکز رہا تھا۔ ذمی ہونے کے باوجود اندلسی معاشرے میں یہود کو معززانہ مقام حاصل تھا۔ 1490ء تک مگر کیتھولک عیسائیوں نے اسپین و پرتگال پر قبضہ کر لیا۔ وہ حکومت سنبھالتے ہی یہود اور مسلمانوں کا قتل عام کرنے لگے۔ یہود نے فرار ہو کر افریقا اور مشرق وسطیٰ میں پناہ لی۔ جب برطانیہ میں انھیں آباد ہونے کی اجازت ملی تو جلد دیگر پروٹسٹنٹ مغربی ممالک مثلاً جرمنی، ہالینڈ، بیلجیم اور ڈنمارک میں انھیں بسنے اور کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ فرانس اور اٹلی میں بھی ان سے نفرت کم ہو چکی تھی۔ یہی وجہ ہے، افریقا اور مشرق وسطیٰ سے امیر یہودی یورپ چلے آئے۔ وہ صدیوں سے یہیں بسے بیٹھے تھے۔ اب یورپ میں تو انھیں سود خوری کا نہایت مرغوب ماحول مل گیا۔

امیر کبیر یہود کا ظہور

دراصل اس دوران ایسٹ انڈیا کمپنی، ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی اور دیگر تجارتی کمپنیاں وجود میں آ چکی تھیں۔ 1609ء میں برطانوی تاجروں نے امریکا میں پہلی نوآبادی (ورجینیا) قائم کر لی۔ یوں وہاں نوآبادیاں بسانے کا سلسلہ چل نکلا تاکہ مقامی وسائل سے استفادہ کیا جا سکے۔ اُدھر یورپی تجارتی کمپنیاں انڈونیشیا، ہندوستان، چین اور دیگر مشرقی ممالک کے وسائل لوٹ کر یورپ لانے لگیں۔ اس طرح برطانیہ اور

ہالینڈ میں خصوصاً سونے چاندی کے سکوں کی ریل پیل ہوگئی۔

امیر یہود نے یورپی تجارتی کمپنیوں میں سرمایہ لگایا اور خوب دولت کمائی۔ رفتہ رفتہ وہ ان کمپنیوں کو سود پر قرضے بھی دینے لگے۔ اس دوران ہندوستانی خام مال کو کام میں لانے کے لیے برطانیہ میں ٹیکسٹائل ملیں کھل گئیں۔ رفتہ رفتہ دیگر متعلقہ اور غیر متعلقہ صنعتیں بھی وجود میں آئیں۔ یہود نے ان صنعتوں میں بھی رقم لگائی اور خوب مالی فائدے میں رہے۔ سرمائے کی ریل پیل سے بینکوں اور مالیاتی اداروں نے جنم لیا۔ ان کے قیام میں بھی یہود کا حصہ رہا۔ غرض اگلے دو ڈھائی سو سال میں یورپ میں کئی یہودی بینکار، صنعتکار، سرمایہ کار اور تاجر سامنے آگئے۔ اب یہود نے خصوصاً امریکا، برطانیہ اور جرمنی میں معاشی قوت بھی حاصل کرلی۔

برطانوی سیاسی راہنما میدان میں

اسی اثنا میں انا جیلی عیسائی پادریوں اور برطانوی و امریکی سیاست دانوں کا اتحاد بھی پروان چڑھتا رہا۔ دونوں ممالک میں جو سیاست دان انا جیلی ووٹوں سے الیکشن جیت کر پارلیمنٹ میں پہنچتے تو وہ حکومتی ایوانوں میں انا جیلی عقائد کی ترویج کرنے لگتے۔ جیسا کہ بتایا گیا، ایک اہم انا جیلی عقیدہ ارض موعودہ (فلسطین) میں یہود کی واپسی اور حکومت کا قیام تھا۔ جوں جوں برطانوی پارلیمنٹ میں انا جیلی ووٹوں سے منتخب کردہ ارکان کی تعداد بڑھی، یہ عقیدہ مزید مستحکم اور نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اب یورپ کے پروٹسٹنٹ حلقوں میں یہود کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا کیونکہ وہی نزول مسیح کا انقلاب انگیز واقعہ انجام دینے کی قدرت رکھتے تھے۔

اٹھارہویں صدی تک یہود مذہبی و معاشی لحاظ سے یورپ میں اہم مقام حاصل کرچکے تھے۔ گویا پروٹسٹنٹ عقائد نے عیسائیت کی جون ہی بدل ڈالی۔ لاکھوں عیسائی جو پہلے یہود کو حضرت عیسیٰؑ کا قاتل سمجھتے تھے، اب انھیں اپنا نجات دہندہ تصور کرنے لگے۔ یہود کی بڑھتی طاقت کے باعث ہی نپولین بوناپارٹ جیسا فرانسیسی حاکم بھی ان سے مدد لینے پر مجبور ہوگیا۔ اس نے 1799ء میں یہود کو پیشکش کی کہ اگر وہ برطانیہ کو شکست دینے میں اس کا ساتھ دیں تو وہ فلسطین میں انھیں آزاد مملکت بنا کر دے سکتا ہے۔ تاہم نپولین انگریزوں کو شکست دینے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔

اٹھارہویں صدی تک یہود کے حمایتی انا جیلی عقائد سیاست میں پوری طرح مدغم ہوگئے۔ چنانچہ اب برطانوی وزیراعظم فلسطین میں یہودی حکومت کے قیام میں دلچسپی لینے لگے۔ ایسا پہلا وزیراعظم لارڈ پالمرسٹون تھا جو ایک وقفے سے تقریباً ساڑھے نو سال تک برطانیہ کا حکمران رہا۔ اسی کے دور میں برطانیہ نے یروشلم میں اپنا قونصل خانہ کھولا۔ آنے والے اکثر وزرائے اعظم مثلاً بنجمن ڈیزرائیلی، ولیم گلیڈسٹون، رابرٹ سیسل، آرتھر بالفور اور ڈیوڈ لائڈ جارج یہود کو فلسطین میں بسانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اسی دوران صیہونیت تحریک وجود میں آئی اور سلطنت عثمانیہ مٹانے کی سازشیں انگریز اور دیگر یورپی قوتیں انجام دیتی رہیں۔

عرب قوم پسندی کا ڈھکوسلا

1860ء کے عشرے میں ابراہیم یازجی اور اس کے گروہ نے لبنان میں ''عرب قوم پسندی'' تحریک کی بنیاد رکھی۔ یہ لبنانی عیسائی امریکی انا جیلی پادریوں کا ایجنٹ تھا جنھوں نے

بیروت میں امریکن یونیورسٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ تحریک کا مقصد اتحاد اسلامی پارہ پارہ کر کے عربوں کو قومیتوں اور نسلوں (شامی، مصری، عراقی، سعودی وغیرہ) میں تقسیم کرنا تھا۔ امریکن یونیورسٹی اس لیے قائم کی گئی تاکہ عرب معاشروں میں مغربی تہذیب وتمدن کے جراثیم پھیلائے جاسکیں۔

عرب قوم پسندی کو امریکی و برطانوی ایجنٹ تحریروں اور تقریروں کے ذریعے مشرق وسطیٰ میں پھیلانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اس تحریک نے شریف مکہ کو بہت متاثر کیا جو انگریزوں کے تعاون سے جزیرہ عرب نما (سعودی عرب)، شام، عراق اور فلسطین کا خلیفہ بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ چنانچہ جب عثمانی ترک پہلی جنگ عظیم میں جرمنوں کے ساتھ انگریزوں کا مقابلہ کر رہے تھے، تو شریف مکہ نے دیگر عرب سرداروں کے ساتھ مل کر سلطنت عثمانیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت ترک حکومت کی پیٹھ میں اپنوں ہی کی جانب سے چھرا گھونپنے کے مترادف تھی۔

انگریزوں نے مگر عربوں کے ساتھ دغابازی کی۔ شریف مکہ اور برطانوی حکومت کے مابین جولائی 1915ء تا مارچ 1916ء کے دوران گفت وشنید سے معاہدہ دوستی انجام پایا۔ اسی اثنا میں نومبر 1915ء تا 1916ء برطانیہ، فرانس، اٹلی اور روس نے سلطنت عثمانیہ کے حصے آپس میں تقسیم کرنے کا معاہدہ کر لیا جو ''سائیکس پیکو پیکٹ'' کہلاتا ہے۔ اس معاہدے کے ذریعے شریف مکہ اور اس کے حلیف عرب سرداروں کو حجاز کا علاقہ دے کر ٹرخا دیا گیا۔ مغربی قوتوں کی یہ دھوکے بازی ان کا طرۂ امتیاز بن چکی۔

اسی دوران امریکا میں پہلا اناجیلی صدر، وڈرو ولسن 1913ء میں اقتدار سنبھال چکا تھا۔ اس کا نانا اناجیلی پادری تھا۔ دسمبر 1916ء میں برطانیہ میں کٹر اناجیلی ڈیوڈ لائیڈ جارج وزیر اعظم بن گیا۔ ان دونوں کی جوڑی فلسطین میں یہود کے لیے ریاست بنانے میں سرگرم ہوگئی، جسے ''اسرائیل'' کا نام دیا گیا۔ سائیکس پیکو معاہدے کی رُو سے فلسطین کا علاقہ، فرانس، برطانیہ اور اٹلی میں تقسیم ہو جانا تھا مگر ڈیوڈ لائیڈ اور صدر ولسن نے اس تقسیم کی مخالفت کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ علاقہ یہود اور عیسائیوں کے لیے مقدس حیثیت رکھتا ہے لہٰذا اس کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے۔ دونوں لیڈروں نے شدید دباؤ پر فلسطین کی تقسیم کا معاملہ ختم کر دیا گیا۔

''صلیبی جنگیں اب ختم ہوئیں''

جون 1916ء سے عرب بغاوت شروع ہوگئی۔ کئی انگریز بشمول لارنس آف عربیا عرب لشکروں کو راہنمائی دیتے رہے۔ اس بغاوت سے برطانوی اور امریکی حکمران طبقوں کو یقین ہوگیا کہ اب فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنا ممکن ہے۔ اسی لیے نومبر 1917ء میں ''اعلان بالفور'' کے ذریعے متوحش اور بے چین یہود کو یقین دلایا گیا کہ فلسطین میں اسرائیل مملکت بن کر رہے گی۔ یوں مسلمانوں میں اختلافات اور عدم اتحاد یہود ونصاریٰ کے لیے مفید ثابت ہوئے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں برطانیہ و امریکا کے امیر کبیر یہودی سرمایہ دار، صنعت کار اور بینکار فلسطین کے ساحلی علاقوں میں وسیع پیمانے پر زمینیں خریدنے لگے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ مستقبل میں وہاں یہودی آبادکاروں کو بسایا جاسکے۔ یہ عمل آشکارا کرتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخر تک فلسطین میں اسرائیل کے قیام کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1900ء کے بعد یہودی بڑی تعداد میں فلسطین آنے لگے۔ امیر کبیر یہودی انھیں وہاں رہنے کے لیے ہر قسم کی سہولیات فراہم کرتے رہے۔

جارج لائیڈ اپنی آپ بیتی میں لکھتا ہے:

''1915ء اور 1916ء میں برطانیہ نے سوئیز نہر پر کثیر تعداد میں فوج جمع کر لی۔ (برطانوی مصر پر تب تک قبضہ کر چکے تھے) 1917ء میں انگریز مجاہدوں کی توجہ یہودا اور سامرہ کی وادی (ارض فلسطین) پر مرکوز ہوگئی۔ اب صلیبیوں کا جوش وجذبہ ان کی روح میں بھر گیا۔ ظالم ترکوں کی گرفت سے فلسطین کو رہا کروانے کے جذبے نے ان میں آگ لگا دی

اور وہ بڑے جوشیلے انداز میں مارچ کرنے لگے۔"

دسمبر 1917ء میں برطانوی فوج نے بیت المقدس پر قبضہ کرلیا۔ کہا جاتا ہے، برطانوی جرنیل، ایلن بی جب بیت المقدس میں داخل ہوا تو اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا "صلیبی جنگیں اب ختم ہوئی ہیں۔" یوں حرم شریف ایک ہزار سال بعد دوبارہ غیر مسلموں کے قبضے میں چلا گیا۔ بعد ازاں شریف مکہ اور دیگر عرب سرداروں پر انگریزوں کی مکاری عیاں ہوئی تو وہ بہت پچھتائے مگر اب کیا ہوسکتا تھا؟

فلسطینی مسلمانوں سے ناانصافی

انگریز دور حکومت میں فلسطین میں یہود کی آبادکاری کا عمل تیز ہوگیا۔ یہود نے دہشت گرد تنظیمیں بنالیں جو مسلمانوں پر حملے کرکے انھیں زمینوں سے بے دخل کرنے لگیں۔ اس طرح ارضِ فلسطین میں مسلمانوں اور یہود کے مابین جنگ نے جنم لیا۔ یہود کی بڑی تعداد آنے کے باعث صرف پینتالیس برس میں (1900ء تا 1945ء) ان کی آبادی تیس ہزار سے بڑھ کر چھے لاکھ تک پہنچ گئی۔

نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ نے فلسطین کو اسرائیل اور مسلم فلسطینی ریاست میں تقسیم کردیا۔ فلسطین میں تب ساڑھے بارہ لاکھ فلسطینی عرب مسلمان اور چھے لاکھ آٹھ ہزار یہودی آباد تھے مگر برطانیہ اور امریکا کے دباؤ پر یہود کو فلسطین کا 56 فیصد رقبہ مل گیا۔ مسلمانوں کے حصے میں صرف 43 فیصد رقبہ آیا۔ اس کھلی بے انصافی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مسلم ممالک نے اقوام متحدہ کی تقسیم نامنظور کردی۔ اقوام متحدہ کے اجلاس کا بائیکاٹ کرنے والے عربوں کا پاکستانی اور ہندوستانی مندوبوں نے بھی ساتھ دیا۔

جلد ہی مسلمانوں اور یہود کے مابین خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ 14 مئی 1948ء کی رات یہود نے اسرائیل کے قیام کا اعلان کیا تو اگلے ہی دن سعودی عرب، مصر، ایران، شام، عراق، یمن اور لبنان کی فوج نے نئی مملکت پر دھاوا بول دیا۔ یہود مگر جدید ترین امریکی و برطانوی اسلحے کے بل بوتے پر عربوں کو شکست دینے میں کامیاب رہے۔ اس جنگ میں اسرائیلی فوج نے اقوام متحدہ کی تجویز کردہ فلسطینی ریاست کے 60 فیصد حصے پر قبضہ کرلیا۔ تاہم مشرقی بیت المقدس اور مغربی کنارے پر اردنی فوج کنٹرول پانے میں کامیاب رہی۔ غزہ کا علاقہ مصری فوج کے قبضے میں آیا۔

جنرل ایلن بی بیت المقدس میں داخل ہوتے ہوئے

عرب اسرائیل جنگیں

5 جون 1967ء کو اسرائیل نے مصر، اردن اور شام پر حملہ کردیا۔ اس چھے روزہ جنگ میں عربوں کو پھر شکست ہوئی۔ اسرائیل نے مشرقی یروشلم بشمول حرم الشریف، مغربی کنارے، صحرائے سینا اور گولان کی پہاڑیوں پر قبضہ کرلیا۔ یکم ستمبر 1967ء کو عرب راہنماؤں کا اجلاس خرطوم سوڈان میں ہوا۔ اس میں طے پایا کہ اسرائیل کو ہرگز تسلیم نہیں کیا جائے

گا۔

1948ء سے 1967ء کی جنگوں نے فلسطین میں لاکھوں فلسطینی عرب مسلمانوں کو گھر بار اور زمینوں سے محروم کر دیا۔ وہ اردن، لبنان، شام اور دیگر علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ آج بھی بائیس لاکھ فلسطینی اردن، ساڑھے پانچ شام، پانچ لاکھ چلی، پونے پانچ لاکھ لبنان، چار لاکھ سعودیہ، تین لاکھ قطر، ڈھائی لاکھ امریکا اور ایک لاکھ متحدہ عرب امارات میں مقیم ہیں۔

دنیا بھر کے مسلمانوں کا مذہبی اتحاد حریفوں کو خار بن کر کھٹکتا ہے۔ اسی لیے غیر مسلم قوتیں زمانۂ قدیم سے عالم اسلام میں اپنے ایجنٹ بھجوا کر مسلمانوں میں مذہبی، فرقہ وارانہ، لسانی اور نسلی اختلافات پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ ان اختلافات کی وجہ سے مسلمانوں کو کئی بار نقصان پہنچا۔ مثلاً ہندوستان میں باہمی جنگی نے اسلامی حکومت کے خاتمے اور انگریزوں کو حاکم بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ جنوری 1976ء میں پہلا اناجیلی عیسائی، جمی کارٹر امریکی صدر بن گیا۔ وہ بھی اتحاد اسلامی کو پارہ پارہ کرنے کی پالیسی پر گامزن تھا۔

صدر بنتے ہی وہ مصر اور اسرائیل کا امن معاہدہ کروانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے مصری انورالسادات کو لارا دیا کہ معاہدے کے بعد امریکا مصر کو اربوں ڈالر کی عسکری و معاشی امداد فراہم کرے گا۔ انورالسادات لالچ میں آ کر اناجیلی صدر کے بچھائے دام میں پھنس گئے۔ حالانکہ انھوں نے چند سال قبل اکتوبر 1973ء میں اسرائیل پر زبردست حملہ کیا تھا۔ اس جنگ میں شام، سعودی عرب، اردن، عراق، لیبیا، تیونس، الجزائر اور مراکش کی افواج بھی ان کے ساتھ

شریف مکہ

تھیں۔ یہ جنگ بے نتیجہ رہی تھی۔

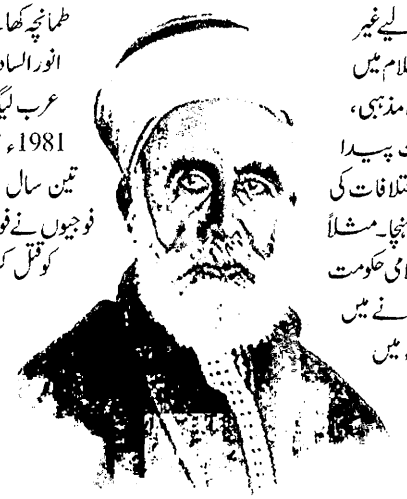

کیمپ ڈیوڈ معاہدہ

بہرحال ستمبر 1978ء میں امریکی سرپرستی میں مصر اور اسرائیل کے مابین کیمپ ڈیوڈ انجام پا گیا۔ اسرائیلی فوج نے صحرائے سینا خالی کر دیا۔ مصر اور اسرائیل، دونوں کو امریکا سالانہ بالترتیب سوا ارب ڈالر اور تین ارب ڈالر کی امداد دینے لگا۔ عالم اسلام میں مگر اس معاہدے سے سوگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اردن کے شاہ حسین نے اس عمل کو اپنے منہ پر طمانچہ کھانے سے تعبیر کیا۔ اسلامی دنیا میں انورالسادات ناپسندیدہ شخصیت بن گئے۔ عرب لیگ نے مصر کو نکال باہر کیا۔ اکتوبر 1981ء میں معاہدہ کیمپ ڈیوڈ کے ٹھیک تین سال بعد اسلامی تنظیموں سے منسلک فوجیوں نے فوجی پریڈ کے دوران انورالسادات کو قتل کر دیا۔ ان فوجیوں کے نزدیک انورالسادات دنیائے اسلام کے غدار تھے۔

1964ء میں عرب لیگ کے زیر اہتمام فلسطینی عربوں کی نمائندہ جماعت، تنظیم آزادی فلسطین کا قیام عمل میں آیا تھا۔ عرب ممالک کی مالی امداد سے جلد یہ چھاپہ مار جنگ میں طاق موثر تنظیم بن گئی۔ اس کے قائدین میں سر عرفات نمایاں تھے۔ 1967ء تا 1971ء تنظیم کا مرکزی دفتر اردن میں تھا۔ اردنی حکومت سے اختلافات کے بعد مرکزی دفتر لبنان منتقل ہو گیا۔

1982ء تک لبنان میں پی ایل او طاقت پکڑ چکی تھی۔ وہ اب اسرائیل کے لیے خطرہ بننے لگی۔ تنظیم کے گوریلوں نے اسرائیلی تنصیبات پر حملے کر کے انھیں سخت نقصان پہنچایا تھا۔ اسی باعث 1982ء میں اسرائیلی فوج نے لبنان پر حملہ کر دیا

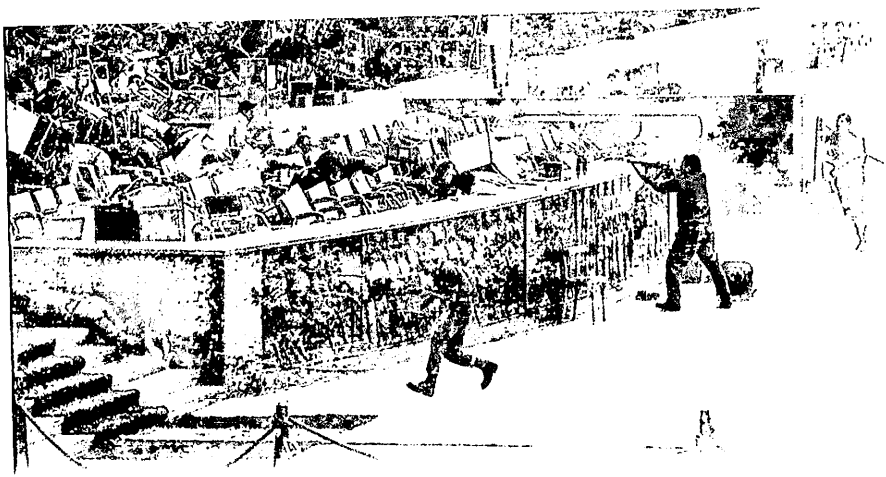

اور انور السادات قتل ہو گئے

تا کہ پی ایل او کے مراکز ختم کیے جاسکیں۔ اس جنگ میں بعدازاں شام بھی شامل ہو گیا۔

دسمبر 1987ء میں اسرائیلی سیکورٹی فورسز کے ظلم و تشدد کے خلاف مغربی کنارے اور غزہ میں عام فلسطینیوں نے اسرائیل کے خلاف مسلح تحریک شروع کر دی جسے ''انتفاضہ اول'' کہا جاتا ہے۔ یہ تحریک 1993ء تک جاری رہی۔ اس عرصے میں اسرائیل نے دو ہزار سے زائد فلسطینی شہید کر دیے۔ اسی تحریک کے دوران پہلی خلیجی جنگ انجام پائی۔ تب تحریک سے اتحاد کی خاطر عراقی صدر صدام حسین نے اسرائیل پر سکڈ میزائیل برسائے تھے۔

کٹا پھٹا فلسطین

1993ء تا 1995ء کے دوران امریکا کی حمایت سے اوسلو معاہدے تکمیل پائے۔ ان کے ذریعے اسرائیلی حکومت اور تنظیم آزادی فلسطین کے مابین مفاہمت ہوئی۔ طے پایا کہ مستقبل میں ''اسرائیلی شرائط'' پر پورا اترنے کے بعد مغربی کنارے اور غزہ میں آزاد فلسطینی ریاست تشکیل پائے گی۔

گویا پی ایل او نے کٹا پھٹا فلسطین تسلیم کر لیا۔ اس پر اسرائیل سے جنگ جاری رکھنے کی حامی فلسطینی تنظیموں نے پی ایل او اور یاسر عرفات کو سخت تنقید کا نشانا بنایا۔ اوسلو معاہدوں کے ذریعے مغربی کنارے اور غزہ پر محدود قوتیں رکھنے والی فلسطین اتھارٹی کی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔

اکتوبر 1994ء میں اردن اور اسرائیل نے سفارتی تعلقات قائم کر لیے۔ یوں اردن مسلمانوں کے دیرینہ حریف سے معاہدہ دوستی کرنے والا دوسرا عرب اور مسلمان ملک بن گیا۔ اگلے سال نومبر میں ایک انتہا پسند یہودی نے اوسلو معاہدے انجام دینے والے اسرائیلی وزیراعظم، یاتزک رابن کو قتل کر دیا۔

1996ء میں انتہا پسند یہودی لیڈر، بنجمن نیتن یاہو اسرائیل کا وزیراعظم بن گیا۔ اسی نے اوسلو معاہدے پس پشت رکھے اور مغربی کنارے میں یہودی بستیوں کی تعمیر کا دوبارہ آغاز کر دیا۔ تب سے اسرائیلی سیکورٹی فورسز وقتاً فوقتاً فلسطینی مسلمانوں پر حملے کرتی رہتی ہیں۔ اس دوران کئی ہزار

فلسطینی شہید ہو چکے۔ حماس اور دیگر جہادی تنظیمیں خصوصاً غزہ میں اسرائیل کے خلاف جنگ لڑ رہی ہیں۔

امریکا میں ڈرامائی تبدیلی

1948ء تک برطانیہ یہود کا سرپرست رہا۔ اس کے بعد امریکا نے یہ کردار سنبھال لیا۔ وجہ یہی کہ تب تک امریکا میں انا جیلی عیسائیوں کی کثرت ہو چکی تھی۔ نیز امریکا میں یہود بھی موثر طاقت بن گئے تھے۔ اسی نے اسرائیلی افواج کو جدید ترین اسلحہ دے کر عسکری قوت بنایا۔ اسرائیل کو ایٹم بم بنانے میں مدد دی۔ پاکستان نے تو زبردست کوششوں سے اپنا ایٹمی منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچا دیا مگر امریکا اور اسرائیل شام، عراق، ترکی اور ایران کو ایٹم بم بنانے سے روکتے رہے۔

جمی کارٹر کے بعد رونالڈ ریگن، جارج بش سینئر اور جارج بش جونیئر بھی انا جیلی صدور رہے۔ ان کے دور حکومت میں مگر انتظامیہ ملی جلی تھی۔ یعنی اس میں انا جیلی، لبرل سیکولر، لامذہب غرض ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے وزیر مشیر شامل تھے۔ اسی لیے انھیں انا جیلی عقائد پر عمل درآمد کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔

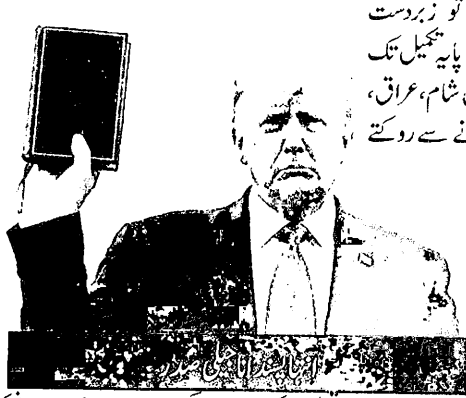

امریکا میں ڈرامائی تبدیلی 2015ء میں آئی جب ایک انا جیلی کھرب پتی، ڈونالڈ ٹرمپ نے الیکشن لڑنے کی مہم کا آغاز کیا۔ ٹرمپ سفید فام سپر میسی، نسل پرستی اور انا جیلی عقائد پر یقین رکھنے والے جرمن باپ کا بیٹا ہے۔ اسی سے عقائد اور نظریات بیٹے کو بھی منتقل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے، ڈونالڈ ٹرمپ صہیونی عیسائی بن گیا۔ یہ انا جیلی عیسائیوں کا انتہا پسند روپ کہلاتے ہیں۔

ٹرمپ کے حمایتی دو نرالے گروہ

2015ء سے امریکا کی امیر ترین (Super Rich) شخصیات میں شامل کئی انا جیلی اور یہودی مرد و زن ٹرمپ کی حمایت کرنے لگے۔ انھوں نے ٹرمپ مہم کو بھاری چندے بھی دیے۔ بعد ازاں غیر مذہبی امیر ترین افراد بھی ٹرمپ کے حامی بن گئے۔ امیر ترین امریکیوں کے یہ دونوں گروہ ٹرمپ حکومت سے اپنے اپنے مفادات پورے کرانا چاہتے تھے۔

پہلے گروہ میں شامل امیر ترین امریکی چاہتے تھے کہ صدر ٹرمپ امریکا میں عیسائیت کا احیاء کریں۔ اس مذہب کا حکومت میں عمل دخل بڑھائیں۔ نیز یہود اور اسرائیل کی حمایت بڑھا دیں تاکہ وہ اپنے مفادات پورے کر سکیں۔

دوسرے گروہ کے امیر ترین امریکیوں کی خواہش تھی کہ ٹرمپ انتظامیہ صنعت و تجارت اور کاروبار پر لگی پابندیاں اور قدغنیں ہٹا دے۔ وہ ان شعبہ جات میں حکومت کا عمل دخل کم سے کم چاہتے تھے تاکہ من مانی کر سکیں۔ چونکہ صدر ٹرمپ بھی بحیثیت سرمایہ دار حکومتی پابندیوں سے نالاں تھے، لہٰذا امیر ترین امریکیوں کو یقین تھا کہ وہ وائٹ ہاؤس پہنچ کر اس نظریے کی تبلیغ کریں گے کہ حکومت نجی شعبے کے معاملات میں کم سے کم دخل دے۔ اس طرح معیشت ترقی کرے گی۔ پابندیاں معیشت کو زوال پذیر کر دیتی ہیں۔

مطالبات پر عمل درآمد

پہلے گروہ کی تمنائیں پوری کرتے ہوئے صدر ٹرمپ اپنی انتخابی مہم میں مسلمانوں اور اسلام پر برس پڑے۔ انھوں نے مہاجرین کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ دہشت گردی اور اسلام کو ہم مترادف قرار دینے کی کوششیں کیں۔ صدر بن گئے تو فوراً مسلمان مہاجرین کی آمد پر پابندی لگا دی۔ فلسطین اتھارٹی کو

دی جانے والی امداد روک دی۔ امریکی سفارت خانہ یروشلم منتقل کر دیا۔ اعلان کیا کہ مشرقی یروشلم فلسطینی ریاست کا دارالحکومت نہیں بن سکتا۔ مغربی کنارے میں یہودی بستیوں کی تعمیر جائز قرار پائی۔ بے بس فلسطینی مردوں، خواتین اور بچوں پر اسرائیلی حملے درست سمجھے گئے۔ غرض ٹرمپ انتظامیہ نے اسرائیل کی حمایت کرنے میں انتہا کر دی۔ وجہ یہی کہ ٹرمپ، امریکی نائب صدر اور وزیر خارجہ پومپیو تینوں کٹر اناجیلی بلکہ صہیونی عیسائی ہیں۔

امریکی امیر ترین شخصیات پر مشتمل دوسرے گروہ کی خواہشات پر بھی ٹرمپ انتظامیہ نے شد و مد سے عمل کیا۔ ٹرمپ نے یہودی داماد کو اپنا خصوصی مشیر بنا کر اقربا پروری کی مثال قائم کر دی۔ ایف بی آئی، وزارت خارجہ، وزارت دفاع اور دیگر سرکاری محکموں کے اعلیٰ افسروں کو تضحیک کا نشانہ بنایا۔ وائٹ ہاؤس میں کئی روایات اور قانون پیروں تلے روند ڈالے۔ ان تمام اقدامات کا مقصد یہی تھا کہ وفاقی حکومت کو کمزور تر کیا جا سکے۔ حکومت عوام کی نگاہوں میں مذاق بن جائے۔ وہ اس قابل نہ رہے کہ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں، صنعت کاروں، سرمایہ داروں وغیرہ کو کنٹرول کر سکے۔ ان کی ناجائز سرگرمیاں روکنے میں ناکام ہو جائے۔

اسلامی ممالک کے مابین غلط فہمیاں پھیلانا

قبل ازیں بتایا گیا، عالم اسلام میں مذہبی، فرقہ وارانہ، لسانی اور نسلی اختلافات کو فروغ دینا مسلم دشمن طاقتوں کا ایجنڈا ہے۔ اس ضمن میں دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ اسی باعث 1948ء سے مشرق وسطیٰ اور جنوبی ایشیا میں سی آئی اے، موساد اور بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیاں سرگرم ہیں تاکہ اپنے مفادات پورے کر سکیں۔ 1949ء میں سی آئی اے نے استعمار کے مخالف شامی وزیراعظم قوتلی کی حکومت ختم کر دی تھی۔ اسی طرح پاکستانی وزیراعظم لیاقت علی خان اور ایران کے محمد مصدق بھی امریکی و برطانوی مفادات کی تکمیل نہ کرنے پر راہ سے ہٹا دیے گئے۔

1979ء کے بعد سے مغربی میڈیا نے یہ شوشا چھوڑ دیا کہ ایران اور سعودی عرب کے مابین سرد جنگ چھڑ چکی۔ دونوں ممالک کے مابین مختلف اختلافات موجود تھے مگر مغربی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی ایما پر ان کے میڈیا نے انھیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ مدعا یہی تھا کہ عالم اسلام کے دونوں اہم ممالک کے مابین دشمنی اور غلط فہمیاں پیدا کی جا سکیں۔

2009ء میں انتہا پسند تجمن نیتن یاہو دوبارہ اسرائیلی وزیراعظم بن گیا۔ اگلے ہی سال شام و عراق میں ایک پراسرار تنظیم، داعش نے جنم لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے قیام میں اسرائیل اور امریکا نے اہم کردار ادا کیا۔ جلد ہی مغربی میڈیا ایران کے ''ایٹم بم'' کو ہوا بنا کر پیش کرنے لگا۔ پروپیگنڈا کیا گیا کہ اس ایٹم بم سے اسرائیل ہی نہیں تمام خلیجی ممالک کی بقا خطرے میں پڑ جائے گی۔ آنے والے برسوں میں شام، عراق اور یمن میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ ایران کے معاملے پر قطر اور سعودی عرب کے مابین کشیدگی نے جنم لیا۔ ترکی بھی اس معاملے میں قطر کی حمایت پر کود پڑا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ امریکا اور اسرائیل نے ایرانی ایٹم

بم سے خوفزدہ کر کے ہی متحدہ عرب امارات کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ اگرچہ حالیہ معاہدہ دوستی سے دونوں ممالک کے معاشی مفادات بھی وابستہ ہیں۔ یو اے ای خاصی حد تک سعودی عرب کے زیر اثر ہے۔ چنانچہ اسرائیل۔ یو اے ای معاہدے پر سعودی حکومت نے بھی صاد کیا ہوگا۔ گو سعودی وزیر خارجہ کا کہنا ہے کہ فلسطینیوں سے امن معاہدے کی تکمیل تک سعودیہ اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا۔''

عالم اسلام مزید تقسیم

عالم اسلام کی صورت حال سے عیاں ہے کہ اسرائیل۔ یو اے ای معاہدے نے امت کو تقسیم کر دیا۔ مصر، اردن، عمان اور بحرین نے معاہدے کا خیر مقدم کیا۔ تاہم ترکی، ایران، شام، قطر اور لبنانی پارٹی، حزب اللہ نے اسرائیلی حکومت سے معاہدہ دوستی کرنے پر یو اے ای کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ان کا کہنا ہے کہ یو اے ای نے اسرائیل کے مظالم سے مفاہمت کر کے نہتے فلسطینیوں پر اسرائیلی مظالم کو جائز قرار دے ڈالا۔ ان میں اماراتی شاہی خاندان کے خلاف شدید غصہ جنم لے چکا۔ پاکستان سمیت دیگر ممالک نے محتاط ردعمل دکھایا۔ تاہم پاکستانی وزیر اعظم نے بیان دیا کہ فلسطینی مسئلہ حل ہونے تک پاکستان اسرائیل کو تسلیم نہیں کرے گا۔

ڈراما کیوں رچایا گیا؟

امریکی دانشوروں کا کہنا ہے کہ اسرائیل۔ یو اے ای معاہدہ ٹرمپ اور نیتن یاہو حکومتوں کا مشترکہ کارنامہ ہے۔ امریکی اناجیلی ووٹروں کو خوش کرنے کے لیے یہ ڈراما رچایا گیا کیونکہ امریکا میں الیکشن کی آمد آمد ہے۔ اس معاہدے سے آشکارا ہو گیا کہ اسرائیل کے خلاف عرب اتحاد کمزور پڑ چکا۔ امریکا اور اسرائیل کی مشترکہ کاوشوں نے عرب اتحاد میں دراڑیں ڈال دی ہیں۔ اسی لیے صدر ٹرمپ نے بیان بھی دیا کہ اس معاہدے سے سبھی اناجیلی بہت خوش ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آمدہ الیکشن میں امریکی اناجیلی کیا مشترکہ طور پر ٹرمپ کو ووٹ دے کر کامیاب کروا سکیں گے؟

مسجد اقصیٰ خطرے میں

بائیبل کی پیش گوئیوں کے مطابق ''گریٹر'' یا عظیم تر اسرائیل کی سرحدیں نیل (مصر) سے لے کر فرات (شام و عراق) دریاؤں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ لیکن دور جدید میں ''گریٹر اسرائیل'' کی اصلاح کے معنی بدل چکے۔ اب اسرائیل مملکت پورے فلسطین پر مشتمل ہے۔ گویا اس ریاست میں مشرقی یروشلم، مغربی کنارا اور غزہ شامل ہوں گے۔ یہی وجہ ہے، اسرائیلی حکمران طبقہ مشرقی بیت المقدس اور مغربی کنارے میں دھڑا دھڑ یہودی بستیاں تعمیر کر رہا ہے تاکہ فلسطینی علاقوں پر قبضہ کیا جا سکے۔ اگرچہ اسرائیل نے یو اے ای سے معاہدے کے بعد عارضی طور پر بستیوں کی تعمیر روک دی ہے لیکن وہ جب چاہے، منصوبہ شروع کر سکتا ہے۔

صورت حال سے آشکارا ہے کہ امریکی و اسرائیلی دماغ عالم اسلام کو تقسیم در تقسیم کرنا چاہتے ہیں تاکہ مستقبل میں اپنے عزائم پورے کر سکیں۔ بھارت کے نریندر مودی نے دوسری بار وزیر اعظم بن کر وہ کام کر دکھائے جن کا سوچنا بھی محال تھا۔ اس نے جموں و کشمیر کو ہڑپ کر لیا۔ نیز بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنا ڈالا۔ اب وہ بنارس کی مشہور عالمگیر مسجد کو شہید کرنے کے درپے ہے۔

اسی طرح ٹرمپ انتظامیہ دوسری بار برسر اقتدار آ گئی تو اناجیلی امریکی حکمران طبقے کی آشیر باد سے اسرائیلی حکومت کوئی بھی انتہا پسندانہ قدم اٹھا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اسرائیلی فوجی جنونی ہجوم کا روپ دھار کر مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرا شہید کر دیں۔ بعد ازاں مودی حکومت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسرائیلی حکومت قانونی موشگافیوں سے فائدہ اٹھا کر عدالتوں سے اس جگہ تیسرے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کر سکتی ہے۔ مسلم حکمران نااتفاقی اور عدم اتحاد کے سبب اسرائیلی حکومت کا منہ تکتے رہ جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ زبانی جمع خرچ سے کام چلایا جائے گا۔ اسرائیل کے ایٹم بموں کا سامنا کس نے کرنا ہے؟

جیف بیزوس سعودی ولی عہد کے ساتھ

یہ واضح رہے کہ ٹرمپ کی حمایت کرنے والے انا جیلی اور مفاد پرست امریکی کھرب پتیوں میں شیلڈن ایڈلسن، چارلس شواب، چارلس کوخ، سام والٹن فیملی، پیٹر اندریاس، سٹیو ڈائسن، جو ایکٹس، پال سنگر، وارن اسٹفن، جیف پالمر اور اینڈریو بیل وغیرہ شامل ہیں۔ دنیا کا امیر ترین شخص، جیف بیزوس بھی ٹرمپ کی حمایت کر رہا ہے۔ ان امیر ترین شخصیات کی سرپرستی اور کروڑوں انا جیلی ووٹروں کے باعث ہی ٹرمپ کا اپنے حریف، جو بائیڈن سے سخت مقابلہ درپیش ہے۔

طاقتور ہوتے ہوئے بھی کمزور

دنیا میں تقریباً دو ارب مسلمان بستے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی اسلامی رابطہ تنظیم (او آئی سی) کے 57 رکن ممالک ہیں۔ ان میں سے 53 ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان ممالک کا کُل جی ڈی پی (پی پی پی) تقریباً 29 ٹریلین ڈالر ہے۔ یہ دنیا کا 22 فیصد حصہ ہے۔ یہ ممالک کم از کم 60 لاکھ سپاہ رکھتے اور جدید ترین اسلحے سے بھی لیس ہیں۔ گویا اسلامی ممالک اتحاد و ایکا کر لیں تو وہ معاشی و عسکری طور عیسائی بلاک کے بعد دنیا کی دوسری بڑی طاقت بن جائیں۔

اختلافات اور مفادات نے مگر امت مسلم کو تقسیم کر کے رکھ دیا۔ اس تقسیم نے حقیقتاً پچھلے پانچ سو برس میں عالم اسلام کو سخت نقصان پہنچایا۔ اسی وجہ سے بیسویں صدی میں کشمیر اور فلسطین کے اندوہناک مسائل نے جنم لیا۔ نااتفاقی کے سبب ہی آج افغانستان، یمن، لیبیا، عراق اور شام خانہ جنگی کا شکار ہیں۔ عدم اتحاد کی وجہ سے ہی مسلم دشمن قوتیں مسلم حکمرانوں کو اپنے مفادات پورے کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔

یہ آشکارا ہے کہ صورت حال کافی سنگین ہے۔ اگر مسلم حکمران ہوش میں نہ آئے، تو خدانخواستہ ماضی کی طرح وہ دوبارہ مغربی استعماری قوتوں کے محکوم بن جائیں گے۔ ویسے تو کئی اسلامی ممالک اب بھی کون سا کلی طور پر آزاد و خودمختار ہیں؟ حکمرانوں کی عیاشیوں، کرپشن اور قرضوں کے انبار نے انھیں مغربی ممالک کی کٹھ پتلی بنا ڈالا۔ اسلامی ممالک کے عوام میں تو پھر اتحاد اسلامی، بھائی چارہ اور باہمی محبت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ بیشتر حکمران مگر ذاتی مفادات اور مادی خواہشات کے چنگل میں پھنس کر امت ہی نہیں اسلامی تعلیمات سے بھی دور ہو چکے۔ اسی باعث عالم اسلام اپنے زوال سے نجات نہیں پا سکا۔ شاعر مشرقؒ نے ایک صدی قبل فلسطینی عرب مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں، وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے، غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

ڈاکٹر سید افسر امام زیدی

شام کا طمطراق سجا ہوا دربار، ایک بارعب منظر پیش کر رہا ہے، جیسے کسی رومی قیصر کے رکھ رکھاؤ کا حامل ہو۔ طلائی کرسیوں پر غیر ملکی سفیر اور مختلف سردار موجود ہیں۔ اتنے میں صبر آزما انتظار کے بعد پژمردہ حال قیدی، زیادہ تر خواتین اور بچے صرف ایک مرد کے ساتھ دربار میں داخل ہوتے ہیں۔ بچے مرجھائے ہوئے ہیں اور خواتین خستہ حال۔ روم کے سفیر نے قیدیوں کا حدود اربعہ معلوم کرنا چاہا تو اُسے بتایا گیا کہ مدینے کے گھرانے سے تعلق ہے۔ اس پر اُس نے حیران ہوکر کہا کہ آپ تو اپنے آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل بتاتے آئے ہیں۔ اس گستاخی پر اُس کا سر اُڑا دیا گیا۔

اچانک قیدیوں میں سے ایک خاتون نے جاہ و جلال کے ساتھ کلام کا آغاز کیا: ''اے ہمارے آزاد کردہ غلاموں کے بیٹے! کیا تو نے ہمیں قید کر کے یہ سمجھ لیا کہ تو نے اللہ کی بارگاہ میں عزت حاصل کر لی اور تیری حکومت ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئی۔ حالانکہ ظالموں کو اللہ اس لیے ڈھیل دیتا ہے کہ وہ اور زیادہ گناہ کر لیں اور پھر اُن کے لیے دردناک

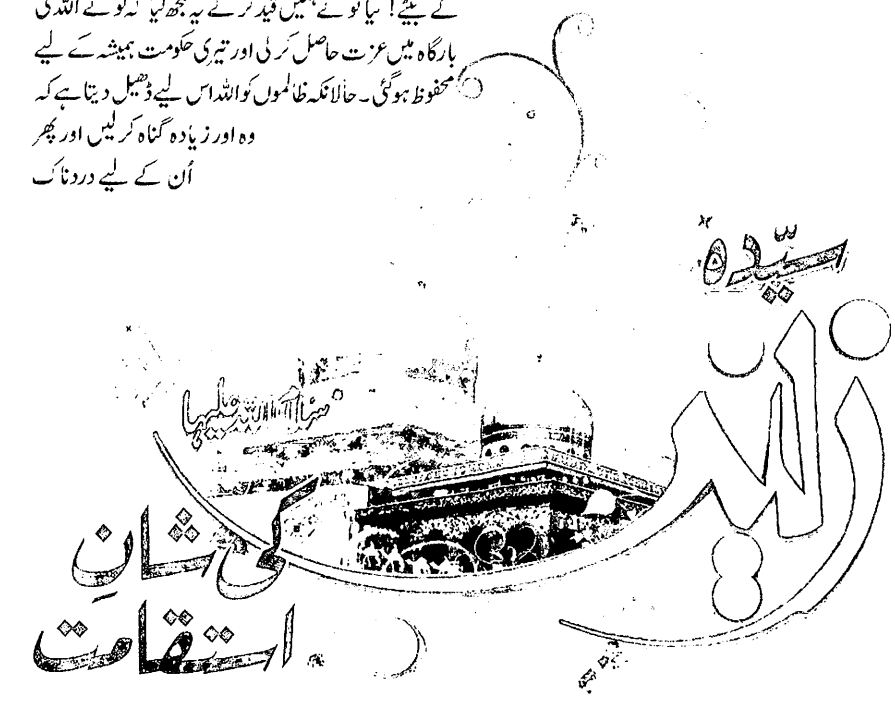

سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کی شانِ استقامت

سیدہ زینب سلام اللہ علیہا اپنے والد شیرِ خدا کی بلاغت اور علمیت کے ساتھ ساتھ اپنی والدہ سیدہ فاطمہ سلام اللہ علیہا کی خطابت کی بھی امین تھیں

عذاب تیار ہے۔''

اس مدبر خاتون کی عالمانہ گفتگو سے دربار پر سناٹا چھا گیا۔ جابر سلطان اب خفیف نظر آنے لگا۔ سیدہ زینبؑ کے خطاب نے ہر شخص کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ حق پر کون ہے۔

بی بی زینبؑ وہ ہستی ہیں جنہوں نے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے بعد شہر شہر سے گزرتے ہوئے قید و بند کی سختیوں کے باوجود اپنے بھائی کے مقصدِ شہادت کو اُمت تک پہنچایا۔

بی بی زینبؑ کا خاندانی پس منظر بڑا تابناک ہے۔ اُن کے نانا رحمت العالمین ﷺ، والدہ معظمہ سیدۃ النسا العالمین اور والد محترم امام المتقین اور باب العلم کے القاب سے پہچانے جاتے ہیں۔ بی بی زینبؑ اپنے والد حضرت علیؑ کی بلاغت اور علمیت کے علاوہ اپنی والدہ سیدہ فاطمہؑ کی خطابت کی بھی امین تھیں۔ اُن کو بی بی فاطمہؑ کے خطبے یاد تھے جو انھوں نے مختلف مواقع پر دیے تھے۔ آپؑ نے اپنے والدین کے علاوہ اپنے بھائیوں حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام حسینؑ، حضرت ام سلمہؓ اور اُم ہانیؓ کی روایات بھی بیان فرمائی ہیں۔ اس لیے اُن کا ایک لقب عقیلہ بھی معروف ہے۔ ساری زندگی حتیٰ کہ شام کے سفر میں نماز شب اور تلاوت قرآن پاک کا کبھی ناغہ نہ ہوا۔ تہجد اور تلاوت کا معمول آپؑ نے محرم کی دسویں اور گیارہویں کی مصیبت بھری راتوں میں بھی ترک نہ کیا۔ حضرت امام حسینؑ شب عاشورا اپنے اہل خانہ سے آخری ملاقات کو تشریف لائے تو انھوں نے سیدہ زینبؑ سے فرمایا: ''میری پیاری بہن! مجھے نماز شب میں فراموش نہ کرنا۔'' ایثار اور سخاوت کا یہ عالم کہ سفر شام میں کمزوری کے باعث نمازیں بیٹھ کر پڑھتی رہیں۔ کیونکہ وہ اپنے حصے کا کھانا بچوں میں تقسیم کر دیا کرتی تھیں۔

بی بی زینبؑ شادی کے بعد رخصت ہو کر حضرت عبداللہ بن جعفر کے گھر آئیں تو اُن کا گھر برکتوں سے مالا مال ہو گیا۔ وسیع رزق اور سرسبز شاداب اراضی کی بدولت یہ خانوادہ مساکین اور فقراء کے لیے عظیم سہارا تھا۔ بی بی زینبؑ 6 ہجری میں پیدا ہوئیں اور رسول اللہؐ کے سایہ عاطفت میں 5 سال تک رہیں۔ اس طرح آپؑ صحابیات میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ آپؑ کے والد، والدہ اور دونوں بھائی اسلام کی برگزیدہ ہستیوں میں سے ہیں۔ جن کا تذکرہ قرآن شریف میں آیت مباہلہ اور آیت تطہیر کے آچکا ہے۔

سیدہ زینبؑ کے عقد کے وقت اُن کے والد جناب علی المرتضیٰؑ نے یہ شرائط طے کروائی تھیں کہ وہ کبھی کبھار دن میں اپنے بھائی حسینؑ سے ملاقات کرتی رہیں گی اور مدینہ چھوڑنے کی صورت میں بی بی زینبؑ اُن کے ہمراہ جا سکیں گی۔ چنانچہ جب امام حسینؑ کربلا روانگی کے لیے تیار ہوئے تو آپؑ کے شوہر جناب عبداللہ نے بچوں سمیت انھیں بخوشی رخصت کیا۔

والدہ محترمہ حضرت فاطمہؑ کے وصال کے بعد آپؑ کی طبیعت سے بے فکری رخصت ہو گئی اور احساس ذمہ داری غالب آ گیا۔ اس دوران بی بی زینبؑ سیاسی ماحول کی تبدیلی کا بغور مشاہدہ کر رہی تھیں۔ خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد حضرت عمر فاروقؓ کا دور آیا پھر حضرت عثمانؓ کا زمانہ بھی آ گیا۔ بی بی زینبؑ نے اپنے والد مکرم حضرت علیؑ کی مدبرانہ زندگی بھی دیکھی۔ اپنی شادی سے پہلے اُن پر اپنے والد کی زندگی کے مختلف پہلو بخوبی نقش ہو چکے تھے حتیٰ کہ اُن کی ازدواجی زندگی شروع ہو گئی۔ وہ اپنے والد سے اتنی متاثر تھیں کہ جب حضرت علیؑ کا دور خلافت شروع ہوا تو اپنے شوہر حضرت عبداللہ بن جعفر کے ہمراہ نجف منتقل ہو گئیں۔ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد یہ گھرانا مدینہ واپس آ گیا۔ حضرت علیؑ کا دور خلافت بہت پُرآشوب تھا۔ اُنھیں یکے بعد دیگرے بہت سے معرکے سر کرنے پڑے۔

امیر معاویہؓ نے حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد مدینے آ کر اپنے اقتدار کو مضبوط بنانے کی حتی الوسع کوشش کی۔ بی بی

زینبؓ نے محسوس کیا کہ حضرت امام حسنؓ کی زہر خورانی سے شہادت کے بعد خاندانِ آلِ رسولؐ اب بالکل پس منظر میں جا رہا ہے۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کشمکش سے بخوبی آگاہ ہوں گے۔ بی بی زینبؓ اپنے والد کی شہادت کے بعد کے حالات پر بہت رنجیدہ تھیں۔ انھیں یاد پڑتا ہے کہ جب امیر معاویہ مدینے آ کر یزید کی جانشینی کی بیعت لے رہے تھے تو اُم المومنین حضرت عائشہؓ نے کھلم کھلا اس کی مخالفت کی اور کہا: ''کیا خلفائے راشدین نے اپنے فرزندوں کو جانشین مقرر کیا تھا۔ جب امیر معاویہؓ نے تسلیم کیا کہ ایسا نہیں اور اُن کے پاس خاموشی کے علاوہ کوئی جواب نہیں تھا۔''

اگرچہ یہ امر واقعہ ہے کہ صلح حسن میں جو شرائط حضرت معاویہؓ کے ساتھ طے ہوئی تھیں۔ بعد میں اُن پر عمل نہ ہوا۔

یزید کی ولی عہدی کی بیعت کے لیے مسلمانوں پر جس طرح دباؤ ڈالا گیا وہ بھی کوئی احسن امر نہ تھا۔ چونکہ اب اہل بیت کا خاندان مدینے میں قیام پزیر تھا اس لیے بی بی زینبؓ اپنی گھریلو مصروفیات کے ساتھ ساتھ حضرت امام حسین کی دلجوئی پر بھی توجہ مرکوز رکھتی تھیں جو امام حسنؓ کی شہادت کے بعد بہتر دل گرفتہ تھے۔ اگرچہ اسلامی خلافت کو بالجبر موروثی بادشاہت میں تبدیل کرنے میں سدِ راہ حضرت امام حسینؓ کے علاوہ حضرت عائشہؓ، عبدالرحمٰنؓ بن ابوبکر، عبداللہ ابن عمرؓ، عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن زبیر نظر آ رہے تھے۔ بی بی زینبؓ سیاسی حالات میں تغیرات کو سمجھ رہی تھیں اور وہ جان گئی تھیں کہ اب ایک صبر آزما کشمکش کا آغاز ہونے جا رہا ہے جس کا خاتمہ غیر معین نظر آ رہا تھا۔ یہ کربلا کی جنگ کے لیے راستہ ہموار ہونے کی شروعات تھی۔

یزید نے تخت نشینی کے بعد مدینہ کو اوّلین توجہ دی اور مدینے کے گورنر ولید بن عقبہ کو حکم دیا کہ عمائدین سے سختی کے ساتھ بیعت کے حکم کی تعمیل کروائی جائے۔

ان حالات سے بی بی زینبؓ بہت اذیت محسوس کر رہی تھیں۔ ولید بن عقبہ امیر معاویہؓ کا بھتیجا ہونے کے باوجود امام حسینؓ کی آفاقی شخصیت سے متاثر اور مرعوب تھا۔ اس لیے اُسے امامؑ عالی مقام کو یکا یک رات کو طلب کرنا ایک چیلنج محسوس ہو رہا تھا چہ جائیکہ اُن سے بیعت طلب کرتا۔ بہرحال آخرکار حکومتی دباؤ پر اُس نے اُسی رات عبداللہ ابن زبیر اور حضرت امام حسینؓ کو بلوا بھیجا۔ اس اچانک بلاوے کی وجہ کا اندازہ امام حسینؓ کو بخوبی ہو گیا کہ یہ خالی از علت نہیں ہے چنانچہ وہ اپنے اعزہ کے ہمراہ تشریف لے گئے۔ مروان بن الحکم نے امام حسینؓ کے پہنچنے پر ولید سے کہا اگر یہ بیعت نہ کریں تو انھیں ابھی قتل کر دو۔ اس پر حضرت امام حسینؓ نے مروان سے کہا تو مجھے قتل کرانے کی جرأت کر سکتا ہے؟ پھر ولید سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''میرے جیسے شخص کا رات کے وقت بیعت کا اظہار موزوں نہیں۔ جب کل دن میں اور لوگوں کی موجودگی ہو گی تو میرا اظہار آمادگی زیادہ مناسب ہے۔'' بعد میں ولید نے مروان سے کہا: ''تو مجھے ایسے کام کا مشورہ دیتا ہے جس سے میرا دین برباد ہو جائے اور قیامت کے روز خدا کے ہاں راندۂ درگاہ ہو جاؤں!''

حضرت امام حسینؓ نے بیعت کے مطالبہ کرنے والوں کے سامنے جھکنے کے بجائے انکار پر ثابت قدم رہنے کا عزم کر لیا اور اُس کے لیے مدینہ چھوڑنا پہلی منزل تھی۔ آلِ رسولؐ کو مدینے سے کتنا لگاؤ تھا، یہ محتاجِ بیان نہیں۔ امام حسینؓ نے یہ ناخوشگوار فیصلہ اپنے اعزہ کی باہمی مشاورت سے کیا۔ سیدہ زینبؓ کا اپنے وطن سے لگاؤ قابلِ فہم تھا لیکن اُن کے والد بزرگوار حضرت علیؓ نے اپنی بیٹی کے عقد کے موقع پر یہ معاملہ فہمی پہلے ہی کر لی تھی کہ جب بھی حضرت امام حسینؓ پر کوئی کڑی آزمائش آئے گی اور انھیں مدینہ چھوڑنا پڑا تو بی بی زینبؓ کو اُن کے ہمراہ جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ چنانچہ جب حضرت امام حسینؓ 28 رجب 60 ہجری کو اپنے اہل خانہ کے ہمراہ مدینے سے روانہ ہو کر شب جمعہ 3 شعبان

60 ہجری مکہ پہنچے تو بی بی زینبؓ اُن کے ہمراہ تھیں۔ یہاں پہنچ کر آپؑ کو اندازہ ہوا کہ حالات تیزی سے تبدیل ہو چکے ہیں۔ تمام علاقوں کے گورنر تبدیل کر کے سخت گیر حکام مقرر کر دیے گئے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ کا قیام شعب علی میں تھا اور وہ حالات کا جائزہ لے کر کوئی فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ حج سے پہلے حضرت امام حسینؑ کو ادراک ہو گیا تھا کہ حاجیوں کے بھیس میں فوجی بھی مکہ میں موجود ہیں چنانچہ آپؑ نے حج کو عمرے سے بدلا اور مکہ کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ مکہ سے باہر گورنر کے فوجی دستے نے آپ کو زبردستی روکنا چاہا لیکن مزاحمت کے باعث ناکام رہا۔ ابھی روانگی کے بعد اگلی منزل کا فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کوفے سے حضرت امام حسینؑ کے مداحوں کے اتنے خطوط آئے کہ تھیلے بھر گئے۔ چنانچہ حضرت امام حسینؑ نے حالات کا جائزہ لینے کے لیے اپنے چچازاد بھائی حضرت مسلم بن عقیلؓ کو کوفے روانہ کیا۔ قافلہ مکے سے اگلی منزل پر پہنچا تو کوفے سے اطلاع آئی کہ حضرت مسلم بن عقیلؓ، ابن زیاد کے حکم پر شہید کر دیے گئے۔ ایک چشمے پر زبیر ابن قین ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ حکومت شام کے ہم خیال تھے۔ انھیں حضرت امام حسینؑ نے یاد فرمایا تو سوچ میں پڑ گئے۔ اس پر اُن کی زوجہ جز بز ہو کر بولیں: فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمھیں بلا رہے ہیں اور تم متامل ہو رہے ہو۔'' چنانچہ وہ حاضر خدمت ہوئے اور اُن کے ہمراہیوں میں شامل ہو کر سُرخرو ہوئے اور اپنی زوجہ کو طلاق دے کر اُس کے بھائی کے ساتھ میکے بھیج دیا۔

حالات کی سنگینی بھانپتے ہوئے بی بی زینبؓ کو کسی خیر کی توقع نہیں رہی تھی اور امام حسینؑ نے اپنے قافلے میں سے بیشتر حضرات کو جو راستے میں شامل ہوئے تھے واپس چلے جانے کے لیے کہا۔ آگے بڑھ کر انھوں نے مشکیزے دوبارہ بھر لیے کیونکہ موسم گرم ہو رہا تھا اور پانی ملنے کا امکان غیر یقینی تھا۔ تھوڑی دور ایک فوجی قافلے پر نظر پڑی۔ آپؑ نے آگے بڑھ کر ایک پہاڑی کی اوٹ میں اپنے آپ کو خیمہ زن کر لیا تاکہ مزاحمت کی صورت میں مشکل پیش نہ آئے۔ معلوم ہوا کہ گورنر کوفہ ابن زیاد نے شہر سے باہر اپنے فوجی دستے متعین کر دیے تھے اور وہاں سے ایک دستہ امام حسینؑ کی آمد کو روکنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ دستہ حُر بن ریاحی کی سربراہی میں حضرت امام حسینؑ تک ہانپتا کانپتا پہنچا تو پیاس کے مارے بُرا حال تھا اور گھوڑوں کی زبانیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ حضرت امام حسینؑ نے اپنے پاس موجود پانی انھیں فراہم کیا۔ حُر، حضرت امام حسینؑ کی اعلیٰ ظرفی سے بہت متاثر ہوا۔ اب امام حسینؑ نے قافلے کو آگے بڑھانا چاہا تو حُر نے مزاحمت کی اور کہا کہ آپ ایسا راستہ اختیار کیجیے جو نہ مدینہ جاتا ہو اور نہ کوفہ۔'' چنانچہ جب آپ آگے بڑھے تو وادی نینوا کے علاقے میں پہنچ گئے۔ یہاں تھوڑا سا آگے بڑھ کر دریائے فرات کے قریب پہنچنا چاہا تو حُر پھر مزاحم ہوا۔ استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ جگہ کربلا ہے۔

حضرت امام حسینؑ کا یہ سفر 2 محرم 61ھ کو تمام ہوا۔ بی بی زینبؓ کی تشویش اب بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ ایک اور فوجی دستہ اگلے روز عمر بن سعد کی سربراہی میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے 500 سواروں کو دریائے فرات پر بٹھا دیا۔ عمر بن سعد نے امام حسینؑ سے پوچھا کہ وہ اس طرف کیوں تشریف لائے ہیں۔ اس پر آپؑ نے فرمایا کہ کوفے کے لوگوں نے خطوط بھیج کر بُلایا ہے۔ اگر وہ نہیں چاہتے تو واپس چلے جائیں گے۔ اس پر عمر بن سعد نے گورنر ابن زیاد کی رائے مانگی لیکن اُس نے جواب دیا: ''اب وہ واپس نہیں جا سکتے جب تک بیعت کے لیے راضی نہ ہو جائیں۔''

امام حسینؑ نے فرمایا ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بیعت نہ کرنے کا انجام زیادہ سے زیادہ موت ہے تو میں اُس کے لیے تیار ہوں۔ اس کشمکش میں ساتویں محرم آن پہنچی اور کوفے سے مزید فوج کربلا پہنچ گئی۔

امام حسینؓ چند ساتھیوں کو ساتھ لے کر چلے تھے۔ اب کچھ اور لوگ بھی راستے میں شامل ہو گئے۔ بالخصوص اُن کے بچپن کے ساتھی حبیب ابن مظاہر بھی کوفے سے کسی طرح نکل کر آپ سے آملے۔ عمر بن سعد نے ایک رات کو حضرت امام حسینؓ سے گفت وشنید کے ذریعے معاملہ فہمی کی کوشش کی جس میں کئی صورتیں سامنے آئیں لیکن ابن زیاد نے ان کو ٹھکرا دیا اور جنگ پر اصرار برقرار رکھا۔

نویں محرم کو فوجوں نے اچانک حملے کا آغاز کیا تھا کہ حضرت امام حسینؓ نے حضرت عباسؓ کو بھیج کر ایک رات کی مہلت طلب کی جو منظور ہو گئی۔ اس جانکاہ کیفیت سے بی بی زینبؓ کا دل رقیق ہو کر گریہ وزاری پر آمادہ ہوا تو امام حسینؓ نے حوصلہ دلایا کیونکہ آنے والا وقت اس سے بھی سنگین نظر آ رہا تھا۔ دسویں محرم کی رات کو جنگ سے پہلے امام حسینؓ نے اپنے رفقا کو یکجا کر کے کہا کہ آپ لوگ انتہائی مخلص اور نیکوکار ثابت ہوئے ہیں میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ آپ اپنے اہل خانہ کو لے کر واپس چلے جائیں یا کہیں دور نکل جائیں۔ اس پر تمام لوگ یک زبان ہو کر بولے کہ ہم آپ کے ساتھ شہید ہونے کے لیے آئے ہیں۔

صحابی رسول حضرت مسلم بن عوسجہؓ بولے: ''اگر میرے پاس ہتھیار نہ رہے تو پتھر برساؤں گا۔'' پانی بند ہونے سے قافلۂ حسینؓ پر جو قیامت طاری تھی اُس نے حُر کو ایک کرب میں مبتلا کر دیا تھا۔ اُس نے عمر بن سعد سے پوچھا: ''کیا تم نے جنگ کا حتمی ارادہ کر لیا ہے؟'' اُس نے کہا: ''ہاں ایسی جنگ جس میں جسموں کے پرخچے اُڑیں گے۔'' حُر نے کہا: ''مصالحت کی کوئی صورت ممکن نہیں؟'' عمر بن سعد نے کہا: ''میرے بس میں نہیں کیونکہ ابن زیاد نہیں مانتا۔''

حُر ظلم کے آئندہ تصور سے کانپنے لگا۔ اُس کا ساتھی بولا: ''حُر تمہیں کیا ہوا؟ تم تو عرب کے مایہ ناز بہادر سمجھے جاتے ہو۔'' حُر بولا: ''تم اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلاؤ گے؟'' یہ کہہ کر حُر نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور صلح کے نشان کے طور پر اُلٹی ڈھال پکڑ کر امام حسینؓ کے قدموں میں پہنچ کر جھک گیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ امام حسینؓ نے اُسے گلے سے لگا کر بخشش کی دعا دی۔

دسویں محرم کی شب عاشور گزرنے کے بعد اب دن چڑھ گیا تھا۔ بی بی زینبؓ کو تاریک رات میں خیر کی کوئی کرن نظر نہیں آئی تھی۔ کیونکہ گزشتہ رات عمر بن سعد اور حضرت امام حسینؓ کے مابین گفت وشنید قطعاً بے نتیجہ رہی۔ امام حسینؓ عالی مقام ہرگز جنگ کا آغاز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہرحال فوجیں آمنے سامنے صف باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔ 72 افراد کے سامنے ہزاروں کا لشکر تھا۔ پھر بھی حضرت امام حسینؓ نے اتمام حجت کے لیے امن کی علامت اونٹنی پر بیٹھ کر دشمن کو تلقین کی اور فرمایا: ''تم جنگ پر کیوں آمادہ ہو؟ کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے یا کوئی جرم میری گردن پر ہے؟ کیا میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نواسا نہیں۔'' اس بات کا دشمن کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

اب یزیدی فوج کی طرف سے بلا تاخیر جنگ شروع کرنے کے لیے پہلا تیر عمر بن سعد نے پھینکا۔ چنانچہ ظہر کے وقت تک تابڑ توڑ حملوں میں قافلۂ حسینؓ کے کافی گھڑسوار شہید ہو گئے۔ پھر دست بدست جنگ شروع ہوئی جو قابل تحسین جوانمردی کا مظہر تھی۔ آخر میں باری باری بنو ہاشم کے جوان کام آئے۔ امام حسینؓ کے جواں سال فرزند علی اکبر اور آخر میں فوج کے علمبردار حضرت عباسؓ کی شہادت نے امام حسینؓ کی کمر توڑ دی۔

جب امام حسینؓ تنہا رہ گئے تو اپنے بیمار بیٹے سے الوداع ہونے خیمے میں تشریف لے گئے۔ اس وقت تک آپؓ تیروں سے چھلنی ہو چکے تھے اور کئی دن کے پیاسے تھے۔ بعد ازاں دلیری سے لڑتے ہوئے گھوڑے سے گر کر زمین پر سجدہ ریز ہو گئے۔ شمر ملعون نے سجدے میں سر کاٹ کر نیزے پر بلند کر دیا اور دنیائے اسلام کی انوکھی جنگ اپنے اختتام کو پہنچی جس

ایک شیر خوار حضرت علی اصغرؑ کی قربانی امام حسینؑ نے اپنی شہادت سے پیش کی۔

جنگ کے اختتام پر خیموں میں لوٹ مار کر کے آگ لگا دی گئی۔ بی بی زینبؑ جلتے خیمے سے حضرت امام زین العابدینؑ کو کندھے پر اُٹھا کر باہر لائیں۔ اگلے روز خانوادہ اہل بیت اطہار اور دیگر شہدا کے اہل خانہ کو کوفے روانہ کر دیا گیا۔ سیدہ زینبؑ اس مظلوم اور بدحال قافلے کی سالار بن گئیں۔ اکثر لوگوں کو بازاروں سے گزرتے ہوئے معلوم ہی نہ تھا کہ مدینے کے یہ مظلوم قیدی آل رسولؐ سے ہیں۔ اُس وقت بازار میں بی بی زینب نے اپنے والد کے لہجے میں کوفے والوں سے خطاب کیا۔ دارالامارہ پہنچ کر اُن کا کلیجہ پھٹنے لگا جب اُنھیں اپنے والد کا زمانۂ خلافت یاد آیا۔ یہاں پر ابن زیاد نے اپنی شان دکھانے کے لیے لفاظی سے کام لینے کی کوشش کی تو سیدہ زینبؑ نے مسکت جواب دے کر اُسے خاموش کر دیا۔ آپؑ کو اس وقت تک قید رکھا گیا جب تک دمشق سے طلبی کا پروانہ نہیں پہنچ گیا۔

یہ مظلوم اور خستہ حال قافلہ مختلف منازل طے کرتا ہوا ربیع الاوّل کے اوائل میں دمشق پہنچا۔ عوام الناس اس بات سے بے خبر تھے کہ قیدیوں کا تعلق آل رسولؐ اور اُن کے اقربا سے ہے۔ صبح سے شام تک انتظار کے بعد قیدیوں کو دربار میں لے جایا گیا۔ غیر ملکی سفیروں نے استفسار کیا کہ یہ کون لوگ ہیں تو بتایا گیا باغی ہیں۔ بی بی زینبؑ نے انتہائی عالمانہ انداز میں خطاب کرتے ہوئے یزید کو یاد دلایا کہ وہ مکہ فتح ہونے کے بعد جو افراد غلام بن گئے تھے وہ اُن کی اولاد ہے اور اُس کی حکومت عارضی اور غاصبانہ ہے۔ نیز اُس کی مستورات پردے میں ہیں اور جبکہ سید زادیاں دربار میں بغیر چادر کے ہیں۔ وہ اس خونِ ناحق کا دھبہ اپنے دامن سے قیامت تک نہیں دھو سکتا۔

بی بی زینبؑ نے فرمایا: ''اللہ کا شکر ہے جس نے ہمارے پہلے اور آخری بزرگوں کو شہادت سے بلندی عطا کی۔ جب بی بی زینبؑ کا خطاب مکمل ہوا تو یزید لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ اُس کے بعد اُنھیں قید کر دیا گیا۔

آل رسولؐ خاصے عرصے تک ایک ایسے قید خانے کی سختیاں برداشت کرتے رہے جس پر چھت نہیں تھی۔ اسی دوران امام حسینؑ کی لاڈلی بیٹی سکینہ، اپنے والد کے سینے پر سوتی تھی، انتقال کر گئیں اور وہیں دفن ہوئیں۔ کوفہ میں خانے سے رہائی کے بعد بشیر انصاری سابق گورنر کوفہ کے ہمراہ خانوادہ اہل بیت مدینہ بھجوایا گیا۔ راستے میں جب یہ قافلہ کربلا میں رُکا تو وہاں صحابی رسولؐ جناب جابر بن عبداللہ انصاریؓ بھی آئے ہوئے تھے۔ تمام لوگ سانحہ کربلا کو یاد کر کے دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ مدینہ پہنچ کر کچھ توقف کرنے کے لیے شہر سے باہر ٹھہر گئے اور بشیر انصاری نے جا کر آمد کی اطلاع دی تو لوگ چیخیں مارتے ہوئے استقبال کے لیے آ گئے۔

مدینہ پہنچ کر سیدہ زینبؑ روضۂ رسولؐ پر تشریف لے گئیں اور رو رو کر بین کرتی رہیں۔ آخر اپنے گھر تشریف لائیں لیکن محلہ بنی ہاشم کی ویرانی دیکھ کر اُن کا دل بیٹھ گیا۔ ان کی حالت اب بہت دگرگوں ہو چکی تھی۔ اکثر لوگ حتیٰ کہ عبداللہ بن جعفر بھی اُن کو پہچان نہ پاتے تھے۔ اُن کے واپس آنے سے اہل مدینہ میں انتشار اور بے چینی پیدا ہونے لگی۔ اس پر یزید نے انھیں مدینے چھوڑنے کا حکم دیا لیکن انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر یزید نے فوجوں کو مدینے پر چڑھائی کا حکم دیا۔ حضرت امام زین العابدینؑ اپنے اہل خانہ کو لے کر مدینے سے باہر زرعی علاقے میں لے گئے۔ شاہی فوجوں نے مدینے کو تہس نہس کر دیا۔ یزید کے مرنے پر اُس کے بیٹے معاویہ بن یزید کو تخت پر بٹھایا گیا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس تخت سے خون حسینؑ کی بُو آتی ہے۔ عبدالملک بن مروان نے بی بی زینبؑ کو مدینے سے دمشق آنے کا حکم دیا تو آپؑ کے

حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ سے حب رسول ﷺ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالیٰ نے مجھے حضرت فاطمہؓ کا حضرت علیؓ سے نکاح کرنے کا حکم دیا۔(المعجم الکبیر للطبرانی،10:156، ح:10305)

یہ شادی امر الٰہی سے سرانجام پائی اس لیے کہ حضرت علیؓ سے ولایت مصطفی کے سلسلے کو قائم ہونا تھا اور حضرت علیؓ کو تکمیل دعائے ابراہیمؑ کا ذریعہ بنانا تھا۔ اسی مقصد کے لیے تاجدار کائنات ﷺ سے ان کی حضرت فاطمہؓ کے ذریعہ ایک اور مضبوط اور پاکیزہ نسبت بھی قائم ہوئی۔ قدرت نے ان دو منتخبہ شخصیات کے نور نظر سیدنا امام حسینؓ کی قسمت میں ذبح عظیم کا منصب جلیلہ لکھ دیا تھا۔

حضرت فاطمۃ الزہراؓ خاتون جنت ہیں۔ یہ حضور ﷺ کی وہی لاڈلی بیٹی ہیں جن سے تاجدار کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ میری فاطمہ کیا تُو اس بات پر راضی ہے کہ ساری کائنات کے مومنوں کی عورتوں کی تُو سردار ہو۔(صحیح بخاری، صحیح مسلم)

حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (میری بیٹی) فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے پس جس نے اسے ناراض کیا بے شک اس نے مجھے ناراض کیا۔(صحیح البخاری،2:532)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو (اچانک) پردوں کے پیچھے سے کوئی منادی اعلان کرے گا کہ اے اہل محشر! اپنی نگاہیں جھکا لو فاطمہ بنت محمد ﷺ سے (وہ آرہی ہیں) حتی کہ وہ گزر جائیں گی۔(المستدرک للحاکم،3:153)

حضرت جمیع بن عمیر التیمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اپنی پھوپھی کے ساتھ مل کر حضرت عائشہ صدیقہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں نے پوچھا لوگوں میں سے کون سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کو محبوب تھا؟ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جواب دیا حضرت فاطمہ، دوبارہ پوچھا گیا کہ مردوں میں سے کون سب سے بڑھ کر محبوب تھے؟ فرمایا فاطمہ کا شوہر (علی رضی اللہ عنہ) اور پھر فرمایا کہ میں خوب جانتی ہوں کہ وہ بڑے روزہ رکھنے والے اور تہجد پڑھنے والے تھے۔(جامع الترمذی،2:227، المستدرک،3:155)

شوہر ان کو ساتھ لے کر شام چلے گئے۔ یہ اُن کا آخری سفر تھا۔ روایات کے مطابق ایک شامی نے وہاں انھیں بیلچہ مار کر شہید کر دیا۔

تاریخ میں کوئی سانحہ اتنے لامتناہی عرصے تک لوگوں کے دل میں زندہ نہیں۔

صدیاں گزر چکیں لیکن یہ غم اُسی طرح تازہ ہے۔ ہر کلمہ گو انسان جس کے دل میں اپنے رسولؐ کی آل سے انسیت اور محبت کی ذرا سی رمق بھی باقی ہے وہ فی المقدور اپنی سعی سے اس جوت کو جگانے کا اہتمام کرتا ہے۔ یہ سیدہ زینبؓ کی ذات برکات تھی جس نے اپنی ہمت اور قوت ایمانی کی بدولت مظلوم شہید کربلا کے خون کا بدلہ لینے کے لیے لوگوں کے ضمیر کو بیدار کیا اور اُن کے ذکر کو قیامت تک کے لیے دوام بخشا۔ ◇◇

بلریاگنج سے جنت البقیع تک

عرفان صدیقی

حافظ شیرازی نے کہا تھا۔

حسن ز بصرہ، بلال از حبش، صہیب از روم
زخاکِ مکّہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست

”کیا عجوبہ ہے کہ بصرہ کی خاک سے خواجہ حسن بصریؒ، حبشہ کی سرزمین سے حضرت بلال حبشیؓ اور روم کی مٹی سے حضرت صہیب رومیؓ جیسی جلیل القدر ہستیاں جنم لیتی ہیں، لیکن مکہ کی خاکِ اقدس سے پیوند رکھنے والا ابوجہل عمر بھر محرومی و نامرادی کی چتا میں جلتا اور آخری سانس تک ابوجہل ہی رہتا ہے۔“

اس معمے کی گرہ شاید کبھی نہ کھل سکے کہ کم نصیبی اور عطا کے فیصلے کرنے والے ربِ ذوالجلال کے پیشِ نظر کیا ہوتا ہے؟ وہ کیونکر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کس کو کہاں، کس کے ہاں، کس نام ونسب کے ساتھ کس گھرانے اور کون سی سرزمین میں پیدا ہونا ہے؟ کس کی زندگی کے کون سے مرحلے میں ایسا موڑ لانا ہے کہ وہ بے یقینی، تذبذب، انتشار اور بے کلی کے آشوب سے نکل کر ایمان، یقین اور استقلال کے اس مستقیم راستے پہ آ نکلے جو بلندیوں، رفعتوں، برکتوں اور سعادتوں کی نئی روشن منزلوں کی طرف جاتا ہے۔ محرومیوں اور عنایتوں کی اس پُراسرار دنیا کے بھید صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ ان بھیدوں کو پانا انسان کے بس میں نہیں، لیکن دلوں کو گرمانے اور نرمانے والی یہ جادو بھری کہانیاں اپنے اندر غور و فکر کا بڑا سامان رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں سے جذبۂ واحساس کی نئی سوغات سمیٹنے اور اپنے اندر تبدیلی کی لہر محسوس کرنے والے بھی یقیناً بہت خوش بخت ہوتے ہیں۔

کوئی ایک ماہ قبل جب عین سر پہ کھڑا سورج مغرب کی

ایک نومسلم کی طلسماتی داستان جو ڈاکٹر ضیاءالرحمٰن اعظمی کے نام سے اِس صدی کا سب سے بڑا محدث بنا

پیش لفظ

''کون کہہ سکتا تھا کہ بلرپا گنج بھارت کے آسودہ حال، کٹر ہندو گھرانے میں پیدا ہونے والا، پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی، بانکے رام، ایک دن ضیاء الرحمٰن اعظمی کے نام سے جامعہ مدینہ منورہ میں شعبۂ حدیث کا سربراہ بنے گا۔ چودہ سو سالوں پہ بکھرا ا۔ حادیثِ نبوی ﷺ کا عظیم ترین خزانہ جمع کر کے اس صدی کا سب سے بڑا محدث کہلائے گا۔ برسوں مسجد نبوی ﷺ میں درسِ حدیث دے گا اور ایک دن مدینہ منورہ کی خاک اوڑھ کر جنت البقیع کی کہکشاں کا حصہ بن جائے گا۔''

اندھیروں سے اُجالوں تک سفر کرتی طلسم ہوشربا جیسی دلچسپ داستان عرفان صدیقی کے کرشمہ ساز قلم سے قارئین کے لیے پیش کی جارہی ہے۔

ایمان افروز تاریخ اور ایسی ہستیوں کا ذکر یقیناً دلوں کو منور کرنے اور ایمان کو تازہ کرنے کے لیے بہترین کاوش ہے۔ اُمید ہے مصنف اور ادارے کی یہ پیشکش پڑھنے والوں کی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے معاون ثابت ہوگی۔ (ادارہ)

طرف جھک رہا تھا اور مدینۃ المنورہ کی مسجدِ نبویؐ میں ظہر کی اذان ہو رہی تھی تو مسجد کی حدود سے ذرا دُور، اللہ پر ایمان رکھنے والا اور حضور ﷺ کی محبت سے سرشار، علم و دانش کا ایک سورج غروب ہو رہا تھا۔ حجاج کے مختصر سے قافلے میدانِ عرفات میں حاضر تھے جس کی فضا دعاؤں سے معمور تھی کہ ایک عمر دینِ حق کے لیے وقف کر دینے والا ضیاء الرحمٰن اعظمی جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ بے شک ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور ہمیں اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ازل سے ابد تک ہر کہانی اسی باب پر آ کر ختم ہوتی ہے۔ سو بلرپا گنج سے مدینۃ النبیؐ تک پھیلی مشک بو کہانی بھی تمام ہوگئی، مگر میں سوچتا ہوں کہ بلرپا گنج کے ''بانکے لال'' کی کہانی تو برسوں پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ ضیاء الرحمٰن اعظمی کی داستان کیسے ختم ہوگی؟ یہ تو باب در باب چلتی رہے گی۔ مردانِ کار چلے جاتے ہیں، لیکن اُن کے کام بڑی طویل عمریں پاتے ہیں۔ جتنا بڑا کام، اتنی ہی لمبی زندگی۔ چودہ سو سالوں میں حدیثِ مبارکہ پر سب سے جامع اور مفصل کام کرنے والا ضیاء الرحمٰن اعظمی کم و بیش چودہ صدیاں تو زندہ رہے گا۔

بلالؓ اور صہیبؓ نے براہِ راست حضور پاک ﷺ کے ہاتھوں قبولیتِ اسلام کا شرف حاصل کیا۔ نبی کریمؐ کا عہد دیکھا۔ ہر نشیب و فراز میں نبیؐ کی رفاقت کا اعزاز حاصل کیا۔ کفار کے ظلم و ستم اُن کے ایمان کے قلعے میں شگاف نہ ڈال سکے۔ حضرت بلالؓ عمر بھر حضورؐ کی خدمت و رفاقت کی سعادتیں سمیٹتے رہے۔ اسلام کے پہلے باضابطہ موذن کی مسند پر سرفراز ہوئے۔ حضرت صہیبؓ کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا ''صہیبؓ روم کا پہلا پھل ہے۔'' بصرہ کے حسنؒ کو حضورؐ کا عہد نہ ملا۔ ان کی تو پیدائش بھی رسولِ اکرمؐ کی وفات کے کوئی گیارہ برس بعد ہوئی، لیکن مورخ بتاتے ہیں کہ اُنھوں نے کم و بیش ایک سو بیس صحابہ کرامؓ کو دیکھا اور اُن کے قرب کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے گھٹی ڈالتے ہوئے نام بھی تجویز کیا اور دُعا دی: ''اے اللہ! اسے علم دین کا ماہر بنا۔ اسے لوگوں میں محبوب بنا۔'' عمر فاروقؓ کی دعا پوری ہوئی۔ بارہ سال کی عمر میں قرآنِ کریم حفظ کر لیا۔ تفسیر اور حدیث کے امام ٹھہرے۔ گریہ وزاری، عبادت گزاری، خلوت نشینی اور صوفیانہ طبیعت، تصوف کی طرف لے گئی۔ شیخ الشیوخ، خواجۂ خواجگاں، امام المحدثین اور امام الاولیاء کہلائے۔

ضیاء الرحمٰن اعظمی صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے مجھے درجنوں نام یاد آرہے ہیں جنہوں نے غیر مسلم گھرانوں میں آنکھ کھولی اور پھر اسلام کی دولت سے مالا مال ہو کر ''کسبِ کمال'' کے حوالے سے نام بھی پیدا کیا، لیکن میں ان میں صرف چار ہستیوں کا اجمالی سا ذکر کرنا چاہتا ہوں جن کا عرب دنیا سے تعلق نہ تھا۔ چیانوالی (سیالکوٹ) کے بوٹا سنگھ، برطانیہ کے مارما ڈیوک ولیم پکھتال (Marmaduke William Pickthal)، پولینڈ کے لیوپولڈ ویز (Leopold Weiss) اور نیویارک (امریکہ) کی مارگریٹ مارکوس (Margret Marcus) نے اسلام سے کوسوں دور آنکھ کھولی، لیکن اللہ کی بے کراں عنایات نے ان آنکھوں کو بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت بھی عطا فرمائی۔ ان کی زندگیاں رفعتِ فکر و عمل کے سانچے میں ڈھل گئیں۔ یہ سب دنیا سے جا چکے ہیں، لیکن سب زندہ ہیں۔

مولانا عبیداللہ سندھی

رام سنگھ سیالکوٹ کی تحصیل پسرور کے ایک گاؤں چیانوالی کا معروف زرگر تھا۔ گھر میں آسودگی تھی۔ رام سنگھ کے ہاں 1872ء میں اس وقت ایک بیٹا پیدا ہوا جب اُسے فوت ہوئے چار ماہ ہو گئے تھے۔ دادا نے پوتے کا نام بوٹا سنگھ رکھا اور اس کی پرورش سنبھال لی۔ دو سال بعد دادا بھی چل بسا۔ ماں، پریم کور تنہا رہ گئی تو بچے کو اٹھایا اور جام پور (ڈیرہ غازی خان) اپنے بھائیوں بڈھا سنگھ اور سدھا سنگھ کے پاس آ گئی جو سرکاری ملازم تھے۔ بوٹا سنگھ بڑا ہوا، تو اُسے جام پور کے سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ وہ ہونہار طالبِ علم نکلا، لیکن اپنے مذہب کے کچھ سطحی پہلوؤں اور رسم و رواج سے اُس کا دل نہ لگا۔ ایک دن اُس نے اپنے ایک ہم جماعت کے پاس عبیداللہ پائلی کی کتاب ''تحفۃ الہند'' دیکھی۔ پڑھنے کو مانگی اور کئی بار پڑھی۔ پھر کہیں سے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' مل گئی، تو اُسے بھی ذوق و شوق سے پڑھ ڈالا۔ مولوی محمد لکھوکیؒ کی کتاب ''احوالِ آخرت'' کو بھی گہری نظر سے دیکھا۔ بوٹا سنگھ کے دل میں کئی دنوں سے ایک زلزلہ سا بپا تھا۔ یہ اگست 1887ء کا ایک دن تھا۔ اس نے ایک دوست عبدالقادر کو ساتھ لیا۔ مظفر گڑھ کے قریبی قصبے کوٹلہ رحم شاہ پہنچا اور ایک عالمِ دین کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ پھر اس پر کیا گزری؟ یہ عشق و جنوں کی ایک وجد آفریں کہانی ہے۔ وہ پناہ کی تلاش میں سندھ کی ایک معروف دینی شخصیت صوفی حافظ محمد صدیقؒ کے پاس پہنچا۔ حافظ صاحب نے اُسے اپنا بیٹا قرار دیتے ہوئے اس کی ذہنی و فکری تعلیم و تربیت کی اور پھر

دنیا بدل گئی۔ دیوبند نے اُسے صیقل کر دیا۔

اُس نے ’تحفۃ الہند‘ کے مصنف کے نام پر اپنا نام عبیداللہ رکھ لیا۔ سندھ کے حافظ محمد صدیق کے فیضان کی قدردانی کرتے ہوئے ’’سندھی‘‘ کو اپنے نام کا حصہ بنا لیا۔ رام سنگھ اور پریم کور کا بوٹا سنگھ ابتدائے عمر میں ہی رزقِ ماضی ہو گیا اور تاریخ مولانا عبیداللہ سندھیؒ کے نامِ نامی سے معتبر ٹھہری۔ ایک مفکر، مبلغ، معلم، مجاہد، آزادیِ ہند کے سپاہی، شاہ ولی اللہؒ کے فکر و فلسفہ کے مفسر اور ’’ریشمی رومال‘‘ تحریک کے مرکزی کردار کے طور پر عبیداللہ سندھیؒ نے ایک نئی زندگی پائی اور اَمر ہو گیا۔

انگلستان میں سفک (Suffolk) کے قریبی گاؤں کے مسیحی خاندان میں 1875ء میں پیدا ہونے والے بچے کا نام مارما ڈیوک ولیم پکھتال (Marmaduke William Pickthal) رکھا گیا۔ والد چارلس پکھتال مقامی گرجا گھر کا پادری تھا۔ ایک معروف پبلک سکول Harrow میں تعلیم کے دوران ونسٹن چرچل سے دوستی ہوئی جو عمر بھر چلی۔ مارما ڈیوک کو مطالعے کا شوق تھا۔ متعدد زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ ناول نویسی سے ہوتا ہوا وہ تحقیق میں مگن ہوا۔ روشنی اس کے در دِل پر دستک دینے لگی۔ اس کے مطالعے، مشاہدے اور مذاہب کے تقابلی جائزے نے اسلام کی حقانیت کا راستہ دکھایا۔ فکر و شعور کی پوری پختگی کے ساتھ اُس نے تقریباً چالیس برس کی عمر میں اسلام قبول کر لیا۔ اب اُس کا نام محمد مارما ڈیوک ولیم پکھتال تھا۔ اسلام قبول کرتے ہی وہ ایک باعمل اور عبادت گزار مسلم کے طور پر سامنے آیا۔ وہ لندن کے ایک اسلامک سنٹر میں جمعہ کا خطبہ دیتا۔ عیدین کی امامت کرتا۔ رمضان میں تراویح پڑھاتا اور مطالعے میں مگن رہتا۔

1924ء میں اُس کی شہرت ہند میں پہنچی تو نظام حیدرآباد کی خواہش پر ناظم تعلیمات سر راس مسعود نے اُسے حیدرآباد آنے اور معروف تعلیمی ادارے ’چادر گھاٹ کالج‘ کی سربراہی سنبھالنے کی دعوت دی۔ محمد مارما ڈیوک ولیم پکھتال نے لگ بھگ دس برس یہ فریضہ سرانجام دیا۔ نظام حیدرآباد میر عثمان علی خان کی خواہش پر پکھتال کو قرآنِ کریم کے مستند انگریزی ترجمے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ دو سال کی باتنخواہ چھٹی کے دوران محمد پکھتال نے 1930ء میں یہ کام مکمل کیا جو ’’قرآن عظیم کے معانی‘‘ (Meanings of the Glorious Quran) کے نام سے شائع ہوا۔ پکھتال کے ترجمے کو آج بھی قرآنِ کریم کا سب سے عمدہ انگریزی ترجمہ خیال کیا جاتا ہے۔ 1935 میں وہ واپس وطن چلے گئے۔ ایک سال بعد حرکتِ قلب بند ہونے سے انتقال ہو گیا اور بروک ووڈ کے مسلم قبرستان میں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ اگلے دن اُن کی اہلیہ نے میز پر محمد پکھتال کے قلم سے لکھی ایک قرآنی آیت دیکھی۔ یہ اُن کی آخری تحریر تھی۔ محمد پکھتال نے آیت کے نیچے انگریزی ترجمہ بھی لکھا تھا۔

مارما ڈیوک ولیم پکھتال

’’حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے تو اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے اور ایسے

لوگوں کے لیے خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔"
(البقرہ آیت 112)

آج کے پولینڈ کے ایک کٹر یہودی گھرانے میں 1900ء میں پیدا ہونے والے بچے کا نام اکیوا ویز (Akiva Weiss) رکھا گیا۔ اُکھڑے اُکھڑے مزاج کے بچے کو سکول میں داخل کرایا گیا، لیکن چودہ سال کی عمر میں وہ سکول سے بھاگ کر آسٹریلوی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ وکالت کے پیشے سے منسلک باپ اُسے واپس پکڑ لایا۔ ویانا نقلِ مکانی کے بعد اُس نے ویانا یونیورسٹی سے فلسفے اور آرٹ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ اپنے مذہبی عقائد سے مطمئن نہ تھا۔ ہم مذہبوں سے اُلجھتا رہتا۔ زبانوں سے عشق تھا۔ جرمن، عبرانی، فرانسیسی، انگریزی، عربی اور فارسی پر عبور حاصل کیا۔ صحافت سے منسلک ہوا، تو مشرقِ وسطیٰ، مصر اور شام کی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہوا۔ اسلام کے بارے میں کرید پیدا ہوئی۔ ایک دن اکیوا ویز ٹرین میں سفر کر رہا تھا کہ ایک جگہ اُس کے ایک خستہ حال سے ہم سفر نے کسی پلیٹ فارم سے ایک روٹی خریدی۔ آدھی خود رکھ لی اور آدھی مسکراتے ہوئے ویز کی طرف بڑھا دی۔ ایک ترجمان نے بتایا کہ یہ مسلمان ہے۔ یہ اُن کے دین کی تعلیم ہے۔ ٹرین ہی کے سفر میں اُس نے بڑے قیمتی زیورات پہنے ایک خاتون اور اُس کے شوہر کو دیکھا جو خاصے امیر اور آسودہ حال تھے، لیکن اُن کے چہرے نامطمئن تھے۔ ویز کی بیوی بھی اُس کے ہمراہ تھی۔ وہ پہلے سے قرآن کا مطالعہ شروع کر چکا تھا، گھر آ کر قرآن کھولا، تو سورہ التکاثر کی آیات سامنے آئیں:

"تمھیں زیادہ سے زیادہ دنیا سمیٹنے کی دُھن نے غفلت میں ڈال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں جا دیکھیں۔ ہرگز نہیں، جلد تمھیں معلوم ہو جائے گا۔ پھر سن لو ہرگز نہیں۔ اگر تمھیں یقینی علم کی حیثیت سے علم ہے کہ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر سن لو۔ بالکل یقین کے ساتھ اُسے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اِس روز تم سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔"

اکیوا ویز اَب 26 سال کا ہوش مند اور وسیع مشاہدہ و مطالعہ کرنے والا صاحبِ فہم و شعور جوان تھا۔ اگلے دن وہ برلن کے اسلامک سینٹر میں عبدالجبار خیری کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کر لیا۔ خیری صاحب نے کہا LEO یونانی زبان میں شیر کو کہتے ہیں، اِس لیے آج سے تمہارا نام محمد اسد ہے۔

ڈاکٹر محمد اسد کی زندگی ایک حیرت کدہ ہے۔ سعودی

عرب کے قیام کے دوران شاہ عبدالعزیز السعود سے رفاقت کا رشتہ قائم ہوا۔ 1932ء میں علامہ اقبال سے ملاقات ہوئی اور اُن کی مشاورت سے کئی اُمور سرانجام دیے۔ 14/اگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آیا، تو ڈاکٹر محمد اسد پہلے غیر ملکی تھے جنھیں پاکستانی شہریت ملی۔ پاکستان کا پہلا پاسپورٹ اُن کے نام جاری ہوا۔ پاکستان کی وزارتِ خارجہ میں اہم عہدوں پر فائز رہے۔ سترہ سال کی محنتِ شاقہ سے قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا اور حواشی لکھے۔ "قرآن کا پیغام" (The

(Message of Quran) کے نام سے ہونے والے اِس ترجمے کو کم و بیش پکتھال کے ترجمے کے ہم پلہ قرار دِیا جاتا ہے۔ بخاری شریف کے کچھ ابواب کا بھی نہایت خوبصورت انگریزی ترجمہ کیا۔ ان کی متعدد دیگر تصانیف میں سے اُن کی خودنوشت ''روڈ ٹو مکہ'' کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔

آخر عمر نیو یارک چھوڑ کر سپین جا بسے۔ فروری 1992ء میں تقریباً 93 سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ غرناطہ کی مٹی نے اُنھیں اپنی آغوش میں لے لیا۔ سید مودودی نے کہا تھا ''میرے خیال میں یورپ سے ہمیں دورِ جدید کے جو غنائم (مالِ غنیمت: قیمتی مال) ملے ہیں، ان میں سب سے قیمتی ہیرا ڈاکٹر محمد اسد ہے۔''

23 مئی 1934 کو نیو یارک کے ایک پختہ کار یہودی گھرانے میں پیدا ہونے والی مارگریٹ مارکس عجب بے چین دل و دماغ لے کر آئی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اُسے اپنے گرد و پیش سب کچھ اجنبی سا لگا۔ سکول کی تعلیم کے دوران ہی عرب موسیقی سے دلچسپی ہوگئی، تو ایک دن شامی سفارت خانے سے ڈھیر ساری کیسٹس لے آئی۔ اُن میں اُمِ کلثوم (جو بعد میں مصر کی نامور گلوکارہ بنیں) کی خوبصورت آواز میں سورۃ مریم کی تلاوت بھی تھی۔ مارگریٹ اُسے پہروں سنتی رہتی جس میں کوئی ساز نہ تھا، لیکن کوئی ایسا اعجاز ضرور تھا کہ دل آسودگی پاتا تھا۔ اُسے اسلام سے دلچسپی ہوئی، تو پکتھال کے ترجمۂ قرآن نے ذہن و قلب میں اجالے بو دیے۔ اس کا گرد و پیش اب کچوکے لگانے لگا۔ وہ شدید بیمار پڑ گئی۔ دو سال ذہنی امراض کے ہسپتال میں رہی۔ طویل بیماری سے سنبھلی، تو اُس نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کا مطالعہ کیا۔ سیرت النبیؐ کی کتب پڑھیں۔ علامہ اقبال کی شاعری سے دل لگایا۔ امام غزالیؒ کی ''احیاء العلوم''، ''مقدمہ ابنِ خلدون'' پڑھ ڈالے۔ ڈاکٹر محمد اسد کی ''روڈ ٹو مکہ'' پڑھی۔ پھر مختلف جرائد میں اسلامی تعلیمات کے حوالے سے مضامین لکھنے لگی۔ مئی 1961ء کے لگ بھگ (27 سال کی عمر میں) مارگریٹ نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا نیا نام مریم جمیلہ رکھا گیا۔ دنیا کے مسلم اہلِ علم و دانش سے رابطہ کیا۔ مولانا مودودی کی کتب دیکھ چکی تھی۔ ایک خط اُنھیں بھی لکھا۔ پھر کئی خطوط کا تبادلہ ہوا۔ یہ خطوط کتابی شکل میں شائع ہو چکے۔ ایک خط میں سید مودودیؒ نے لکھا:

''آپ کی ذہنی پریشانیوں اور صدمات کی سرگزشت میرے لیے کوئی غیر متوقع بات نہیں۔ اگر کوئی فرد اپنے اردگرد کے معاشرتی ماحول سے مسلسل ٹکراتا ہوا گزر رہا ہو اور اُسے کہیں معمولی سی ہمدردی اور حوصلہ افزائی میسر نہ آئے، تو ایسے حالات میں اس آدمی کے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اعصاب کا برقرار رہنا غیر معمولی اور غیر فطری بات ہوگی۔ آپ کے رجحانات، آپ کا ذوق، آپ کے نظریات و تصورات اور آپ کی عادات و اطوار ساری چیزیں آپ کی سوسائٹی سے متصادم ہیں.....

''اگر آپ پاکستان آ جائیں، تو یہاں اپنے آپ کو بہت سے ہم خیال لوگوں میں محسوس کریں گی ..... آپ کی بھلائی اور فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ آپ پاکستان میں مستقل سکونت اختیار کر لیں۔ آپ اپنے والدین کو یہ بتا دیں کہ جس شخص نے آپ کو یہ نازک قدم اُٹھانے کا مشورہ دیا ہے، اُس نے صرف یہ رائے دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ وہ مستقبل کی تمام تر ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برا ہونے کے لیے تیار ہے۔ اگر آپ اور آپ کے والدین مجھ پر اعتماد کریں، تو ان شاء اللہ آپ کے اس اعتماد کو دھچکا نہیں لگے گا۔''

مریم جمیلہ نے اپنے والدین سے اجازت لے کر مولانا مودودی کو لکھا:

''یہ اللہ کا کرم ہے کہ آپ میری دستگیری فرما رہے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے اب میں تنہا جد و جہد کرنے پر مجبور نہیں ہوں۔ میں آپ کی پیشکش قبول کرتی ہوں اور نہ دل سے آپ کی شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔''

جمیلہ یونان سے ایک مال بردار جہاز پر بیٹھی اور ڈیڑھ ماہ بعد لاہور مولانا کے ہاں پہنچی۔ مولانا نے مریم جمیلہ کو اپنی بیٹیوں میں شامل کرلیا جو اس کی ہم عمر تھیں۔ جماعتِ اسلامی کے ایک مخلص کارکن محمد یوسف خان سے شادی کرادی۔ مریم نے طویل عمر پائی۔ 31/اکتوبر 2012ء کو لاہور میں انتقال ہوا۔ لاہور ہی میں سپردِ خاک ہوگئیں۔

مریم جمیلہ نے دو درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ یہ انگریزی زبان میں فہمِ اسلام کا خاصا وقیع سرمایہ ہے۔ 1962ء سے 1989ء تک کے دور پر مشتمل اپنی یادداشتیں بھی لکھیں۔ A House in Pakistan: The Tale of an American Expatriate in Her Adopted Country (پاکستان میں گھر: ایک امریکی تارکِ وطن کی داستان، اس کے اختیاری ملک میں)

❁

مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ میں بلریا گنج کے بانکے رام اور مدینہ منورہ کی مسجدِ نبویؐ کے صحن سے ملحق، جنت البقیع میں آسودہ خاک ضیاء الرحمن اعظمی سے بہت دور نکل گیا ہوں۔ یہ تو رنگا رنگ پھولوں کا ایک چمنستان ہے جو حدِ نظر تک پھیلا ہوا ہے۔ کس کس کا ذکر کیا جائے؟ اللہ نے توفیق دی، تو خوشبو کا یہ سفر جاری رہے گا۔ ظلمات سے نور کی طرف آنے والے تو حد و شمار سے باہر ہیں، لیکن ایسے چند ہی ہیں جنھوں نے ذاتی تحقیق و جستجو کے بعد شعوری طور پر ایک فیصلہ کیا اور پھر صرف عقائد و عبادات تک محدود رہتے ہوئے عام مسلمانوں کی بھیڑ میں گم نہیں ہوگئے بلکہ جس طرح اسلام نے انھیں مالا مال کیا تھا، اسی طرح انھوں نے بھی بے پناہ ریاضت و کاوش سے اسلام کے سرمایۂ علم و دانش کو مالا مال کردیا۔ اگر میں یہ کہوں کہ میری دانست میں بیسویں صدی کے نومسلموں کی صف میں ضیاء الرحمن اعظمی کا کارنامہ سب سے زیادہ وقیع اور بھاری ہے، تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ اسلام کے حلقے میں داخل ہونے والی بعض دوسری شخصیات کا گام کمتر درجے کا ہے۔ یقیناً اُن کی اہمیت اور افادیت مسلّمہ ہے، لیکن چودہ سو سال کے طویل عرصے پر محیط، ساری دستیاب کتب احادیث یا مخطوطوں کا عمیق مطالعہ کرنے کے بعد سولہ ہزار کے لگ بھگ احادیثِ مبارکہ کی کسی ایک کتاب میں تدوین بظاہر ایک ناقابلِ یقین سا کام لگتا ہے جو ایک فرد کے جنوں نے ممکن کر دکھایا۔

اعظمی صاحب کے علمی کام کا تذکرہ کرنے سے قبل نہایت اختصار سے ان احوال و کوائف کا خلاصہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو بلریا گنج کے بیٹے، بانکے رام کو درپیش آئے۔ کٹر ہندو گھرانے کا واحد فرزند، پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوتے ہوئے اُسے سارے گھر کا بے پناہ پیار بھی ملا اور بھرپور توجہ بھی، لیکن اس کے دل و دماغ میں سوالات کلبلاتے رہتے تھے۔ شبلی کالج اعظم گڑھ سے میٹرک کا امتحان دے کر وہ بلریا گنج واپس آگیا، تو اُس کی جستجو اور طلب سے شناسا سوچ کسی نئی راہ کی تلاش میں تھی۔ اپنے کالج کے ایک لیکچرار سے جو سنسکرت پڑھاتے تھے، گیتا اور ویدوں کے بڑے عالم تھے، بانکے رام نے خاصی کریدکر لی تھی، لیکن اُس کے دل میں اطمینان و یکسوئی کا غنچہ نہیں پھوٹا تھا۔ 1959ء میں بانکے رام امتحان دے کر اپنے گاؤں آیا، تو ایک دن ماسٹر جنید اُسے علاقے کی نہایت معروف اور صاحبِ علم شخصیت حکیم محمد ایوب کے ہاں لے گئے۔ حکیم صاحب مولانا مودودیؒ کی فکر سے متاثر تھے اور باقاعدہ تحریکِ اسلامی کا حصہ بن چکے تھے۔ بانکے رام بھی ان سے شناسا تھا۔ اس کی خواہش پر مولانا مودودی کی چھوٹی سی کتاب ''دینِ حق'' کا ہندی ترجمہ ''ستیہ دھرم'' پڑھنے کو دیا۔ اُس نے کئی اور کتب تک رسائی حاصل کی۔ یہ 1960ء کی ایک صبح خوش جمال تھی جب بانکے رام نے اسلام قبول کرلیا۔ اُس کا پہلا نام امام الدین تجویز ہوا۔ گھر والوں کو خبر ہوئی، تو ایک قیامت بپا ہوگئی۔ دباؤ اور

جذباتیت کے تمام حربے ناکام ہوگئے۔ والدہ اور پانچ بہنوں کا رونا دھونا بھی امام دین کو متاثر نہ کرسکا۔ کوئی حربہ کارگر نہ ہوا، تو آریہ سماج کے اوباشوں کو اُس کے پیچھے لگا دیا گیا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا کہ امام دین اپنے گھر سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے ہمدرد و غم گسار بھی کم نہ تھے۔ بہ صد مشکل وہ رام پور کی مشہور درس گاہِ اسلامی پہنچا۔ وہاں سے بدایوں کے ایک چھوٹے سے قصبے کے اسلامی مدرسہ سے ہوتا ہوا عمر آباد کی جامعہ دارالسلام پہنچا۔ دارالسلام میں اُس کا نام امام دین سے بدل کر ضیاء الرحمٰن رکھ دیا گیا۔ اب اُسے گھر سے نکلے پانچ برس ہو چکے تھے۔ عمر آباد ہی کے قیام کے دوران اساتذہ کی اجازت سے وہ اپنے گھر والوں سے ملنے بلریا گنج پہنچا، تو سب سے پہلے اپنے محسن حکیم محمد ایوب صاحب کے ہاں قیام کیا جن کا گھر پڑوس کی گلی میں تھا۔ اگلے دن ضیاء الرحمٰن گھر پہنچا، تو آدھا بلریا گنج جمع ہوگیا۔ اب گھر والوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ضیاء الرحمٰن بہت دُور جا چکا ہے اور اس کی واپسی محال ہے۔ کچھ دنوں بعد رمضان شروع ہوا، تو مسجد میں تراویح کی نماز ضیاء الرحمٰن پڑھانے لگے۔ ان کے گھر والوں سمیت بڑی تعداد میں ہندو بھی جمع ہو جاتے اور مسجد کے باہر بیٹھ کر ضیاء الرحمٰن کی خوبصورت قرآت سنتے۔ عید کی نماز بھی ضیاء الرحمٰن نے پڑھائی اور خطبہ بھی دیا۔ رمضان کے بعد عمر آباد آکر تعلیم مکمل کی۔

1966ء میں مدینہ منورہ کی معطر ہوا کا کوئی جھونکا ادھر سے گزرا اور ضیاء الرحمٰن کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اُس نے جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے گریجوایشن کی، ایم اے کے لیے جامعۃ الملک عبدالعزیز (اُم القریٰ) مکہ معظمہ میں داخلہ لیا جہاں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت حدیث پر انتہائی معتبر علمی مقالہ لکھا۔ ایم اے کے بعد عالم اسلام کی معروف درس گاہ جامعہ الازہر قاہرہ، مصر پہنچا اور پی ایچ ڈی کا شاندار مقالہ رقم کیا۔ بارگاہِ رسالتؐ کے فیصلوں پر مبنی یہ مقالہ ''قضیۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے کئی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔

یہ پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ میں برادرِ عزیز محترم عبدالمالک مجاہد کے ہمراہ مسجد نبویؐ کے ایک قریبی محلے میں واقع اعظمی صاحب کے گھر اُنھیں ملنے گیا۔ ان کی نشست گاہ کسی عمدہ اور نفیس لائبریری کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ میں اپنے سامنے بیٹھے شخص کے چہرے کو دیکھتا اور شکن در شکن اُس کی کتابِ زیست کے اوراق پڑھتا رہا۔ تب اُنھیں احادیث مبارکہ کی تدوین کے شاندار منصوبے کو شروع کیے تین سال ہوئے تھے۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس کارِ عظیم کی تکمیل میں تقریباً بارہ چودہ برس اور لگیں گے۔ ان کے مطابق احادیث کی ایک سو سے زائد کتابوں اور مختلف ماخذوں میں تقریباً پندرہ ہزار ایسی احادیث موجود ہیں جنھیں ایک کتابی شکل میں مدون نہیں کیا جا سکا حالانکہ وہ صحت حدیث کے مسلمہ معیار پر سو فی صد پورا اُترتی ہیں۔ میرے متعدد سوالات کے جواب میں اُنھوں نے کمال انکساری سے فرمایا تھا: ''میں اپنے نام کی نمود نہیں چاہتا۔ میرے کام کا تعارف ضرور کرائیں تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور میرے لیے وسیلۂ اجر و ثواب بنے۔''

آج اعظمی صاحب کا ذکرِ جمیل کرتے ہوئے ان کے انتہائی وقیع علمی کام کی لمبی فہرست میرے سامنے ہے جس میں سب سے نمایاں نام ''الجامع الکامل'' کا ہے۔ مستند احادیث کا یہ مجموعہ اعظمی صاحب کی پندرہ سالہ محنت شاقہ کا ثمر ہے۔ اُنھوں نے جو بات مجھ سے 2005ء میں کہی تھی وہ بارہ برس بعد خوبصورت خواب کی جاں فزا تعبیر بن کر سامنے آئی۔ کتاب کی بارہ جلدیں دارالسلام، ریاض نے چھاپیں۔ پھر ان میں اضافہ ہوا۔ کچھ تراجیم ہوئیں۔ ایسی تین ہزار ''احادیث'' کا تعین بھی ہوا جو کڑے معیار پر پورا نہیں اترتیں اور جنھیں اعظمی صاحب نے اپنی دانست اور تحقیق

سے مطابق ضعیف قرار دیا ہے۔ جس دن فون پر اعظمی صاحب نے اپنے کام کی تکمیل کی خبر دی، اُن کے لہجے میں انکسار بھی تھا، عجز بھی، اللہ کے بے پایاں تشکر کی جھلک بھی اور تعبیر خواب کی آسودگی بھی۔ الجامع الکامل اب انیس جلدوں، پندرہ ہزار صفحات، چھ ہزار ابواب اور سولہ ہزار پانچ سو چھیالیس (16,546) احادیثِ مبارکہ پر مشتمل واحد کتاب ہے جو حضور ﷺ کی مستند احادیث کا سب سے عظیم اور جامع مرقع ہے۔

ستمبر 2018ء میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کے نائب مدیر برادرم سلیم منصور حج کے لیے دیارِ حجاز گئے، تو اعظمی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ الجامع الکامل کی اشاعت کا ذکر چلا، تو اعظمی صاحب نے کہا: ''پاکستان میں تو صاحبِ دولت لوگ لاکھوں روپے شادی کے ایک جوڑے پہ اُڑا دیتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اس کام کا بیڑا اُٹھائے۔ میں نے اس کا سارا ابتدائی مرحلہ پورا کرلیا ہے۔ تمام جلدوں کی دورنگی طباعت کی کمپوزنگ ہوچکی ہے۔ میں نہ اس کا کچھ معاوضہ چاہتا ہوں نہ انیس جلدوں کا۔ مجھے کوئی رائلٹی بھی مطلوب نہیں، بس اس کی اچھی طباعت اور اشاعت کا اہتمام ہو جائے۔'' علم شناس سلیم منصور کے دل میں بات بیٹھ گئی۔ اُنھوں نے خرم مراد مرحوم کے صاحب زادے، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی کے ریکٹر ڈاکٹر حسن صہیب مراد سے فون پر بات کی۔ وہ خوش دلی سے آمادہ ہوگئے۔ بلکہ کہا آپ اعظمی صاحب سے ضروری مواد لیں اور 12 ستمبر کو واپس آئیں، تو گھر جانے سے بھی پہلے میرے پاس آئیں۔ حسن صہیب مراد نے اپنے اس عزم کا اظہار 10 ستمبر کی صبح کیا جب سلیم منصور مسجدِ نبویؐ میں نمازِ فجر سے فارغ ہی ہوئے تھے۔ اُنھوں نے یہ مژدہ اعظمی صاحب کو بھی سنایا جو بہت خوش ہوئے۔

حسن صہیب تب ایک سیمینار کے لیے شمالی علاقہ جات میں تھے۔ 10 ستمبر 2018ء کو وہ گلگت سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں اُن کی گاڑی کو ہولناک حادثہ پیش آیا اور وہ جاں بحق ہوگئے۔ اُن کا بیٹا ابراہیم مراد جو گاڑی چلا رہا تھا، شدید زخمی ہوگیا۔ وعدے کے مطابق سلیم منصور خالد لاہور کے ہوائی اڈے سے سیدھے صہیب صاحب کے گھر گئے جہاں اُن کی میت رکھی تھی۔ پانچ بجے شام اُن کی نمازِ جنازہ پڑھ کر گھر جاتے ہوئے منصور خالد کو صہیب مراد کی ناگہانی موت کا گہرا دکھ بھی تھا اور الجامع الکامل کی طباعت کا خواب بکھر جانے کا افسوس بھی۔

30 جولائی 2020ء کو اعظمی صاحب کے انتقال کے بعد میں نے جنگ میں چھپنے والے کالم میں اِس واقعے کا ذکر کیا۔ یہ کالم صہیب مرحوم کے صاحب زادے ابراہیم مراد کی نظر سے گزرا۔ ابراہیم نے سلیم منصور سے رابطہ کیا کہ آئیں، مل بیٹھ کر سوچتے ہیں کہ اس کام کو کیسے آگے بڑھایا جائے۔ مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ خوشی ہی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اعظمی صاحب پاکستان کے ایک صاحب کو الجامع الکامل طبع کرنے کی اجازت دے گئے تھے۔ قدرت کے کیا عجیب رنگ ہیں کہ ان صاحب کا نام بھی صہیب ہے۔ میں نے یہ تحریر قلم بند کرتے ہوئے ''صہیب رومی (کتاب کے طابع اور ناشر) سے رابطہ کیا۔ اُنھوں نے بتایا کہ یہ کام شروع ہوچکا ہے۔ اُن کا طباعتی و اشاعتی ادارہ ''مکتبہ بیت السلام'' (ریاض۔لاہور) انیس جلدوں پر مشتمل جامع الکامل کے تقریباً تین سو نسخے چھاپ چکا ہے۔ مزید کی بھی خاصی مانگ ہے۔

ضیاء الرحمن اعظمی کی تحقیق و تدوین کا کام درجن بھر سے زائد دوسری کتب پر بھی محیط ہے۔ انھیں عربی اور ہندی پر عبور تھا۔ اُن کی بیشتر تصانیف عربی میں ہیں اور کچھ ہندی میں بھی۔ اپنی دو کتب ''دراسات فی الیہودیہ والنصرانیہ'' اور ''فصول فی ادیانِ ہند'' میں اُنھوں نے یہودیت، نصرانیت کے علاوہ ہندوستان کے چار مذاہب ہندومت، بدھ مت، جین مت اور

سکھ مذہب پر نہایت جامع اور چشم کشا مقالات لکھے ہیں۔ احادیث سے متعلق موضوعات و مسائل پر اُن کی کم از کم چار کتب ہیں۔ (الجامع الکامل کے علاوہ) ''التمسک بالسنہ فی العقائد والاحکام'' سنتِ نبویؐ پر مستشرقین کے حوالے سے ایک وقیع کتاب ہے جس کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا۔ القضیۃ الرسولؐ (بارگاہِ نبویؐ کے فیصلے) ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ہندی زبان میں اُنھوں نے قرآن مجید کا ایک انسائیکلو پیڈیا بھی تیار کیا جس کے دس کے لگ بھگ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ہندی زبان میں قرآن کریم کے تقریباً دس تراجم شائع ہو چکے ہیں، لیکن اس انسائیکلو پیڈیا کو قرآنی تعلیمات کا بڑا مستند ماخذ کہا جاسکتا ہے جو زندگی کے تمام معاملات میں انسان کو راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس انسائیکلو پیڈیا کا اُردو ترجمہ بھی ہو چکا۔ اس کا انگریزی ترجمہ، اعظمی صاحب کی زندگی میں ہی لندن میں ہوا اور کیا اتفاق ہے کہ اس کارِ خیر کے نظم کی سعادت جس شخص کو ملی، اس کا نام بھی ڈاکٹر صہیب حسن ہے۔ ''قرآن کی شیتل چھایا'' (قرآن کی ٹھنڈی چھاؤں) پہلی بار 1977ء میں ہندی زبان میں شائع ہوئی۔ اس کے متعدد زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر عجیب سی خوشی ہوئی کہ اعظمی صاحب کی متعدد کتب جنوبی ہند میں عمر آباد کی اسی جامعہ اسلامیہ نے طبع کیں جہاں برسوں قبل بلریا گنج سے پناہ کی تلاش میں نکلا ایک نوجوان پہنچا تھا اور جہاں اُس کا نام امام الدین سے بدل کر ضیاء الرحمٰن رکھا گیا تھا۔

بلریا گنج کی معروف شخصیت حکیم محمد ایوب ظلمات سے نور کے اس سفر میں اعظمی صاحب کے اوّلیں راہبر تھے۔ حکیم صاحب کی آخری سانس تک اعظمی صاحب نے انھیں ایک بزرگ اُستاد کا مقام دیا اور ہمیشہ اپنا سرپرست قرار دیا۔ حکیم صاحب کے نواسے صباح الدین اعظمی حیات ہیں اور آج کل دبئی میں مقیم ہیں۔ میرے کالم کے بعد اُنھوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور اعظمی صاحب کے حوالے سے نہایت ٹھوس معلومات پر مشتمل ایک خوبصورت تحریر بھی بھیجی۔ اعظم گڑھ سے رشتہ و تعلق کے باعث صباح الدین بھی اپنے نام کے ساتھ اعظمی لکھتے ہیں۔ اُنھوں نے مجھے بھیجی گئی تحریر میں بتایا:

''1978ء کے بعد دس بارہ سال تک وہ (ضیاء الرحمٰن اعظمی) پابندی سے ہر سال تعطیلات میں گھر (بلریا گنج) آتے رہے۔ ان کا قیام ہمیشہ محترم حکیم ایوب صاحب کی رہائش گاہ پر رہا جنہیں وہ اپنا سرپرست کہتے تھے۔ ایئرپورٹ سے بلریا گنج آتے ہوئے اپنے گھر کی گلی میں اُتر جاتے اور والدین سے ملاقات کے بعد حکیم صاحب کے ہاں آجاتے، جہاں اُن کا قیام رہتا۔ دن میں دو مرتبہ صبح اور شام والدہ سے ملنے چلے جاتے اور گھنٹوں اُن کے ساتھ رہتے۔ اُن کی آمد پر سب بہنیں، اُن کی اولاد اور دیگر رشتہ دار اکٹھا ہوتے۔ مشرقی اترپردیش کی عام روایت کے مطابق سب کے لیے کپڑے وغیرہ کی خریداری کی جاتی۔ اپنے خاندان کے لوگوں خاص طور پر ضرورت مند رشتہ داروں اور پرانے دوستوں کی خاموشی سے حسبِ ضرورت امداد کرتے۔ جب تک والدین زندہ رہے، ڈاکٹر صاحب اُنہیں ملنے سال کے سال آتے رہے۔ والدین کے انتقال کے بعد صرف ایک مرتبہ وطن آئے۔ پچھلے پچیس سالوں میں اُنھوں نے بلریا گنج کا سفر نہیں کیا۔''

اعظمی صاحب کے تین صاحب زادے ہیں۔ احمد، اسعد، اسید۔ ایک بیٹی ہے فاطمہ۔ سب ماشاء اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ انجینئر، ڈاکٹر، انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین۔ سعودی عرب کی شہریت اختیار کرتے وقت اعظمی صاحب نے اپنا باضابطہ سرکاری نام محمد عبداللہ الاعظمی لکھنا شروع کر دیا تھا۔

یہ لاحقہ تمام بچوں کے ناموں کا بھی حصہ ہے۔ احمد محمد عبداللہ الاعظمی سے میری بات ہوتی رہتی ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ گھر میں اعظمی صاحب کے معمولات کیا تھے۔ اُنھوں نے ایک تحریر مجھے بھیجی اور کہا کہ یہ ہم سب کے تاثرات ہیں۔ ''چونکہ ہم میں سے کوئی اُردو نہیں لکھ سکتا، اس لیے یہ تحریر ہمارے ماموں محمد احمد خلیل فیصل نے قلم بند کی ہے۔'' میں اس تحریر کو اختصار کے ساتھ بیان کر رہا ہوں:

''..... ان کے دخولِ اسلام، تعلیم و تدریس اور علمی کارناموں کے حالات و واقعات متعلقہ حلقوں میں معروف ہیں، لیکن اُن کے عام معمولاتِ زندگی بھی قابلِ تقلید تھے۔ دورانِ تدریس نہایت انہماک و عرق ریزی سے لیکچر تیار کرتے۔ ایسے لگتا کہ کوئی محنتی طالبِ علم امتحان کی تیاری کر رہا ہو۔ رات کو کسی پہر ہم دیکھتے کہ وہ اپنی لائبریری میں بیٹھے ہیں۔ مدینہ منورہ میں قیامِ پزیر ہونے کے بعد سے ساری زندگی جہاں تک ممکن ہوا، حرمِ نبویؐ میں نماز ادا کرتے رہے۔ فجر میں تو بہت دلجمعی کے ساتھ جاتے اور آئے ہوئے مہمان کو بھی ساتھ لے جاتے۔ واپسی میں ناشتے کے لیے کچھ نہ کچھ لے آتے۔ مہمان کی تواضع کرتے ہوئے کسی نئی ڈش سے متعارف کراتے۔ معمول تھا کہ نمازِ فجر سے واپس آتے ہی ناشتہ فرماتے۔ تھوڑا سا وقفہ کر کے اپنی لائبریری میں مشغول ہو جاتے۔ کسی اور مصروفیت کی وجہ سے کتابوں سے دوری اُنھیں بے چین کر دیتی۔ بعض اوقات اپنے کام کی وجہ سے ذاتی سفر اور مصروفیات پر نظرثانی کر کے مختصر کر دیتے۔

بچوں کے لیے انتہائی شفیق تھے بلکہ عمر سے چھوٹے ہر شخص کے ساتھ شفقت و مہربانی سے پیش آتے۔ کسی کو مشکل میں دیکھتے تو ہر ممکن مدد کرتے۔ کسی کے گھر راشن پہنچا دیتے اور کہتے: ''کسی کو جانتے ہوئے بھوکا کیسے چھوڑ دوں؟'' کسی ضعیف یا خستہ حال خوانچہ فروش یا دکاندار سے خریداری کرنے پر سودا بازی (Bargaining) نہ کرنے کی تلقین کرتے۔ ایک مہمان کے ساتھ حرمِ نبویؐ گئے۔ نئے تعمیر شدہ وضو خانے دکھائے اور مہمان سے کہا ''آپ بھی وضو کر لیں''۔ مہمان نے کہا ''میرا تو وضو ہے۔'' کہنے لگے ''تازہ وضو کا بھی ثواب ہے۔'' زندہ جاوید چلتی پھرتی درس گاہ تھے۔ تلقین کرتے تھے کہ ٹیلی فون پر ہیلو کے بجائے 'السلام علیکم' کہا کرو۔ پاکستان جاتے، تو لوگوں کی بے صبری والی ڈرائیونگ سے بہت پریشان ہوتے۔ کہتے: ''دوسروں کو آسانی اور سہولت دینے کا چلن نہیں جو اچھے اخلاق کی نشانی ہے۔'' نہایت ملنسار اور بے حد مہمان نواز تھے۔ عزیزوں کو اکثر عمرے کے لیے بلاتے۔ فیاضی اور صلہ رحمی ایسی کہ ہر رشتہ دار، احباب اور طالب علموں کی ضروریات سے آگاہ رہتے اور بھرپور تعاون کرتے۔ ظہر کی نماز سے پہلے یا بعد میں دوپہر کا کھانا تناول کرتے۔ اگر رات گئے تک اپنے کام میں مصروف رہتے، تو دن میں نیند کا حق بھی پورا کرتے۔ جامع الکامل کی تکمیل کے بعد عموماً ظہر اور عصر کے درمیان آرام فرماتے۔ حرمِ نبویؐ سے واپس آتے ہوئے گھر کا سودا سلف بھی خود لاتے۔ گھر والوں، پوتے پوتیوں، نواسے نواسیوں کے لیے بھی ضرور وقت نکالتے اور گھر آئے مہمانوں کے لیے بھی۔ جگہ جگہ سے آئے عقیدت مندوں، فارغ التحصیل طلبہ اور حج و عمرہ

کے لیے آئے مہمانوں کے ساتھ وقت گزارتے اور اُن کی عمدہ میزبانی کرتے۔ کھانے کے وقت کوئی مہمان آجائے، تو اُسے کھانا کھلائے بغیر ہرگز جانے نہ دیتے۔ خود کسی کے ہاں مہمان ہوتے، تو کوشش کرتے کہ میزبان کو کوئی زحمت نہ ہو۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے اعظمی صاحب مہمان نہیں، میزبان ہیں۔ تعلیم و تعلم کا سلسلہ مغرب اور عشا کی نمازوں کے بعد بھی جاری رہتا۔ مسجدِ نبویؐ میں آخر وقت تک بخاری شریف اور مسلم شریف کا درس دیتے رہتے۔ ابھی سنن ابی داؤد کی تدریس شروع کی ہی تھی کہ کورونا لاک ڈاؤن کے باعث یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔

ہم سب گھر والوں کو اُن کی کمی بہت دیر تک محسوس ہوتی رہے گی۔ سب سے گزارش ہے کہ ان کی بلندیٔ درجات کے لیے دعا فرمائیں۔''

اعظمی صاحب نے انیس جلدوں پر مشتمل الجامع الکامل کی ایک تلخیص پانچ جلدوں میں بھی مرتب کی تھی۔ اپنی وفات سے چند دن قبل اُنھوں نے ان پانچ جلدوں کی طباعت و اشاعت گوجرانوالہ سے تعلق رکھنے والے مولانا عارف جاوید محمدی صاحب کو تفویض کی جو گزشتہ چالیس برس سے کویت میں مقیم ہیں۔ گوجرانوالہ میں ان کی رہنمائی میں ''دارِ ابی طیب'' کے نام سے بحث و تحقیق کا ایک ادارہ کام کر رہا ہے۔ یہ تحریر لکھتے ہوئے میں نے کویت، مولانا عارف جاوید محمدی صاحب سے رابطہ کیا۔ اُنھوں نے بتایا ''ان پانچ جلدوں میں بھی وہ تمام احادیث (16,546) موجود ہیں جو الجامع الکامل کی انیس جلدوں میں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان جلدوں میں ہر حدیث کی صحت کے حوالے سے تفصیلی مباحث شامل نہیں کیے گئے۔ مولانا کے مطابق پانچ چھ ماہ میں یہ جلدیں شائع ہو جائیں گی۔ اُردو ترجمے کا کام اعظمی صاحب اپنی زندگی میں اپنے ایک رفیقِ کار مجیب دوست صاحب کے حوالے کر گئے تھے۔ یہ کام بھارت میں مولانا حفیظ الرحمٰن عمری کی راہنمائی میں شروع ہو چکا ہے، لیکن اِس بڑے کام میں کم و بیش ایک سال لگ جائے گا۔

پاکستان میں کئی شخصیات نے مجھ سے رابطہ کیا ہے کہ وہ اِس کارِ خیر میں حصہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ''نئی بات'' اور نیوٹی وی گروپ کے مالک اور کئی تعلیمی اداروں کے منتظم، پروفیسر چودھری عبدالرحمٰن نے ٹیلی فون پر بات کرتے ہوئے کہا کہ وہ اِس منصوبے کے تمام اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ میں ذاتی حیثیت سے کوشش کروں گا کہ منصوبے سے منسلک یا اس میں دلچسپی رکھنے والے حضرات مل بیٹھیں اور اشتراکِ عمل کی کوئی صورت نکل آئے۔

❁

پندرہ برس پہلے جب میں اعظمی صاحب سے مل کر رخصت ہونے لگا، تو اُنھوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''صدیقی صاحب! میرے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ صحت و تندرستی کے ساتھ مجھے بارہ برس اور عنایت فرما دے۔ اپنا کام مکمل کرنے کو مجھے اتنا وقت چاہیے۔'' مغرب کی نماز کے بعد میں روضۂ رسول ﷺ پر سلام پیش کر رہا تھا کہ مجھے اپنے شانے پر کسی شفیق ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ پلٹ کر دیکھا، کوئی نہ تھا۔ مجھے اعظمی صاحب کی التجا یاد آ گئی۔ میں نے دعا کی ''اے اللہ! اپنے نیک بندے ضیاء الرحمٰن اعظمی کو کم از کم بارہ برس کی مزید زندگی عنایت فرما دے کہ وہ تیرے نبیؐ کی احادیث مبارکہ کی جمع بندی کر سکے۔'' میں کیا اور میری دعا کیا؟ لیکن اعظمی صاحب اس کے بعد کوئی پندرہ برس زندہ رہے۔ اللہ سے کیے گئے وعدے کے مطابق دنیا بھر میں چودہ سو سال کے اندر کہیں بھی موجود حدیثِ نبویؐ کا سراغ لگا کر الجامع الکامل مرتب کی جس کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ اس مجموعے میں حضور ﷺ کی ننانوے فی صد

احادیث آ گئی ہیں۔ ایک فی صد کی گنجائش وہ احتیاطاً چھوڑ دیتے تھے۔ کس کو خبر تھی کہ بلریا گنج کا بانکے رام کسی دن اِس صدی کا سب سے بڑا محدث بنے گا۔

پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ ابلاغیات کی استاد اور معروف کالم نگار ڈاکٹر لبنیٰ ظہیر صاحبہ اسی برس کے اوائل میں عمرے پر گئیں، تو اعظمی صاحب سے ملیں۔ اُنھیں میری کتاب ''مکہ مدینہ'' کا ایک نسخہ پیش کیا۔ اعظمی صاحب نے ڈاکٹر صاحبہ کے ہاتھ اپنی دو اُردو کتب بھیجیں اور ایک مختصر سا خط بھی۔

''مکرم و محترم عرفان صدیقی صاحب

امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

آپ کی خدمت میں عربی، اردو اور ہندی تصانیف کی فہرست بھیج رہا ہوں۔ آپ اور دیگر حضرات سے مؤدبانہ درخواست ہے کہ میرے متعلق جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے، وہ بہت کافی ہے اور اب مزید کچھ نہ لکھیں، کیونکہ اس سے نفس میں عُجب داخل ہو جاتا ہے جو اجرِ آخرت سے محروم کر دیتا ہے۔ البتہ کتابوں سے تعارف کرانے میں کوئی حرج نہیں تاکہ لوگ اسے پڑھ کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔

فی الحال میرے پاس اُردو کی دو کتابیں ہیں۔ ایک ''الادب العالی'' کا اُردو ترجمہ جو عنقریب جامعہ اسلامیہ عالمیہ، اسلام آباد سے بھی شائع ہونے جا رہا ہے اور دُوسرا ''اتباعِ سنت: عقائد اور احکام'' میں بھیج رہا ہوں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ڈکٹور محمد ضیاء الرحمٰن اعظمی

12/01 2020

ڈیڑھ ہزار سال پہلے اصفہان کے ایک آتش پرست گھرانے میں پیدا ہونے والا ''مابہ'' نامی بچہ اندھیروں سے نکل کر اجالوں میں آیا، تو ابوعبداللہ سلمان فارسیؓ کہلایا۔ جلیل القدر صحابی کے مشورے پر خندق کھودی جا رہی تھی تو سلمانؓ کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ مہاجرین نے کہا ''سلمانؓ تو ہم میں سے ہے۔'' انصار بولے: ''سلمانؓ تو ہمارا ہے۔'' حضورؐ نے سنا، تو فرمایا: ''سلمانؓ تو میرے گھر والوں میں سے ہے۔''

عمر بھر احادیث کی تلاش میں مگن رہنے والا اعظمی اپنا کام مکمل کر چکا تھا۔ اب اس کی توجہ مسجدِ نبویؐ میں بخاری اور مسلم کے بعد سنن ابی داؤد کے درس پہ تھی کہ وبا نے آلیا۔ مسجد کے دروازے بند ہو گئے۔ اعظمی کے پاس کرنے کو کچھ نہ رہا۔ احادیثِ نبویؐ کی تبلیغ و اشاعت سے دور رہنا اُس نے سیکھا نہ تھا۔ طبیعت بوجھل رہنے لگی۔ علیل ہو کر ہسپتال پہنچ گیا۔ 30 جولائی، یوم الحج، اس مردِ حق کی نمازِ جنازہ مسجدِ نبویؐ میں ادا کر دی گئی۔ دعاؤں میں شاید وہ دو زینے والا چھوٹا سا چوبی منبر بھی شریک ہوا ہو جس پر بیٹھ کر اعظمی صاحب مدتوں درسِ حدیث دیتے رہے۔ مجھے نہیں معلوم ان کی قبر جنت البقیع کے کس منطقے میں بنی۔ جہاں صحابہ کرامؓ، صحابیاتؓ، اہلِ بیتؓ اور حضورؐ کے جگر گوشوں سمیت دس ہزار سے زائد پاک ہستیاں آسودۂ خاک ہیں۔ جانے اعظمی صاحب کی قبر کو کس کی ہمسائیگی کا شرف ملا۔ جانے اُس کی روح کا استقبال جنت الفردوس کے کس دروازے پر ہوا، لیکن خوشبو سے بھری ''شیتل چھایا'' جیسا یہ خیال میرے دل و دماغ میں مہکتا رہتا ہے کہ کیا خبر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آغوشِ رحمت وا کرتے ہوئے فرمایا ہو ''ضیاء الرحمٰن تو میرا ہے۔''

(اس تحریر کے لیے میں ''ہم کیوں مسلمان ہوئے'' کے مصنف ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، اعظمی صاحب کے صاحب زادے احمد اعظمی، محترم صہیب رومی، برادر عزیز سلیم منصور خالد، مولانا عارف جاوید اور محترم صباح الدین اعظمی کا شکر گزار ہوں)۔

آتشِ چنار سے ماخوذ

شیخ عبداللہ

ایک بار میں نے جناح صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ پاکستان کا جو نقشہ آپ کے ذہن میں ہے اُس کے مطابق مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل رہے گا اور مذہب کے علاوہ اُن میں اور کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ اس لیے مشرقی اور مغربی پاکستان کا جوڑ زیادہ دیر قائم رہنے کی اُمید نہیں۔ باقی رہا مغربی پاکستان تو اُس میں بھی کئی قومیں بستی ہیں۔ ان میں بھی چپقلش پیدا ہونے کا امکان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک اور خطرہ یہ کہ ہندوستان کی مسلم اقلیت کم از کم تین حصوں میں بٹ جائے گی۔ اس کی آواز کی تاثیر گم ہو کر رہ جائے گی۔ علاوہ ازیں دو بڑی قوموں کے درمیان منافرت کی خلیج وسیع ہوگی جس کا فائدہ ہندوستان کے مشترکہ دشمن جب چاہیں اُٹھا سکتے ہیں۔

جناح صاحب کچھ بے تابی سے میری باتیں سنتے رہے۔ اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے لگتا تھا کہ وہ اُن باتوں سے خوش نہیں لیکن حق یہ ہے کہ اُنھوں نے کمال صبر سے میری ساری گفتگو سُنی اور آخر ایک مرد بزرگ کی طرح فہمائشی انداز میں کہنے لگے۔

''میں آپ کے باپ کے مانند ہوں اور میں نے سیاست میں اپنے بال سفید کیے ہیں۔ میرا تجربہ ہے کہ ہندو پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کبھی آپ کے دوست نہیں بن سکتے۔ میں نے زندگی بھر اُن کو اپنانے کی کوشش کی لیکن مجھے ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ ایک وقت آئے گا جب آپ کو میری بات یاد آئے گی اور آپ افسوس کریں گے۔''

جناح صاحب نے مزید کہا: ''آپ ایک ایسی قوم پہ کیسے اعتبار کر سکتے ہیں جو آپ کے ہاتھوں سے پانی پینا تک پاپ سمجھتی رہی ہے۔ اُن کے سماج میں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ وہ آپ کو علیحدہ سمجھتے ہیں۔'' اُنھوں نے اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کیا کہ ایک بار بمبئی میں، میں اپنی بیوی کے ساتھ میز پر دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا کہ نوکر ایک ملاقاتی کا کارڈ لایا۔ یہ مشہور ہندو لیڈر پنڈت مدن موہن مالوی کا تھا۔ میں کھانے کی میز سے اُٹھ کر گیا اور انھیں اندر لے آیا۔ جب وہ میز پر بیٹھے تو میں نے انھیں کھانے میں شمولیت کی دعوت دی۔ مالوی جی نے یہ کہہ کر انکار کیا: ''آپ جانتے ہیں کہ میں مذہبی وجوہ کی بنا پر آپ کے ساتھ ایک میز پر کھانا نہیں کھا سکتا۔'' جناح صاحب بولے کہ میں نے جواب دیا: ''آپ ساتھ ہی دوسری میز لگا کر کچھ کھائیے۔'' مالوی جی نے کہا ''یہ بھی ممکن نہیں کیونکہ نیچے مشترکہ قالین بچھا ہوا ہے اور اس کے ذریعے چھوت آ سکتی ہے۔'' جناح صاحب نے بتایا کہ یہ سن کر میں نے قالین ہٹوا دیا اور مالوی جی کی خدمت میں میوے اور دُودھ پیش کیا۔ جناح صاحب نے اس واقعہ کو کافی رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا اور مجھ سے سوال کیا کہ جس قوم کے برگزیدہ لیڈروں کا یہ حال ہو، وہ آپ کو کیسے جینے دیں گے؟''

میں نے جواب میں کہا کہ ہندوستان میں چھوت چھات کا روگ موجود ہے اور اس بات سے کسی کو انکار نہیں لیکن پڑھے لکھے ہوئے ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اس سے تنگ اور اس کا علاج کرنا چاہتی ہے۔

◆◇◆

سبق آموز کہانی

جاوید اقبال

میں داخل ہوتے ہی میں سرکاری گاڑی سے اُتر پڑا۔ میں ذاتی طور پر علاقے کی صورتِ حال کا مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں سیاہ فاموں کی بستی میں میئر بن کر آیا تھا۔ ابھی ایک ہفتہ قبل یہاں سفید اور سیاہ فاموں کے درمیان خوں ریز تصادم ہوا تھا۔ ان ہنگاموں میں دو سیاہ فام زندگی کی بازی ہار گئے اور درجن بھر لوگ زخمی ہوئے۔ صورتحال مزید خراب ہونے سے بچانے کے لیے حکومت نے میئر کو ہٹا دیا۔ مجھے چارج دیتے وقت گورنر نے کہا:

''وہاں حالات بہت کشیدہ ہیں۔ کہو تو تمہاری نامزدگی واپس لے لوں۔''

معاملہ نسلی امتیاز کا تھا۔ سفید فام حاکم سیاہ فام محکوموں کو اپنے سے کمتر سمجھتے تھے۔ وہ انھیں اپنے برابر مقام دینے کو تیار نہ تھے۔ معاملات بگڑتے بگڑتے عوامی بغاوت تک جا پہنچے تھے۔ میرے خیال میں اس بگاڑ کے ذمہ دار گورے حکمران تھے۔ میں نے گورنر سے کہا کہ مجھے یہ چیلنج قبول ہے۔

علاقہ میں حالات کشیدہ تھے۔ جگہ جگہ گھیراؤ جلاؤ کے اثرات بھی نظر آ رہے تھے۔ گلیوں بازاروں میں کوڑا کرکٹ بکھرا پڑا تھا۔ لگتا تھا جیسے برسوں یہاں صفائی نہ ہوئی ہو۔ میری سرکاری رہائش گاہ میرے دفتر کے ساتھ ہی تھی۔

دفتر پہنچ کر میں نے اپنا تعارف کرایا اور صفائی کے ملازموں کی بابت پوچھا۔ ماتحت عملے نے بتایا کہ تمام صفائی ورکر سیاہ فام ہیں اور

عجیب فاتح عالم

نفرت کے جلتے الاؤ کو مساوات کے ایک فیصلے نے گلزاروں میں بدل دیا

کام چھوڑ کر جا چکے۔

''یہ صفائی اب ہم کریں گے تاکہ ان کا اعتماد بحال ہو اور وہ کام پر آجائیں۔'' یہ سن کر میرے سفید فام ماتحتوں نے عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ یہ بات ان کے لیے ناقابل یقین تھی کہ صفائی جیسا گھٹیا کام سفید فام افسران کریں گے۔

دوسری صبح آسمان نے یہ منظر دیکھا کہ نیا میئر اور افسران اپنے ہاتھوں سے کچرا اُٹھا کر کنٹینروں ڈال رہے ہیں۔ دوپہر کو کچرا اُٹھانے والی گاڑی آئی اور کچرا لے گئی۔ اگلی صبح عوام کا ردِعمل خاصا مایوس کن تھا۔ کچرا پھر سڑکوں گلیوں میں بکھرا ہوا تھا اور خالی کنٹینر ہمارا منہ چڑا رہے تھے۔ ایک خاص بات یہ ہوئی کہ آج کچرے کا بڑا ڈھیر میری رہائش گاہ کے آگے بھی تھا۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی رہائش گاہ کے آگے سے کچرا اُٹھانے سے منع کر دیا۔ ہم نے باقی تمام جگہوں سے کچرا اُٹھا کر کنٹینروں میں ڈال دیا۔ اس شام میئں ہنگاموں میں مرنے والوں کے گھر گیا اور انھیں حکومت کی طرف سے کچھ امدادی رقم دی۔ اسپتال میں زخموں کی عیادت کی۔ انھیں تحائف دیے اور ان کی صحت یابی کے لیے دعا کی۔ سرکاری دفاتر میں کچھ آسامیاں خالی تھیں۔ خالی آسامیوں کا اشتہار شارع عام پر لگا دیا گیا۔ اشتہار میں خاص بات یہ تھی کہ یہ تمام آسامیاں سیاہ فاموں کے لیے تھیں۔ اس سے قبل یہ آسامیاں صرف سفید فاموں کے لیے مخصوص تھیں۔ انٹرویو کے دن دفتر کا احاطہ سیاہ فاموں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم نے معیار پر اُترنے والوں کو منتخب کر لیا۔

میری رہائش گاہ کے آگے کچرے کا ڈھیر بڑھتا جا رہا تھا مگر مجھے اس کی کوئی پروا تھی نہ فکر۔ قصبے کی حالت سدھرتی جا رہی تھی۔ دلوں سے میل دھل رہی تھی۔ میرے لیے یہی اطمینان کی بات تھی۔ اس دوران میئر کی عدالت میں ایک مقدمہ لایا گیا۔ فریقین میں ایک سیاہ فام اور دوسرا سفید فام تھا۔ دونوں فریقین عدالت میں حاضر ہوئے۔ میئر اور افسر ان کے بیٹھنے کے بعد ایک کرسی خالی رہ گئی تھی۔ سفید فام نے خالی کرسی گھسیٹی اور اطمینان سے بیٹھ گیا جبکہ سیاہ فام کھڑا رہا۔ یہ دیکھ کر میں نے کہا:

''یا دونوں فریقین کھڑے ہو جائیں یا ایک کرسی اور لائی جائے۔ ایک کرسی لا کر سفید فام کے ساتھ رکھ دی گئی جس پر سیاہ فام بیٹھ گیا۔

مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ سیاہ فام شکایت کنندہ کا کہنا تھا کہ اس نے دوسرے فریق کی دُکان پر سات دن کام کیا جبکہ ہفتے کے اختتام پر اسے صرف پانچ دن کا معاوضہ دیا گیا۔ دوسرے فریق کا موقف تھا کہ سیاہ فام ملازم نے اس کی منشا کے مطابق کام نہیں کیا لہٰذا وہ اسے پانچ یوم کا معاوضہ دے گا۔

کچھ غور و خوض کے بعد جیوری نے فیصلہ سیاہ فام کے حق میں دے دیا۔ ججوں کا موقف تھا کہ سیاہ فام ملازم ہر طرح سے سفید فام دُکاندار کے ماتحت تھا۔ وہ جیسے چاہتا اپنی مرضی کے مطابق اپنے ملازم سے کام لے سکتا تھا۔ اس لیے اس کا یہ موقف کہ ملازم نے اس کی منشا کے مطابق کام نہیں کیا، کیسے مانا جا سکتا ہے؟ لہٰذا وہ اپنے ملازم کو پورے ہفتے کی تنخواہ دینے کا پابند ہے۔

اس فیصلے کی خبر جنگل میں آگ کی طرح پورے قصبے میں پھیل گئی۔ یہ انہونا فیصلہ تھا۔ اس سے پہلے عموماً سفید فاموں کے حق میں فیصلے ہوتے تھے۔ اگلے دن میں اپنی رہائش گاہ سے نکلا تو ایک ناقابل یقین منظر نظر آیا۔ میری رہائش گاہ کے آگے سے کچرے کا ڈھیر اُٹھا لیا گیا تھا۔ اب وہاں کچرے کے بجائے پھولوں کے گلدستے پڑے تھے۔ سیاہ فام سینٹری ورکر کچرا کنٹینروں میں ڈال رہے تھے۔ انھوں نے اپنے میئر کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلائے۔ ان کی آنکھوں میں آج اپنے سفید فام حاکم کے لیے نفرت نہیں، محبت کی روشنی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مہکتے پھولوں کی خوشبو نے پورے قصبے کو مہکا دیا ہو۔

سال ہا سال سے امتیازی رویوں نے نفرت کا جو الاؤ دہکا تھا اور انسانوں کی روحوں کو جو چوکے لگائے تھے، محبت کے ایک رویے نے مرہم کا کام کیا۔ نفرت کے جلتے الاؤ کو انصاف اور مساوات کے ایک فیصلے نے گلزاروں میں بدل دیا۔ ◆◆◆

دنیا کی بدنام زمانہ خفیہ ایجنسی

ابو صارم

"را" پاکستانی ایٹم بم کے تعاقب میں

اُن دِنوں کی ڈرامائی اور طلسماتی کہانی بھارتی اسپائی چیف کے قلم سے

جب چوکنے پاکستانیوں نے پیچھا کرتے شاطر حریفوں کو تگنی کا ناچ نچادیا اور اپنی ہوا تک لگنے نہ دی

ماہ پاک فوج کے خفیہ ادارے، آئی ایس آئی نے انکشاف کیا کہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی، 'را' پاکستانی سرکاری اور فوجی افسروں کے موبائل فون ہیک کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔ مقصد یہ تھا کہ موبائل فونوں پر قبضہ جما کر کالیں سنی اور میسج پڑھے جاسکیں۔ موبائلوں پر قبضہ خاص سافٹ ویئرز کی مدد سے ہوتا ہے جنہیں ''اسپائی ویئر'' کہتے ہیں۔

آئی ایس آئی کے ماہرین کی رو سے پاکستانی فوجی اور سرکاری افسروں کے موبائلوں میں ''پیگاسس'' (Pegasus) نامی اسپائی ویئر پایا گیا۔ یہ ''واٹس اپ'' کے ذریعے ایک موبائل میں داخل ہوتا ہے۔ طریق کار یہ ہے کہ جس موبائل فون کو ٹارگٹ کرنا ہو، اس پر مس کال کی جاتی ہے۔ اس مس کال کے ذریعے پیگاسس ٹارگٹ شدہ موبائل میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ پھر اس موبائل کا مائیکرو فون اور کیمرا اپنے قبضے میں کرلیتا ہے۔ پھر تمام کالیں ریکارڈ کرکے اپنے مالک کو بھجواتا ہے۔ اسی لیے حکومت پاکستان نے ہدایات جاری کر رکھی ہیں کہ کوئی فوجی یا سرکاری افسر واٹس اپ استعمال نہ کرے تاکہ اہم قومی راز محفوظ رہ سکیں۔

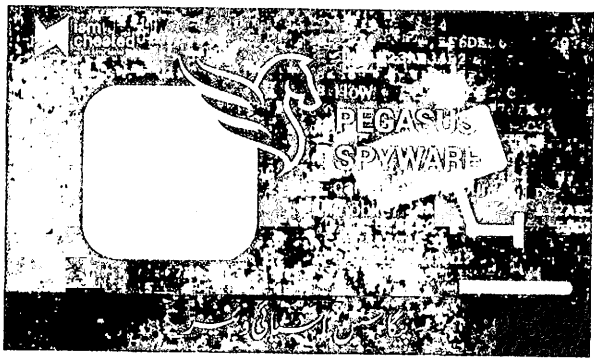

پیگاسس اسرائیل کی ٹیکنالوجی کمپنی، این ایس گروپ کا تیار کردہ ہے۔ آئی ایس آئی کا دعویٰ ہے کہ اسرائیلی کمپنی نے اپنا اسپائی ویئر بھارتی ایجنسی، را کو فروخت کردیا۔ چنانچہ را اس کی مدد سے پاکستان کے فوجی و سرکاری افسروں کی جاسوسی کرنے لگی۔ مگر آئی ایس آئی کے ماہرین ٹیکنالوجی نے بروقت پیگاسس کی موجودگی کا پتا چلا کر دشمن کی چال ناکام بنا دی۔ وہ پاکستانی قومی راز پانے میں ناکام رہی۔

انٹرنیٹ دور جدید میں روزمرہ زندگی کا حصہ بن چکا۔ ہر عام و خاص دن میں کبھی نہ کبھی نیٹ ضرور استعمال کرتا ہے۔ اسی واسطے تمام خفیہ ایجنسیاں اب حریفوں کی جاسوسی کے لیے اسے برتنے لگی ہیں۔ اس ضمن میں پاکستان کے خلاف اسرائیلی و بھارتی خفیہ ایجنسیوں کا اشتراک بہت خطرناک ہے۔ وجہ یہ کہ اسرائیل دنیائے انٹرنیٹ میں جاسوسی کرنے کے جدید ترین اور نہایت معیاری سافٹ ویئر ایجاد کرچکا۔ لہذا بذریعہ انٹرنیٹ پاکستان کی عسکری وسول تنصیبات پر اسرائیلی خفیہ ایجنسی، موساد اور را کے حملے بڑھ رہے ہیں۔ پاکستانی خفیہ ایجنسیوں کو طاقتور دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی خاطر بہت چوکنا اور محتاط رہنا ہوگا۔

☆☆☆

پچھلے ماہ ''آپریشن جبرالٹر'' کی پینتالیسویں سالگرہ تھی جو خاموشی سے گزر گئی۔ اگست 1965ء میں پاک فوج نے وادی کشمیر میں یہ آپریشن شروع کیا تھا تاکہ جموں و کشمیر کو غاصب بھارتی حکمرانوں کے قبضے سے آزاد کرایا جاسکے۔ مختلف وجوہ کی بنا پر یہ آپریشن کامیاب نہیں ہوسکا مگر اس نے بھارتی حکومت کے ایوانوں میں کھلبلی ضرور مچادی۔

بھارتی حکمرانوں کو سب سے زیادہ اپنی خفیہ ایجنسی، آئی بی (انٹیلی جنس بیورو) پر غصہ تھا۔ وجہ یہ کہ آئی بی کے جاسوس یہ معلوم کرنے میں ناکام رہے کہ پاک فوج مقبوضہ کشمیر میں

اپنے دستے بھیج رہی ہے۔ اسی ناکامی کے بعد اندرا گاندھی حکومت نے فیصلہ کیا کہ بیرون ملک جاسوسی کی سرگرمیاں انجام دینے کے لیے نئی خفیہ ایجنسی بنائی جائے۔ اس طرح ''را'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس نئی خفیہ ایجنسی کے تمام افسر اگرچہ آئی بی سے لیے گئے۔ ان میں وکرم سود (Vikram Sood) بھی شامل تھے۔

وکرم سود بعد ازاں 2000ء تا 2003ء را کے چیف رہے۔ 2018ء میں انھوں نے ایک کتاب ''The Unending Game: A Fromer R&AW Chief's insight into Espionage'' تحریر کی۔ یہ کتاب دنیائے جاسوسی کے اسرار و رموز بیان کرتی ہے۔ مختلف دلچسپ واقعات بھی اس کا حصہ ہیں۔

را کے سابق اسپائی چیف نے ابتدا میں تفصیل سے پاکستان کے ایٹم بم وجود آنے کی داستان لکھی ہے۔ گو یہ بھارتی نقطہ نظر سے تحریر کی گئی مگر افشا کرتی ہے کہ پاکستان نے کتنی اور رکاوٹیں جھیل کر ایٹم بم بنایا۔ آج یہی ہتھیار حاقتور بھارتی افواج کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ خدانخواستہ پاکستان ایٹم بم نہ بنا پاتا تو مسلمان تھا، وہ آنے والے برسوں میں بھارت کی طفیلی و ماتحت ریاست بن کر رہ جاتا۔

یہ داستان آشکارا کرتی ہے کہ ایٹم بم بناتے وقت پاکستانی خفیہ اداروں کا امریکی خفیہ ایجنسی، سی آئی اے، موساد اور راجیسی بڑی حریف ایجنسیوں سے مقابلہ تھا مگر پاکستانی خفیہ ایجنسیوں نے ایسی زبردست چالیں چلیں کہ حریف ایجنسیاں سرتوڑ کوشش کے باوجود ایٹم بم کی تشکیل روک نہ سکیں۔

کتاب کے آغاز میں وکرم سود نے بدنام زمانہ ہندو ماہر امور عسکریات، چانکیہ (یا کوٹلیہ) کا یہ قول دیا ہے: ''ایک بادشاہ کو چاہیے کہ وہ دشمن ہو یا دوست، تمام بادشاہوں کے درباروں میں اپنے جاسوس چھوڑے رکھے تاکہ وہ اٹھارہ اقسام کے افسروں کی جاسوسی کر سکیں۔'' بھارتی حکمران طبقہ امور جنگ میں چانکیہ کو اپنا گرو مانتا ہے۔ گویا ان کے مذہب میں غیر ممالک کی حکومتوں میں جاسوس داخل کرنا عین جائز ہے۔ یہی وجہ ہے، را کی مسلسل سعی رہتی ہے کہ وہ پاکستانی حکومت سے لے کر عام معاشرے تک میں اپنے ایجنٹ داخل کر دے۔ روایت ہے کہ بھارت کا موجودہ مشیر قومی سلامتی، اجیت دوال مختلف بھیس بھر کر سات آٹھ سال پاکستان میں مقیم رہا ہے۔ مقصد پاکستانی عوام میں مذہبی لسانی، سیاسی اور نسلی اختلافات پیدا کرنا تھا۔

اب آیئے وکرم سود کی کتاب کا پہلا باب ملاحظہ فرمایئے جس میں انھوں نے پاکستانی ایٹمی منصوبے کی تشکیل کا قصہ دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے:۔

☆☆

''جنگ دوزخ ہے، جاسوسی کرنا اس سے بھی زیادہ تباہ کن۔ جنگ جیتی جا سکتی ہے لیکن دنیائے جاسوسی میں کوئی فاتح نہیں ہوتا کیونکہ جاسوسوں کی لڑائی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔'' کتاب Intel Wars The Secret History of the Fight Against Terror سے

اقتباس از میتھیو ایڈ۔
کیفے ڈورسٹر وکنڈرو، پیرس، نومبر 1978ء

(کیفے میں دو افراد کی ملاقات جاری ہے) ایک دوسرے سے کہتا ہے: ''تم پلوٹونیم راستے کو چھوڑ دو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یورینیم اصل راہ ہے۔''

دونوں آدمیوں کی ملاقات ختم ہوئی تو وہ کیفے سے نکل کر اپنی کاروں کی جانب بڑھ گئے۔ جب ایک اپنی کار کا دروازہ کھول رہا تھا، تو دوسرے نے ایک لفافہ اس کی جیب میں ڈال دیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ را کے ایجنٹوں کو پاکستانی ایٹمی منصوبے کی سن گن ملی ورنہ چست و چالاک پاکستانی جرمنی سے لے کر ہالینڈ تک اپنے ایٹمی منصوبے کے سلسلے میں ساز وسامان خریدتے رہے تھے۔ وہ کبھی فرانس اور بیلجیئم پہنچ جاتے تو کبھی سوئٹزرلینڈ اور برطانیہ کا رخ کرتے۔ (را) ہمارے ایجنٹ بڑی سرگرمی سے ان کا پیچھا کرتے مگر پاکستانیوں کی گرد تک حاصل نہ کر پاتے۔

اس لفافے میں کچھ دستاویز موجود تھیں۔ ان دستاویز سے افشا ہوتا تھا کہ پاکستانی ایٹم بم بنانے کی خاطر یورینیم افزودہ کرنے والے ہائی فریکوئنسی آلات (انورٹر) خریدنے میں کامیاب رہے ہیں۔ اس خریداری کی خاطر انھوں نے بڑی حکمت دکھائی تھی۔

سب سے پہلے 1977ء میں مغربی جرمنی کی ایک فرم، ٹیم انڈسٹریز کے ذریعے ان آلات کا آرڈر دیا گیا۔ اس کمپنی سے صدیق احمد بٹ نامی ایک پاکستانی نے رابطہ کیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ انورٹر ٹیکسٹائل کمپنی کے لیے درکار ہیں۔ جرمن کمپنی کے مالک، ارنسٹ پفل نے آلات فراہم کرنے کی ہامی بھر لی۔

ارنسٹ پفل نے برطانیہ میں اپنی ایک کمپنی، وئیر گیٹ قائم کر رکھی تھی۔ وہ اسی کمپنی کے ذریعے اکثر ممالک میں اپنے

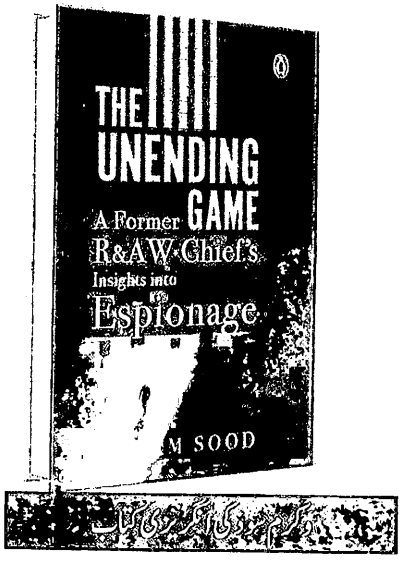

آرڈر دیتا تھا۔ وئیر گیٹ نے ایک اور برطانوی کمپنی، ایمرسن انڈسٹریل کنٹرولز کو آلات خریدنے کا آرڈر دیا۔ یہ کمپنی امریکی کمپنی، ایمرسن الیکٹر یکلز کی برطانوی ذیلی کمپنی تھی جس نے وئیر گیٹ کو مطلوبہ سامان فراہم کر دیا۔

اگست 1978ء میں انورٹر پاکستان پہنچ گئے۔ اسی ماہ انھیں راولپنڈی میں اسپیشل ورکس آرگنائزیشن کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ پاک فوج کا ایک دستہ تھا جسے ''پروجیکٹ 706'' کی تکمیل کی ذمے داری سونپی گئی تھی۔ اسی منصوبے کے ذریعے پاکستان ایٹم بم بنانے کی کوششیں کر رہا تھا۔ اس پروجیکٹ کا آغاز پاکستانی وزیراعظم، ذوالفقار علی بھٹو نے کیا تھا۔

را نے چھے سال قبل بڑی سرگرمی سے ان پاکستانیوں کا پیچھا کرنا شروع کیا جو اپنے ایٹمی منصوبے سے منسلک تھے۔ ان پاکستانیوں کی حقیقت طشت از بام کرنے کی خاطر را کو بہت پاپڑ بیلنے پڑے۔ سچ یہ ہے کہ پاکستانی ایٹمی منصوبے

کے رازمنظر عام پر لانا راکے لیے کڑا ترین چیلنج بن گیا تھا۔

ڈھاکا، 16 دسمبر 1971ء

مشرقی پاکستان میں پاک فوج کے کمانڈر، جنرل اے کے نیازی نے جب ہتھیار ڈال دیے تو پورے بھارت میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ اس شکست سے بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آیا۔ یہ بھارتی اور بنگلہ دیشی افواج کے لیے مسرت کا موقع تھا۔ 1962ء کی چین بھارت جنگ میں بھارتی فوج پر شکست کا جو سیاہ دھبہ لگا تھا، وہ کچھ دھندلا گیا۔ پاکستان کو ہم نے نیا سبق سکھا دیا۔ مشرقی پاکستان میں بغاوت سے دوقومی نظریہ دفن ہوگیا۔

ان دنوں را کے افسران نے بھی مٹھائیاں تقسیم کیں اور خوشی منائی۔ وجہ یہ کہ 1968ء میں اپنے قیام کے بعد اُسے پہلی بڑی کامیابی ملی۔ بنگلہ دیش کے قیام میں را نے اہم کردار ادا کیا لیکن را کے افسروں نے کسی قسم کا فاتحانہ مارچ پاسٹ نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے جاں بحق ہونے والے را ایجنٹوں کی خاطر شمعیں جلائیں جن کے ذریعے بھارت نے جنگ جیتی تھی۔

اگرچہ بعدازاں انھیں اعزاز واکرام سے خفیہ طور پر نوازا گیا۔ را سے وابستہ افراد کے لیے یہی بہت تھا۔ اوائل میں سبھی خاموش رہے۔ انھیں حکم تھا کہ قطعاً یہ افشا نہ ہو کہ بنگلہ دیش کے قیام میں را کا بھی کردار ہے مگر اب یہ خفیہ پن باقی نہیں رہا۔ جنگ 1971ء میں شریک را ایجنٹ اپنے پوتے پوتیوں کو خود اس زمانے کی داستانیں سناتے ہیں۔

را چیف، آر این کاؤ ایک مصروف آدمی تھا۔ جلد ہی اس کے لیے پاکستان کا ایٹمی منصوبہ دلچسپی کا سب سے بڑا مرکز اور دردسر بن گیا۔

ملتان، 20 جنوری 1972ء

سقوط ڈھاکا کے صرف پانچ ماہ بعد ذوالفقار علی بھٹو نے ملتان میں ایک خفیہ اجلاس بلا لیا۔ اس میں چار سو افراد شریک تھے۔ یہ اجلاس ایک وسیع پنڈال میں منعقد ہوا۔ حاضرین میں سرکاری افسر، سائنس داں، فوجی افسر، انجینئر اور غیر ملکی مہمان بھی شامل تھے۔ یہ اجلاس کوئٹہ میں ہونا تھا مگر بلوچستان میں جاری ایرجنسی کے سبب اُسے ملتان منتقل کرنا پڑا۔ اجلاس میں وزیراعظم نے بھی سے سوال کیا: ''مجھے آپ کب تک ایٹم بم بنا کر دے سکتے ہیں؟''

چند سائنس دانوں نے بتایا: ''پانچ سال لگ جائیں گے۔''

بھٹو بولے: ''اوہ، یہ تو دیر ہو جائے گی۔'' آخر ایک نوجوان سرکاری انجینئر نے انھیں بتایا کہ بم تین سال میں تیار ہوسکتا ہے۔

مطمئن ہو کر بھٹو مشرق وسطی کے دورے پر نکل گئے تاکہ ایٹم بم بنانے کی خاطر رقم جمع کرسکیں۔ انھوں نے پہلا پڑاؤ لیبیا میں ڈالا جہاں ان کے نئے دوست، معمر قذافی کی حکومت تھی۔ وہ پھر مصر، سعودی عرب اور ایران بھی گئے۔ انھوں نے مسلم حکمرانوں کو بتایا کہ پاکستان ایٹم بم بنا سکتا ہے۔ یوں عالم اسلام میں بھی ایک ایٹمی قوت جنم لے گی۔

پاکستان میں بعض سرکردہ شخصیات نے ایٹمی منصوبہ شروع کرنے کی مخالفت کردی۔ ان میں ماہر طبعیات ڈاکٹر عبدالسلام اور بیوروکریٹ سائنس دان ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی

نمایاں تھے۔ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ عبدالسلام بعدازاں بیرون ملک چلے گئے جبکہ ڈاکٹر عثمانی کے حصے کی ذمے داریاں پہلے منیر احمد خان اور پھر ڈاکٹر عبدالقدیر خان سنبھال ہیں۔

اس وقت بھٹو بھارت سے ہزار سال تک لڑنے کو تیار تھے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ قوم کو چاہے گھاس کھانی پڑے، پاکستان ایٹم بم بنا کر ہی دم لے گا۔ غرض بھارتی حکمران جب فتح کی خوشی میں جام لٹا رہے تھے تو بھٹو اگلی جنگ کی تیاری کرنے لگے۔

جنگ 1971ء کے بعد ذوالفقار علی بھٹو راسمیت تمام بھارتی خفیہ ایجنسیوں کی توجہ کا مرکز بن گئے تھے۔ وہ ایک جوشیلے، جذباتی اور جاہ طلب راہنما تھے۔ طاقت کے نشے میں کبھی کبھی ہٹ دھرم اور مغرور بھی ہو جاتے۔

ڈاکٹر عبدالقدیر خان آستینوں کو لات مار آئے

1958ء میں جب صدر سکندر مرزا نے انھیں وفاقی وزیر تجارت بنایا تو ان کی عمر صرف تیس سال تھی۔ یوں وہ پاکستان کے کم عمر ترین وزیر بن گئے۔ جلد ہی جنرل ایوب خان نے اقتدار سنبھال لیا۔ دو برس بعد بھٹو وزیر توانائی وآب بن کر ان کی کابینہ کا بھی حصہ بن گئے۔ بھٹو نے سندھ طاس معاہدہ کرانے میں ایوب خان کو مدد دی۔ 1961ء میں سوویت یونین سے معاہدہ کیا تاکہ روسی ٹیکنالوجی کے ذریعے پاکستان میں تیل وگیس تلاش ہو سکے۔

بھٹو جلد صدر ایوب کے قریبی رفیق بن گئے۔ مارچ 1963ء میں بھٹو نے پاک چین سرحدی معاہدہ کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تب تک وہ وزیر خارجہ بن چکے تھے۔ ان دنوں بھارت چین جنگ ختم ہوئے چند ماہ ہوئے تھے۔ چین سے دوستی کر کے بھٹو نے نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ یقیناً تب بھٹو دور کی سوچ رہے تھے۔

یہ بھٹو ہی ہیں جنھوں نے ایوب خان کو مشورہ دیا کہ کشمیر میں آپریشن جبرالٹر شروع کیا جائے۔ انھیں یقین تھا کہ اس آپریشن کی مدد سے (مقبوضہ) کشمیر آزاد ہو سکتا ہے۔ تاہم اس مہم کے سبب پاک بھارت جنگ (1965ء) چھڑ گئی۔ تاشقند معاہدے کے بعد بھٹو ایوب خان کے خیمے سے نکلے اور اپنی سیاسی جماعت کی داغ بیل ڈال دی۔

بھٹو صاحب خداداد صلاحیتوں کے مالک حتیٰ کہ کاسہ لیسی کے فن میں بھی طاق تھے۔ ایک لمحے کے لیے وہ (چارلس ڈکنز کے مشہور ناول، ڈیوڈ کوپرفیلڈ کے ایک کردار) یورا یا ہیپ ہوتے تو دوسرے لمحے ضدی سندھی جاگیردار بن جاتے۔ انھیں نفاست سے سلے مغربی سوٹ پہن اور ہاتھوں میں جام لے کر روانی سے انگریزی بولنا بھی آتا۔ 1961ء میں طمطراق سے یہ کہتے سنے گئے کہ فیلڈ مارشل ایوب خان لنکن سے بھی زیادہ بڑے لیڈر ہیں...... لینن سے بھی عظیم...... وہ ہمارے اتاترک ہیں...... اور صلاح الدین ایوبی بھی۔

پانچ سال بعد بھٹو نے آن واحد میں ایوب خان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب وہ ایک آمر قرار پائے۔ اگرچہ سقوط ڈھاکا کے بعد بھٹو کو خود مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بننا پڑا تھا۔ شکست نے بھٹو کو زخمی شیر بنا دیا۔ وہ علی الاعلان کہنے لگے کہ پاکستان کو ایٹمی قوت بنا کر دم لیں گے۔

مئی 1974ء میں بھارت نے پوکھران میں ایٹمی دھماکا کر دیا۔ اس واقعے نے بھٹو کی دیوانگی بڑھا دی۔ تب تک لیبیا، سعودی عرب اور ایران سے فنڈ آنے لگے تھے۔ چنانچہ اس رقم سے ایٹمی منصوبے پر کام شروع ہوا۔ 1971ء کے وسط میں بھٹو نے شمالی کوریا سے بھی رجوع کیا۔ تب پاکستان ڈلیوری سسٹم، توپوں، راکٹ لانچروں اور اسلحے کی تلاش میں تھا۔

بھٹو نے پاکستانی ادارے، پاکستان انسٹیٹیوٹ آف نیوکلیر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (پنسٹک) میں بھی تحقیق کا رخ بدل ڈالا۔ اب وہ چاہتے تھے کہ ادارے کے سائنس دان ایٹمی ہتھیار بنانے کی خاطر تحقیق و تجربات کریں۔ جیسے 1940ء کے عشرے میں امریکی حکومت نے مین ہٹن پروجیکٹ کی مدد سے ایٹم بم بنائے تھے۔

چند برس بعد بھٹو کو ان کے پسندیدہ جرنیل، ضیاء الحق نے جیل میں ڈال دیا۔ وہاں انھوں نے ایک انگریزی کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' قلمبند کی۔ اس میں انھوں نے دعویٰ کیا کہ اگر ان کی حکومت برقرار رہتی تو وہ اسلامی تہذیب و تمدن کو ایٹمی قوت بنا کر ہندو، عیسائی اور یہودی تہذیبوں کے برابر لا کھڑا کرتے۔

بھٹو نے کتاب میں لکھا ''جب میں نے پاکستان کے ایٹمی توانائی کمیشن کا دورہ کیا تو وہ محض نمائشی ادارہ تھا۔ دفتر کے باہر لگے بورڈ سے بس پتا چلتا تھا کہ وہ ایٹمی کمیشن ہے ورنہ ادارے میں کوئی ٹھوس کام نہ ہوتا۔ میں نے پھر بڑی محنت سے، پیہم کوششوں کے ذریعے اس ادارے میں نئی روح پھونکی تاکہ پاکستان ایٹمی قوت ہونے کا اعزاز حاصل کرے۔''

یہ مگر حقیقت ہے کہ بھٹو سے قبل پاکستان میں ایٹمی منصوبے پر کام شروع ہو چکا تھا۔ سرگرمی کا آغاز 1960ء میں ہوا جب ڈاکٹر آئی ایچ عثمانی پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سربراہ بنائے گئے۔ (وہ ایک قابل سائنس دان، بہترین منتظم اور محب وطن پاکستانی تھے۔) ڈاکٹر عثمانی نے پھر ایٹمی تحقیق و تجربات کرنے والے اداروں مثلاً پنسٹک اور کراچی نیوکلیئر پاور کمپلیکس کی بنیاد رکھی۔ یہ ڈاکٹر عثمانی ہی ہیں جنہوں نے ''چھے سو'' نوجوان پاکستانی سائنس دانوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے بیرون ممالک بھجوایا۔ ان میں سے ایک سو ڈاکٹریٹ کر کے واپس آئے۔

ذوالفقار علی بھٹو کا استدلال یہ تھا کہ بھارت اور ترقی یافتہ ممالک کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان کو ہر حال میں ایٹم بم بنا لینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے، جب چین نے 1964ء میں پہلا ایٹمی دھماکا کیا تو بھٹو کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ جلد چینی قیادت سے ملنے چین جا پہنچے۔ وزیراعظم چواین لائی سے ملاقات کے بعد ہی بھٹو نے اپنا یہ مشہور بیان دیا: ''اگر بھارت نے ایٹم بم بنایا تو ہم بھی بنا کر رہیں گے۔ چاہے ہمیں گھاس پھونس کھانا یا فاقہ کرنا پڑے۔ ہمارے پاس اور کوئی راستہ نہیں۔''

شملہ، جولائی 1972ء

یہ تھے ذہین و فطین بھٹو جو جولائی 1972ء میں بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی سے مذاکرات کرنے شملہ (بھارت) پہنچے۔ ان کی خواہش تھی کہ بھارتی حکومت جنگ ستمبر میں پکڑے گئے پاکستانی قیدی رہا کر دے اور یہ کہ بھارتی فوج نے پاکستان کے جس علاقے پر قبضہ کر رکھا ہے، وہ ان کے حوالے کیا جائے۔ اس طرح بھٹو پاکستان کو ایک اور مارشل لا سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

بھٹو صاحب نے اندرا گاندھی سے درخواست کی کہ وہ

پاکستان میں جمہوریت کی حفاظت کریں۔ بھارتی وزیراعظم پر بیرون ممالک سے بھی دباؤ تھا کہ مفاہمت کرلیں۔ چنانچہ بھارتی حکمران طبقے نے پاکستان سے معاہدہ کرلیا۔ یوں ہم نے میدان جنگ میں جو بازی جیتی تھی، وہ مذاکرات کی میز پر ہاردی۔

پاکستانی ایٹمی منصوبے میں ازحد دلچسپی لے رہے ہیں۔ دراصل وہ بھی ایٹم بم بنانے کے متمنی تھے۔ اس خبر نے بھارتی ایوانوں میں کھلبلی مچادی کیونکہ پاکستان اور ایران ایٹمی قوت بننے میں کامیاب ہوجاتے تو بھارت کا دو حریفوں سے سابقہ پڑجاتا۔

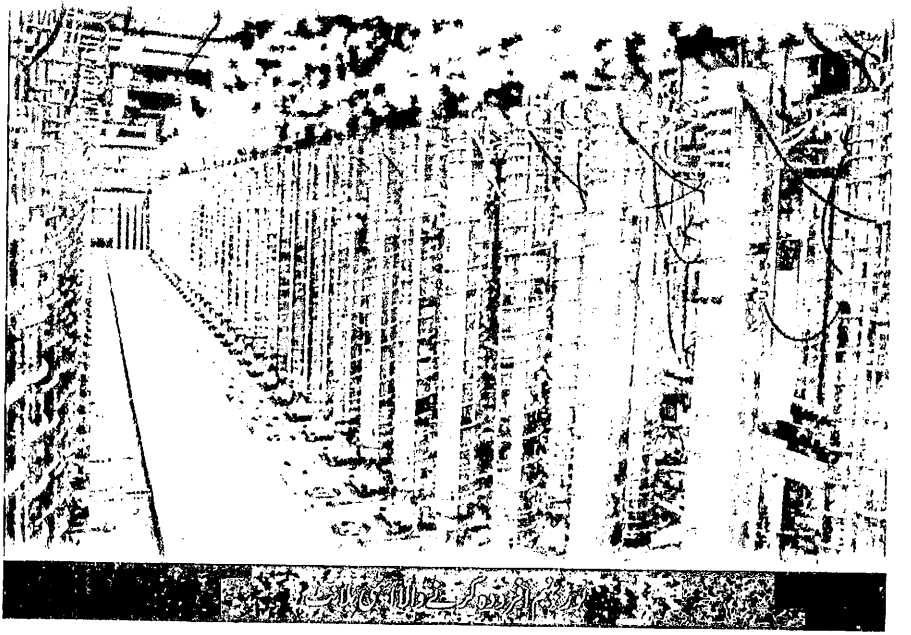

راکی قیادت مگر بھٹو کے پس منظر سے آگاہ تھی۔ اُسے یقین تھا کہ گو جنگ ختم ہوچکی مگر وہ نیا محاذ کھولنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ ان کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی اور بھٹو ایٹم بم بنانے کے پلان پر سرگرمی سے کام کرنے لگے۔ اب را کی یہ بنیادی ذمے داری بن گئی کہ وہ پتا چلائے کہ پاکستان کن ممالک میں کیسے اور کس سے ایٹمی منصوبے میں کام آنے والے آلات اور دیگر سامان خرید رہے ہیں۔

اس چھان بین کے دوران را کو پتا چلا کہ شاہ ایران بھٹو عرب حکمرانوں سے فنڈز لینے میں کامیاب رہے۔ اسلامی لیڈروں کا دل جیتنے کی خاطر انھوں نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دے ڈالا۔ وہ افغانستان کے معاملات میں بھی دخل دینے لگے۔ انھوں نے لاہور میں اسلامی سربراہ کانفرنس بھی منعقد کرائی۔ بھٹو کی اس سرگرمی نے بھارتی حکومت کے ایوانوں میں بھونچال سا پیدا کردیا۔

اب بھارتی حکمرانوں نے را پر شدید دباؤ ڈالا۔ بھارتی حکومت جاننا چاہتی تھی کہ پاکستانی کیونکر اپنے ایٹمی منصوبے

...ل درآمد کر رہے ہیں۔ را نئے رنگروٹوں کو جنوبی دہلی میں واقع ایک زیر زمین دفتر میں جاسوسی کی تربیت دیتی تھی۔ ان رنگروٹوں کو بھی پاکستان کے ایٹمی منصوبے کی سن گن لگانے کے بین الاقوامی مشن پر لگا دیا گیا۔

اس زمانے میں چند ہی ممالک کے پاس ایٹم بم تھے۔ ان بموں کے حامل ممالک اپنے ایٹمی رازوں کی جان سے زیادہ حفاظت کرتے تھے۔ اسی لیے کسی کے ایٹمی منصوبے کا کھوج لگانا نہایت کٹھن کام تھا۔ بہرحال را کے ایجنٹ پوری دنیا میں پھیل گئے۔ وہ ہر ممکن طریقے سے ان پاکستانیوں کی بو سونگھنے لگے جو اپنا ایٹمی منصوبہ پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کوششوں میں محو تھے۔

را کے صدر دفتر میں ایجنٹوں کی تیار کردہ رپورٹیں موصول ہوتی رہتیں۔ جائزے اور تبصرے بھی ملتے مگر طویل عرصہ گزرنے کے بعد بھی کوئی ایسا ٹھوس ثبوت سامنے نہ آسکا جس سے ثابت ہو سکے کہ پاکستان کا ایٹمی پروگرام کس مرحلے میں ہے؟ ان رپورٹوں سے بس یہ آشکارا ہوتا کہ فلاں پاکستانیوں پر ملوث ہونے کا شک ہے، فلاں جگہوں میں ان کی سرگرمیاں جاری ہیں اور فلاں آلات وہ حاصل کر سکتے ہیں۔

پاکستانی نہایت زیرکی اور ہوشیاری سے اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ را کو عرصۂ دراز تک یہی نہیں معلوم ہو سکا کہ پاکستان پلوٹونیم سے ایٹم بم بنانا چاہتا ہے یا یورینیم سے؟ را کے ایجنٹوں نے بیرون ممالک کئی پاکستانیوں کا پیچھا کیا۔ انھیں بعض معلومات بھی ملیں مگر آخرکار وہ سر پیٹ کر رہ جاتے۔ را کے بڑوں کو ناکامی پر بہت جھنجھلاہٹ ہوتی۔

فرانس نے ایک ری پروسیسنگ پلانٹ پاکستان کو فراہم کرنے کی خاطر معاہدہ کر رکھا تھا۔ اس پلانٹ میں پلوٹونیم تیار ہونا تھا مگر امریکا کے شدید دباؤ پر فرانس نے 1976ء میں یہ معاہدہ منسوخ کر دیا۔ اس پر بھٹو حکومت نے فرانسیسی حکومت سے کافی احتجاج کیا لیکن پاکستانیوں کی ہمت نہیں ٹوٹی اور وہ پہلے کے مانند جوش و خروش سے اپنے ایٹمی منصوبے کو مکمل کرنے میں جتے رہے۔

امریکی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے کہ پاکستان ایٹم بم بنانے کے فیصلے سے دستبردار ہو جائے۔ کہا جاتا ہے، 1976ء میں پاکستان میں تعینات امریکی سفیر نے وزیراعظم بھٹو کو دھمکی بھی دی کہ اگر انھوں نے ایٹمی منصوبہ جاری رکھا تو اپنی حکومت ختم سمجھو۔ بھٹو پھر واقعی زیادہ دیر اقتدار میں نہیں رہے۔ اگلے سال ماہ جولائی میں ضیاء الحق نے ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔

اسی دوران را کو معلوم ہوا کہ پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سربراہ، منیر احمد خان اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان میں اختلافات جنم لے چکے۔ منیر احمد کی زیر نگرانی پاکستان میں کئی ایٹمی تنصیبات تیار ہوئی تھیں جبکہ ڈاکٹر عبدالقدیر کی سربراہی میں ایٹمی منصوبہ جاری تھا مگر میں ''پاکستانی ایٹم بم کا باپ'' ذوالفقار علی بھٹو کو قرار دیتا ہوں۔ ان کی پیہم کوششوں اور سرگرمی ہی سے ایٹمی منصوبے کا آغاز ہوا۔ ضیاء الحق نے بھی تندہی سے اُسے جاری رکھا۔ یوں را کے ایجنٹوں کا کام مزید پیچیدہ ہو گیا۔

یورپ کی ایٹمی ریٹیل مارکیٹ..... 1975ء تا 1979ء

جنوری 1972ء میں ملتان والی میٹنگ میں نوجوان سفارت کار، صدیق احمد بٹ نے بھٹو کو مطلع کیا تھا کہ پاکستان تین برس میں ایٹم بم بنا سکتا ہے۔ تب سے را کے ایجنٹ اس پاکستانی پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ بعدازاں بھٹو حکومت نے صدیق احمد کو ہالینڈ کے سفارت خانے میں بطور کونسلر سائنس و ٹیکنالوجی تعینات کر دیا۔ وہاں بھی را ایجنٹ اس کی نگرانی کرتے رہے۔

کچھ عرصے بعد انکشاف ہوا کہ صدیق احمد کی کار ایمسٹرڈیم کے محلے، زوانن برگ میں ایک گھر کے باہر اکثر کھڑی رہتی ہے۔ اس گھر میں ماہر فلز کاری، ڈاکٹر عبدالقدیر

مقیم تھے۔ وہ اس وقت ایٹمی آلات بنانے والی ولندیزی کمپنی، یورینکو سے وابستہ تھے۔ یہ 1975ء کی بات ہے۔

ہمیں بعد میں پتا چلا کہ کمپنی میں ڈاکٹر عبدالقدیر کا ایک ساتھی، فرٹس ویرمان ان پر شک کرنے لگا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر سینٹری فیوج آلات میں اچانک دلچسپی لینے لگے جو یورینیم افزودہ کرنے میں کام آتے ہیں۔ اس کی اطلاع پر ہالینڈ کی انٹیلی جنس نے ڈاکٹر خان کو گرفتار کرنے کا فیصلہ کر لیا لیکن امریکی خفیہ ایجنسی، سی آئی اے نے اُسے اس اقدام سے باز رکھا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ سی آئی اے ڈاکٹر خان کی سرگرمیوں پر مزید نظر رکھنا چاہتی ہے۔

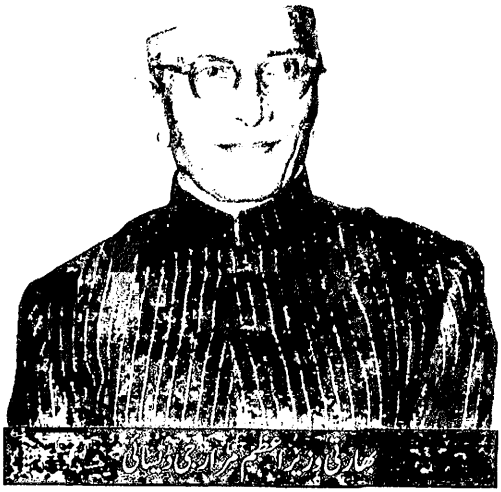

بھارتی وزیراعظم مرارجی ڈیسائی

اس دوران ڈاکٹر خان کو علم ہو گیا کہ مغربی خفیہ ایجنسیاں ان کے پیچھے ہیں چنانچہ وہ دسمبر 1975ء میں پاکستان چلے آئے۔ انھی دنوں ہالینڈ کے وزیر معاشیات، رڈ لبرز نے تبصرہ کیا ”میں سمجھتا ہوں کہ امریکیوں نے جان بوجھ کر ڈاکٹر خان کو گرفتار نہیں ہونے دیا۔ وجہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کو سوویت یونین کے خلاف کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔“ ولندیزی وزیر کی بات چار سال بعد ہی سچ ثابت ہوئی۔

اسلام آباد میں ڈاکٹر خان کو ایک عمدہ گھر برائے رہائش دیا گیا۔ وہاں داخل ہونے والے ہر مہمان کی نظر دیوار پر لگی ایک بڑی سی تصویر پر ضرور پڑتی۔ وہ 1947ء کے ہنگاموں میں جلتی ایک ریل کی تصویر تھی جس پر مہاجرین سوار تھے۔ ڈاکٹر عبدالقدیر مہاجر ہونے کے ناتے بھارت سے نفرت کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے، جب ڈاکٹر خان نے ایٹمی منصوبے میں شامل ہونے کی پیشکش قبول کر لی تو بھٹو نے کہا تھا: ”اب میں ان حرام خور ہندوؤں سے نمٹ لوں گا۔“

اس کے بعد پاکستانی ایٹمی منصوبہ کا سلسلہ جیسے بھول بھلیوں میں شروع ہو گیا۔ را کے ایجنٹوں کو انھی بھول بھلیوں سے گزر کر جلد از جلد اپنی منزل تک پہنچنا تھا۔ بھارت کی افواج اور انٹیلی جنس کمیونٹی پاکستانی ایٹمی منصوبے کی ساری معلومات سے آگاہ ہونا چاہتی تھی مسئلہ مگر یہ تھا کہ جن دنوں پاکستانی ایٹم بم کا سامان خریدنے سرگرم ہوئے، بھارت میں مرارجی ڈیسائی کی حکومت آ گئی۔

مرارجی ڈیسائی گاندھی جی کی طرح فلسفہ عدم تشدد کے پیروکار تھے۔ وہ عسکری معاملات میں کم ہی دلچسپی لیتے۔ انھیں اس امر سے کوئی غرض نہیں تھی کہ پاکستان کا ایٹم بم بھارت کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے پاکستانی ایٹمی منصوبہ روکنے کے لیے کسی قسم کی ہدایات جاری نہیں کیں۔ تاہم بیرون ممالک را کے ایجنٹوں نے پاکستانیوں کا پیچھا جاری رکھا۔ گو ان کا طریق کار ایسا خفیہ اور پوشیدہ تھا کہ را ایجنٹوں کو طویل عرصہ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

ہمیں یہ ضرور پتا چل گیا کہ پاکستانی اب یورینیم کے ذریعے ایٹم بم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فرانس نے

تان کو ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ دینے سے انکار کر کے پلوٹونیم ایٹم بم بنانے کا راستہ روک دیا تھا۔ را کی دستاویز افشا کرتی ہیں کہ یورپ میں پاکستانی 1976ء سے سرگرم عمل ہوئے۔

ایٹمی منصوبے کے تحت اب پاکستانیوں نے گیس سینٹری فیوج پلانٹ تیار کرنا تھا تاکہ وہاں یورینیم افزودہ کرنے سے ایٹم بم بنایا جا سکے۔ اس زمانے میں مشینری و آلات کی برآمد پر کم پابندیاں عائد تھیں۔ پاکستانیوں نے اس چھوٹ سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ انھوں نے پلانٹ تعمیر کرنے کا پلان یہ بنایا کہ اس کا سامان مختلف یورپی کمپنیوں سے قسطوں میں خریدا جائے۔ اس طریق کار کا فائدہ یہ تھا کہ کسی مغربی ملک کی انٹیلی جنس ایجنسی کو شک نہ ہوتا کہ پاکستان ایٹمی پلانٹ بنا رہا ہے۔

دلچسپ بات یہ کہ گیس سینٹری فیوج برآمد کرنے پر پابندی تھی مگر یورپی کمپنیاں وہ سارا ساز و سامان فروخت کرتی تھیں جن کے ذریعے اس مشینری کو بنانا ممکن تھا۔ یہی امر پاکستانیوں کے لیے بھاگوان ثابت ہوا۔

1976ء میں پاکستانی ہالینڈ کی کمپنیوں سے خصوصی اسٹیل سے بنی 6500 ٹیوبیں اور اسپیشل روٹر خریدنے میں کامیاب رہے۔ یہ یورینیم سینٹری فیوج پلانٹ کے لازمی آلات تھے۔ را سمجھتی ہے کہ پاکستانی ایٹم بم بنانے کے سلسلے میں ولندیزیوں سے بڑا جرم سرزد ہوا۔ وہ اس طرح کہ انھوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو سینٹری فیوج پلانٹ میں یورینیم افزودہ کرنے والی ٹیکنالوجی لکھا پڑھا دی۔ شاید ان کا خیال تھا کہ یہ ٹیکنالوجی پاکستانی انجینئر کے لیے کسی کام کی نہیں مگر ڈاکٹر عبدالقدیر پاکستان کے لیے صحیح جگہ صحیح وقت میں صحیح آدمی ثابت ہوئے۔

اس زمانے میں یورپ آزاد تجارت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پاکستانیوں نے اس سہولت سے بھی بہت فائدہ اُٹھایا۔ وہ خاموشی سے اپنے ایٹمی پلانٹ کی خاطر مطلوبہ سامان کی خریداری کرنے لگے۔ کچھ جرمن کمپنیوں نے انھیں ویکیوم پمپ فراہم کیے۔ بقیہ کمپنیوں سے گیس پیوریفکیشن آلات مع خصوصی طور پر تیار کردہ المونیم پرزے خریدے گئے۔

کراچی میں ارشد امجد اینڈ اربید لمیٹڈ نامی کمپنی واقع تھی۔ اسی کمپنی نے جرمن کمپنیوں کو آرڈر دے کر تین ایٹمی پلانٹوں کے لیے سامان خریدا۔ پاکستانیوں نے انھی تین پلانٹس کے ذریعے پروڈکشن یونٹ بنا لیا۔ اس یونٹ میں یورینیم ہیکسا فلورائیڈ تیار کی گئی۔ یہ یورینیم کی افزودگی کے لیے درکار بنیادی گیس ہے۔

کچھ پاکستانی فرانس میں سرگرم ہوئے۔ وہ فرانسیسی کمپنیوں سے دس ہزار دھاتی ڈھکنیاں خریدنا چاہتے تھے۔ یہ آلات سینٹری فیوج روٹروں کو چلانے میں کام آتے ہیں۔ را کے ایجنٹوں نے دریافت کیا کہ فرانسیسی حکومت نے پاکستان کو یہ ڈھکنیاں فراہم کرنے پر بظاہر پابندی لگا دی تھی لیکن بعدازاں بیلجیئم کی ایک کمپنی کو اجازت دے دی کہ وہ فرانس سے ایسا تمام سامان خرید کر پاکستانیوں کو فراہم کر دے جن سے پاکستانی ڈھکنیاں خود تیار کر لیں۔

سوئٹزرلینڈ بھی چست و چالاک پاکستانیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ سوئس کمپنیاں بھی پاکستان کو سامان بیچ کر منافع کمانا چاہتی تھیں۔ پاکستانیوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر ان سے رابطے کر کے آرڈر دیے۔ انھیں یہ تک معلوم تھا کہ نیوکلیر سپلائیرز گروپ (لندن کلب) نے کس کس پرزے کی برآمد پر پابندی لگا رکھی ہے۔

مثال کے طور پر کوئی یورپی کمپنی کسی غیر کو سینٹری فیوج آلات فروخت نہیں کر سکتی تھی مگر ان آلات کو بنانے میں کام آنے والے انتہائی نفیس والوز (Valves) کی برآمد پر پابندی نہیں تھی۔ چنانچہ 1977ء کے اوائل میں تین پاکستانی یہ خصوصی والو بنانے والی سوئس کمپنی، واکوم اپارٹ ٹیکنک کے

دفتر پہنچ گئے۔ کمپنی نے بخوشی انھیں والو بیچ دیے۔

پاکستانیوں کے تو حوصلے بلند ہو گئے۔ انھوں نے پھر زیادہ بڑی سوئس کمپنی، کوراانجینئرنگ سے رجوع کیا۔ انھیں کمپنی سے گیسی فیکیشن اینڈ سولڈیفکیشن یونٹ درکار تھا۔ یہ مشین یورینیم ہیکسا فلورائیڈ گیس کو سینٹری فیوج میں بھرتی اور پھر کام مکمل ہونے کے بعد اُسے ٹھوس شکل میں بدل دیتی ہے۔ سوئس حکومت نے یہ یونٹ بھی پاکستان کو فروخت کرنے کی اجازت دے دی کیونکہ لندن کلب نے اس کی برآمد پر پابندی نہیں لگائی تھی۔ چنانچہ یہ یونٹ پاک فضائیہ کے تین ہرکولیس سی۔ 130 طیاروں کے ذریعے پاکستان لے جائے گئے۔

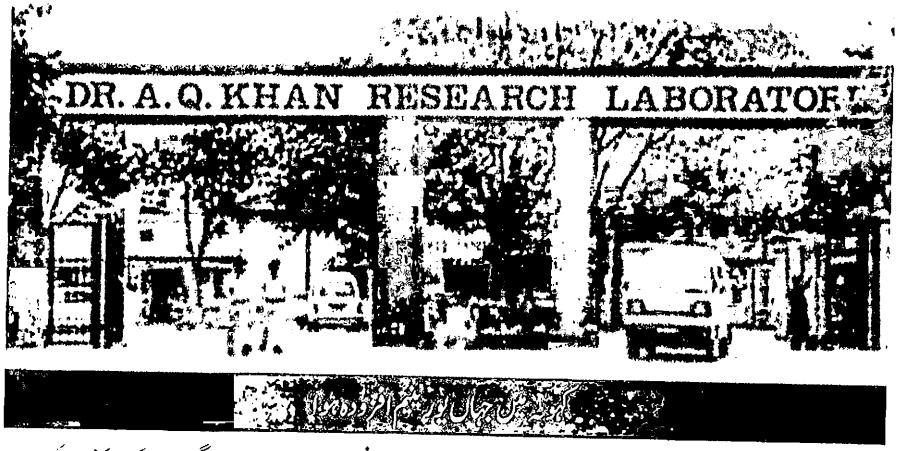

برطانیہ میں بھی پاکستانی سرگرم تھے۔ وہاں انھوں نے مختلف کمپنیاں کھولیں اور ان کے ذریعے آرڈر دینے لگے۔ اکثر کمپنیاں عبدالسلام نامی پاکستانی چلا رہا تھا جس کی نارتھ لندن میں سلام ریڈیو نامی دکان تھی۔ 1975ء میں ولندیزی حکومت نے پاکستانیوں کو تیس انورٹر روٹیڈ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ عبدالسلام نے وئیر گیٹ نامی کمپنی کے ذریعے برطانوی کمپنی، ٹیم انڈسٹریز کو ان انورٹر روٹیڈ کا آرڈر دیا۔ اس کمپنی نے ہالینڈ سے مطلوبہ آلات منگوا کر پاکستانیوں کو فراہم کر دیے۔

اس زمانے میں را کے ایجنٹوں کی رپورٹوں سے عیاں ہے، برطانوی حکمران طبقہ پاکستانیوں کی ایٹم بم بنانے والی مہم کا مذاق اُڑاتا تھا۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ کم علم اور ناتجربے کار پاکستانی ایٹمی منصوبے میں استعمال ہونے والی جدید ترین مشینوں کو سمجھ نہیں پائیں گے مگر پاکستانیوں نے ان کے تمام اندازے غلط ثابت کر دیے۔ جب پاکستانی ایٹم بم بنانے میں کامیاب رہے تو برطانوی حکومت حیران پریشان ہو گئی تھی۔

فرانس اور برطانیہ میں سرگرم را کے ایجنٹوں کو اپنے مخبروں کی مدد سے آخر معلوم ہو گیا کہ پاکستانی یورینیم سے ایٹم بم بنانا چاہتے ہیں۔ اس ضمن میں چند دستاویز بھی را کے ہاتھ لگ گئیں جن کا ذکر مضمون کی ابتدا میں ہو چکا۔ را نے فوراً وزیراعظم ڈیسائی کو مطلع کیا کہ پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے۔ اب وہ گھبرا گئے۔ انھوں نے پھر یورپی حکومتوں کو خطوط لکھ کر خبردار کیا کہ پاکستانی مغربی کمپنیوں سے ایٹم بم بنانے کا سامان خرید رہے ہیں۔

ان خطوط کے ذریعے یورپی ممالک چوکنا ہوئے اور وہ پاکستان جانے والے تمام سامانوں کی پڑتال کرنے لگے۔ لیکن تب تک پاکستانی اپنا کام مکمل کر چکے تھے۔ مزید برآں 1979ء میں افغانستان پر سوویت یونین کے حملے سے دفعتاً پاکستان امریکیوں اور برطانویوں کے لیے اہم مملکت بن گیا۔ اس بدلتی صورت حال میں پاکستان کا ایٹمی منصوبہ پسِ پشت جا پہنچا۔

آغا حسن عابدی، ایک غیر معمولی پاکستانی

ستم ظریفی یہ ہے کہ 1977ء میں امریکی صدر، جمی کارٹر نے بھارت کو ایٹمی ری ایکٹروں کے لیے بھاری پانی اور یورینیم دینے کی پیشکش کی تھی۔ وزیراعظم ڈیسائی نے مگر امریکی ایٹمی مصنوعات لینے سے انکار کر دیا۔

1978ء کے اوائل میں وزیراعظم ڈیسائی نے شاید نادانستہ انداز میں پاکستانی صدر، ضیاء الحق کو بتایا کہ ہم جانتے ہیں، پاکستان یورینیم سے ایٹم بم بنا رہا ہے۔ جہاں دیدہ پاکستانی جرنیل فوراً چوکنا ہو گئے۔ انھیں علم ہو گیا کہ را ایجنٹ یورپی ممالک میں پاکستانی ایجنٹوں کے تعاقب میں ہیں۔ انھوں نے فوراً اپنے ایجنٹوں کو مطلع کیا کہ وہ اپنی سکیورٹی بڑھا دیں۔ یوں را کے لیے ان کی جاسوسی کرنا پہلے سے زیادہ مشکل ہو گیا۔ کبھی کبھی آپ کے اپنے ہی آپ کے لیے گڑھا کھود دیتے ہیں۔

پاکستان کے ایٹم بم کی تکمیل میں ایک غیر متوقع کھلاڑی..... بی سی سی آئی بینک نے بھی اہم کردار ادا کیا جس کے بانی آغا حسن عابدی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پورا بینک آغا عابدی کی شخصیت پر استوار تھا۔ ان کے امریکا، یورپی اور مشرقِ وسطیٰ میں نامی گرامی اور طاقتور افراد سے قریبی تعلقات تھے۔ ان میں سی آئی اے کے سربراہ، رچرڈ ہلمز اور ولیم کیسی، سعودی انٹیلی جنس چیف کمال ادہم، سابق صدور اور اسلحے کے بین الاقوامی تاجر، عدنان خشوگی اور منوچہر غربانفر نمایاں ہیں۔ بی سی سی آئی بینک کے ذریعے ہی ایٹمی سامان کے بہت سے سودوں کی ادائی ہوئی تھی۔

1978ء کے آخر تک پاکستان خاطر خواہ تعداد میں یورینیم افزودہ کر چکا تھا۔ جلد ہی وہ امریکا اور سعودی عرب کے ساتھ سویت۔ افغان جنگ کا حصہ بن گیا۔ جمی کارٹر کے جانشین، صدر رونالڈ ریگن نے تبھی ایک سوال کے جواب میں امریکی صحافیوں کو بتایا: ''پاکستان کے ایٹم بم سے ہمارا کیا لینا دینا؟ یہ ان کا اندرونی معاملہ ہے۔'' آنے والے برسوں میں امریکی حکومت کانگریس سے یہ کہہ کر پاکستان کے لیے فنڈز منظور کراتی رہی کہ وہ ایٹم بم نہیں رکھتا۔ پاکستان نے افغان مجاہدین کو دوران جنگ زبردست طریقے سے مدد دی۔ یوں یہ سوویت یونین کو شکست دینے میں کامیاب رہا۔

☆☆☆

مواخاتِ مدینہ

صبیحہ عماد

میں ایک سرکاری اسکول میں اسلامیات کی استاد ہوں۔ پڑھنے پڑھانے کا شوق بچپن سے تھا۔ شوق کب مجبوری بنا اور مجبوری کب روزگار کی راہ پر لے آئی؟ یہ تو یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ مجھے پڑھاتے ہوئے پندرہ سال گزر چکے۔ جو مجبوریاں روزگار کی راہ پر لائی تھیں وہ سالوں پہلے ختم بھی ہو چکیں کہ اب تو عرصۂ دراز سے اللہ کے فضل و کرم کی نہ ختم ہونے والی برسات ہے مگر پڑھانے کا شوق ایسا دل کو بھایا کہ پھر یہ راہ چھوڑی ہی نہ گئی۔

جیسا میں نے بتایا کہ میں اسلامیات پڑھاتی ہوں اور جب بھی اپنے شاگردوں کو مواخاتِ مدینہ پڑھاتی ہوں تو دل ایک عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو جاتا ہے۔

آج بھی ایسا ہی ہوا۔ دل صبح سے برما سے آنے والی خبروں پر بوجھل تھا۔ کٹے پھٹے لاشے، خون، بربادی، تباہی، مسلمان ملکوں کی بے حسی، بنگلہ دیش کی بند سرحدیں، پاکستانی حکومت کی لاپروا پالیسیاں..... غرض ذہن پر بہت بوجھ تھا کہ آج پھر مجھے مواخاتِ مدینہ پڑھانا پڑ گیا۔

میں اپنی کلاس میں بچوں کو سوالات پوچھنے کی مکمل آزادی دیتی ہوں۔ وہ مواخاتِ مدینہ کے تناظر میں پر ہمیشہ حیران ہوتے ہیں کہ انصارِ مدینہ نے کس طرح اپنا گھر، کاروبار اور اپنی ملکیت کی ہر چیز اپنے مہاجر بھائی کے حوالے کر دی (نصف کر کے) کیا گھر، کیا زمین، کیا کھیت، کیا باغات اور کیا کاروبار۔ ہر چیز میں انصار نے مہاجروں کا حصہ الگ کر کے دے دیا۔ اسی طرح مہاجرین بھی مدینہ میں بہت آسانی سے آباد ہوتے چلے گئے۔

سوشل میڈیا اور واٹس ایپ کے اس دور

کیا ۱۴۰۰ سال بعد بھی ہم اس قابل ہیں کہ اس عظیم کارِ خیر کا حصہ بن سکیں

بچے بھی بہت ہوشیار ہو چکے ہیں۔ ایک بچے نے اپنے گھر
تازہ ترین ہونے والی بحث سے نکلنے والا سوال اچانک
سے کر دیا کہ مس میرے بابا کہہ رہے تھے کہ آج
مواخات مدینہ دوبارہ کیوں نہیں ہو سکتی؟ مواخاتِ پاکستان یا
مواخات بنگلہ دیش کی صورت میں؟ ہم بھی تو آخر برما کے
لوگوں کو اپنے پاس بسا سکتے ہیں۔ (یہ سوال بحث میں اس بچے کے
نے اپنے باپ سے کیا تھا یعنی بچے کے دادا سے)

بچہ چھوٹا تھا، مگر سوال بڑا۔ پھر بھی میں نے بچے کو آسان
مثال دے کر کافی باتیں سمجھائیں کہ سرحدیں کھولنا حکومتوں کا
کام ہے لیکن ہمیں چاہیے کہ ہم جو کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں۔
مثلاً، مالی امداد، میڈیا پر چلائی جانے والی امدادی مہم اور وغیرہ
وغیرہ۔

گھر آ کر بھی ذہن اُلجھا ہوا ہی رہا کہ کیا ۱۴۰۰ سال
گزرنے کے بعد ہم آج کے مسلمان اس قابل ہیں کہ
مواخات مدینہ کو دُہرا سکیں۔ کیا ہم اتنی آسانی سے اپنے گھر،
کاروبار، مال میں کسی کو حصہ دار بنا سکتے ہیں؟

مشکل کام ہے، دماغ نے چپکے سے کہا۔ میں نے بھی
تکیے میں منہ گھسایا اور جانے کب سو گئی۔ صبح ویسے ہی ہنگامہ خیز
تھی مگر کچھ نئی خبریں بھی تھیں کہ پاکستان نے بھارت اور بنگلہ
دیش سے معاہدات کیے ہیں کہ برمیوں کی ایک خاص تعداد
سرحد عبور کر کے پاکستان آ سکتی ہے۔ معاہدات پر فوری عمل
درآمد ہونا تھا۔ ساتھ ہی مختلف شہروں میں ''ادارہ برائے بحالی
متاثرین'' کا افتتاح تھا۔

مواخات مدینہ مجھے ہمیشہ بھاتا تھا اور ہمیشہ حیران کرتا
رہا۔ آج پتا نہیں کیوں دل چاہا کہ اُس پر عمل بھی کر کے
دیکھیں۔ ہمیشہ کی طرح میرے دلائل کے آگے شوہر صاحب
ہار گئے۔ طے یہ پایا کہ ہم حکومت کے قائم کردہ اداروں میں
باقاعدہ درخواست کریں گے کہ ہم کچھ لوگوں کو بسانا چاہتے ہیں۔
بالآخر اس ساری جدوجہد کے بعد حاجیما اور سلطانہ ہمارے
گھر آ گئیں۔ ساتھ چھوٹا عبدالرزاق بھی تھا۔

میرے دونوں بچوں کے بیرونِ ملک بسنے کے بعد
میرے شوہر مجھے گھریلو معاملات میں مکمل آزادی و خودمختاری
دے چکے۔ ویسے بھی وہ اپنے بزنس کے سلسلے میں زیادہ تر سفر
میں رہتے ہیں۔ گھر آنے کے بعد بھی زیادہ تر اپنے کمرے
میں ہی رہتے ہیں (وہ بھی چھٹی کے دن) ورنہ اپنے شہر میں بھی
ان کا زیادہ وقت دفتر میں بھی بسر ہوتا ہے۔ خیر یہ بات بتانے
کا مقصد یہ ہے کہ بڑی مہاجرین سے ان کی کوئی خاص
ملاقات نہ ہو سکی۔ سوائے یہ کہ وہ ایک دفعہ پانچ سالہ
عبدالرزاق سے مل لیے۔

گھر چونکہ پرانے نقشے کا بنا ہوا ہے تو صحن کے پرلی
طرف بھی دو کمرے ہیں جو حاجیما فیملی کو دے دیے گئے۔
حاجیما کا چہرہ ستا ہی رہا (باوجود یہ کہ وہ اب محفوظ ہاتھوں میں
تھی) سات سالہ سلطانہ اور پانچ سالہ عبدالرزاق سہمے ہوئے
ہی رہتے۔ میرا دل گردہ نہ تھا کہ اشاروں کنایوں میں ہی سہی
ہجرت کا احوال پوچھتی۔

میں اُن بچوں کے لیے کتابیں لے آئی تاکہ حاجیما اور
بچے کچھ سیکھ سکیں اور ہمارے درمیان بات چیت کے لیے کوئی
راہ ہموار ہو۔ کیمپ میں حاجیما نے ٹوٹی پھوٹی اُردو بولنا سیکھی
تھی۔ میرا خیال تھا میں اس خاندان کو بہت آسانی کے ساتھ
اپنے گھر میں رکھ لوں گی، مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔

حاجیما زیادہ تر دیوار سے ٹیک لگائے خلاؤں میں گھورتی
رہتی۔ سلطانہ کتابوں میں لگی رہتی، جبکہ عبدالرزاق بے محابا
پورے گھر میں گھومتا پھرتا۔ حمیدہ، میری سالوں پرانی بوڑھی
ملازمہ میرے اسکول چلے جانے کے بعد گھر کے کام نمٹاتے
ہوئے ان لوگوں سے بات چیت کی کوشش میں لگی رہتی۔ وہ
اس کوشش میں کامیاب کیا ہوتی، اُلٹا روز واپسی پر مجھے
عبدالرزاق کی شکایتیں ملتیں۔ کبھی وہ میرے لگائے ہوئے
پودوں میں گھستا، کبھی پرندوں کے پنجرے میں مختلف چیزیں

ڈال دیتا، کبھی میری پالتو بلّی کو ستاتا، کبھی کچن کے دروازے کی کنڈی لگا کر حمیدہ کو اندر ہی بند کر دیتا۔ حمیدہ بھی ان لوگوں سے چڑنے لگی تھی۔ گونگوں جیسی ماں، عجیب ہونق سی بیٹی اور شیطان کا پرکالہ وہ بچہ۔ خیر میں روزانہ کچھ دیر کو حاجیما کے پاس جا بیٹھتی۔ وہ بھی ایک آدھ جملہ بولتی ورنہ خاموش رہتی۔ میں نے اُسے اپنے اسکول اور اپنی کلاس کی تصویریں دکھائیں اور اُسے اس بات پر راضی کرنے لگی کہ اس کے بچوں کو اسکول جانا چاہیے۔

سلطانہ انگلش کے ایک دو لفظ سمجھتی تھی مگر اسکول کے نام پر وہ سہم کر ماں کی گود میں دبک گئی۔ اور تو اور عبدالرزاق بھی ماں کی گود میں جا لیٹا۔ خیر! میں اپنے معمول کا وقت گزار کر اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ان تینوں کا کیا ہوگا؟ حاجیما گھر سے باہر قدم نکالنے کو تیار نہیں تھی۔ بچے اسکول کے نام سے ہی بدکتے تھے۔

خود حاجیما انھیں پڑھاتی تھی نہ ہی اپنے کمرے سے متعلق کوئی کام کرتی۔ میں نے حتی الامکان پیار سے سمجھایا، کمرے کی صفائی کر کے دکھائی مگر اس نے کسی کام میں دلچسپی نہیں لی۔ حمیدہ چاہے اُن کے کمرے کی صفائی کرے یا نہیں، انھیں اس سے کوئی غرض نہ ہوتی۔ ہاں سلطانہ ایک چیز سیکھ گئی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر جاتی اور چھت سے نیچے برابر والوں کے گھر میں جھانکتی۔ برابر کے گھر میں لمبی چوڑی فیملی تھی اور ہمہ وقت اُن کے صحن میں کوئی نہ کوئی موجود ہوتا۔ وہ خالی خالی نظروں سے انھیں دیکھا کرتی۔ جب وہ کھڑے کھڑے تھک جاتی تو نیچے لوٹ آتی۔

میں نے تو اُن لوگوں کے لیے کئی منصوبے بنائے تھے۔ اسکول میں بھی ساتھی ٹیچرز نے کئی مشورے دیے تھے، مگر حاجیما کی زود حسی، سلطانہ کی بددلی اور عبدالرزاق کی بے پناہ شرارتوں کی بنا پر عمل درآمد کسی مشورے اور منصوبے پر بھی نہ ہو سکا۔ کچھ میں بھی اُکتا گئی تھی۔

میری اپنی بے پناہ مصروفیات تھیں۔ پڑھانا، ملنا ملانا، سوشل میڈیا پر ان رہنا، ایک مخصوص طرزِ زندگی پر اپنے شب و روز گزارنا (بچوں کے باہر جانے کے بعد تو میں اپنے معمولات پر سختی سے عمل کرتی ہوں) گھر میں ایک تنکے کا بھی اِدھر سے اُدھر ہلنا مجھے ناپسند تھا۔

کل رات بھی مانو (میری پالتو بلی) جب ٹہلتے ٹہلتے پچھلے صحن کی طرف چلی گئی تو مجھے اس کے پیچھے جانا پڑا۔ اُف! وہی اُداس اور پژمردہ منظر، حاجیما دیوار سے ٹیک لگائے آنسو بہا رہی تھی۔ سلطانہ کی نظریں کتاب پر اور ذہن نجانے کہاں تھا اور عبدالرزاق اس نے جیسے ہی مانو کو اپنے کمرے کی طرف آتا دیکھا تو بھاگ کے آگے آیا اور گھما کے ایک لات اُسے ماری کہ مانو میرے قدموں میں آ پڑی۔

میرا دماغ ایسا گھوما کہ میں نے رخ کے ایک تھپڑ اس کے پھول جیسے گال پر دے مارا۔ طمانچے کی آواز پر حاجیما کے اندر کوئی خاص جنبش نہیں ہوئی۔ عبدالرزاق خود ہی بھاگتا ہوا جا کر اس کی گود میں گر گیا۔ میں نے مڑتے مڑتے ایک نظر حاجیما پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں خشک اور پتھرائی ہوئی تھیں۔ ان میں اتنی خشکی اور ویرانی تھی کہ کیا کسی بے آب و گیاہ صحرا میں ہوگی۔ سلطانہ بھی ٹکر ٹکر مجھے دیکھ رہی تھی۔ حاجیما کی آنکھیں خشک تھیں تو سلطانہ کی آنکھیں تر۔ سلطانہ کی آنکھیں صحرا بن گئی تھیں تو سلطانہ کی آنکھیں سمندر بن رہی تھیں۔ آنسو، آنسو اور آنسو۔ پانی تھا کہ آنکھوں سے بہتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ساکت تھی مگر اس کی آنکھیں کام کر رہی تھیں۔

میرا دل جو ٹھوس تھا (اور میں اس پر فخر کرتی تھی کہ وہ ٹھوس ہے)۔ میاں کا گھر کو وقت نہ دینے پر، بچوں کے باہر جا بسنے پر، کئی کئی دن اکیلے گزار دینے پر میرا دل لیکن مضبوط ہی رہتا کیونکہ مجھے مضبوط عورتیں اچھی لگتی ہیں اور مجھے ان ہی جیسی بننا تھا۔ ایسی مضبوط عورتیں جو اپنے لیے جیتی ہیں اور کسی کا غم دل سے نہیں لگاتیں) مگر یہ آج کیا ہوا کہ یہ ٹھوس دل سلطانہ کی

وں نہیں اُمڈ آنے والے سمندر کی وجہ سے ٹھوس سے مائع بدیل ہوا جا رہا تھا۔ آج میں نے وہ کام کیا جو حاجیما اینڈ دا پنے ہاں لا کر بسانے کے بعد سے آج تک نہ کیا تھا۔

یونکہ میں سمجھتی تھی کہ حاجیما کو بھی مضبوط ہونا چاہیے ں طرح۔ ٹھیک ہے وہ آگ کے دریا سے ہو کر آئی ہے۔ اب تو آگے بڑھے۔ زندگی کو برتے۔ مجھے جمود سے جتنی رت تھی، سلطانہ اور حاجیما اتنی ہی جامد۔ حاجیما کو دیکھ کر مجھے وں کی تعریف یاد آتی اور سلطانہ کو دیکھ کر سکوت کی۔

خیر! وہ کام پتا ہے کیا تھا؟ وہ تھا پوری قوت سے حاجیما کو لگانے کا اور اُسی پل نجانے کیا ہوا کہ حاجیما کا جمود ٹوٹ یا۔ وہ ایسا روئی اور آنسوؤں کی برکھا ایسے برسی کہ لگا اب انگن ڈوب جائے گا۔ وہ میرے سینے میں منہ چھپا کے روتی ں اور آج مجھے اُمن کی ہجرت کے دکھ سے آشنائی ہوئی۔ آج ادل بھی بھر آیا۔ سلطانہ بھی جانے کب ہم سے آ کر لپٹ گئی ی۔

اووف!...... یہ تھا مواخاتِ مدینہ...... ایسے ہی انصار نے گلے لگایا ہوگا مہاجرین کو...... ایسے ہی تڑپ کر ان کے نسو پونچھے ہوں گے۔ ایسے ہی ان کو سینوں میں منہ چھپا کر رو بہنے دیا ہوگا۔

پھر انھیں ان کے آنسوؤں کے سمندر کے پار لا کر انھیں محبت سے بسانے کی کوشش کی ہوگی۔ میں تو پندرہ سال مواخاتِ مدینہ پڑھا رہی ہوں مگر اس کی روح کو آج سمجھی انصار نے مہاجرین کا دکھ محسوس کیا ہوگا؟ اس دکھ کی تڑپ، ن تکلیف کو خود بھی مہاجرین کے ساتھ قطرہ قطرہ پیا ہوگا۔ ت کیا ہوتی ہے؟ کسی کے لیے امرت کسی کے لیے زہر کا ۔ یہ سب جانا ہوگا پھر اپنے مہاجرین بھائیوں کو یہ سب ان گھر، جان و مال کی امداد دی ہوگی۔

میں نے ان لوگوں کے لیے کیا ہی کیا تھا؟ ان کے دکھ و دل کی گہرائیوں سے محسوس کیا نہ تھا۔ اپنے تمام وسائل استعمال کرتے ہوئے انھیں گھر میں جگہ دینا آسان کام تھا مگر ان کے دل میں گڑے کانٹے نکالنا۔ ہجرت کی خون ریزی سے روح میں لگے زخموں کی رفوگری کرنا، اپنے پیاروں کو یاد کر کے اُن کے موتی جیسے آنسوؤں کو چُننا۔ ان کو اپنے سینوں سے لگا کر ان کو سسکیاں بھرتے رہنے دینا تاکہ دکھ کے کوہِ گراں جو اُن کی روح میں منجمد ہو گئے ہیں وہ پگھل سکیں۔ یہ سب کام مشکل تھے میں نے ہمیشہ کی طرح آسان کام کیے تھے اور مشکل کام چھوڑ بیٹھی تھی۔

وہ آنسوؤں کی رات تھی۔ دکھ بہ نکلنے کی راہ تھی، منجمد ٹیسوں پر بے حسی کی پڑی برف کے پگھلنے کی رات تھی۔ حاجیما اب پُرسکون تھی اور میں بھی۔ اس نے تو ہجرت سے یقیناً بہت کچھ سیکھا ہی ہوگا مگر میں مواخاتِ مدینہ کی روح کو سمجھ چکی تھی۔

ٹرن، ٹرن، ٹرن...... میرا الارم زور و شور سے بج رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اُٹھی تو میری پلکیں گیلی تھیں۔ اُف! کیا میں خواب دیکھ رہی تھی؟ برما کے بارے میں سوچتے سوچتے سوگئی تھی اور ایسا ہی خواب دیکھ ڈالا۔

۱۴۰۰ سال گزر چکے ہیں ہم لوگ تو اب شاید کسی بھی قسم کی مواخات کے قابل نہیں رہے ہیں مگر ہم اتنا سا بھی نہیں کر سکتے ہیں کہ اپنا بے حسی کا چولا اُتار کر برما، کشمیر، فلسطین، بوسنیا کے باسیوں کا دکھ محسوس کر سکیں؟ کسی بھی فورم پر ہم جو کر سکتے ہوں وہ کر گزریں۔ جہاد باللسان جہاد بالقلم، جہاد بالمال...... ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا ہے مگر یہ سب ہوگا جب ہی جب ہم اپنی محسوس کرنے کی حس کو پھر سے آکسیجن فراہم کریں گے اس لیے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کا درد محسوس کرنے کی حس ہمارے اندر تقریباً مر چکی۔

آئیں اس حس کو جگائیں اور مواخاتِ مدینہ جیسے عظیم فلسفے کی انتہا پر جا کر نہیں تو اس کی ابتداء پر ہی عمل پیرا ہو جائیں۔

☆☆☆

ایک انگریز کلرک نے

اسلامی ہندوستان

پر کیونکر قبضہ جمایا؟

(دوسرا حصہ)

تاریخ کے اوراق سے سبق آموز اور ڈرامائی باب کی ناقابلِ فراموش داستان

سید عاصم محمود

کا نوجوان ڈاکٹر فرنسوا برنیئر سیر و سیاحت پسند کرتا تھا، چنانچہ 1655ء میں وہ اپنے وطن سے نکلا اور عرب ممالک کی سیر کرتا 1658ء میں ہندوستان پہنچا۔ اِس دیس کی خوبصورتی اور اَمارت نے اُسے مسحور کر دیا۔ وہ پھر انیس سال تک ہندوستان میں مقیم رہا۔ اِس دوران برنیئر نے شہزادہ دارشکوہ اور مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ذاتی معالج جیسے اہم فرائض بھی انجام دیے۔ وطن واپس جا کر برنیئر نے ایک سفرنامہ لکھا۔ وہ لکھتا ہے ''ہندوستان دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ وہاں سونا، چاندی ہُن کی طرح برستا ہے۔''

سترہویں صدی کے خوشحال ہندوستانی

فرانسیسی ڈاکٹر نے اسلامی ہندوستان کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ اُس زمانے میں ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی معاشی قوت بن چکا تھا۔ اُس نے صنعتی و زرعی ترقی میں چین اور یورپ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہاں خوش حالی کا دور دَورہ تھا۔ عوام اچھا کھاتے پیتے، عمدہ لباس زیب تن کرتے اور آرام دہ گھروں میں رہتے تھے، لیکن 1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد پہلے خانہ جنگیوں اور پھر انگریز تاجروں کی سازشوں نے ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آفتاب کو گہن لگا دیا۔ انگریز تاجروں نے ہندوستان پر جس عیاری و مکاری سے قبضہ کیا، اس کی داستان ڈرامائی اور سبق آموز ہے۔

اہم ترین بات یہ کہ انگریز تاجر ہندوستان پر قبضہ کرتے ہی وہاں لُوٹ مار کرنے لگے۔ وہ ہندوستان کی دولت سمیٹ کر برطانیہ لے گئے۔ اِسی دولت سے پہلے برطانیہ اور پھر دیگر یورپی ممالک میں صنعتی انقلاب کا آغاز ہوا۔ دورِ جدید میں امریکا، برطانیہ اور سبھی یورپی ممالک میں ساری خوش حالی اور ترقی اسی صنعتی انقلاب کی مرہونِ منت ہے۔

ہندوستان کی دولت جب برطانیہ پہنچی، تو وہاں سائنس و ٹیکنالوجی کی ترقی کے لیے وافر سرمایہ دستیاب ہو گیا، چنانچہ برطانیہ میں نت نئی ایجادات کا سیلاب آ گیا جنہوں نے صنعتی انقلاب برپا کرنے میں مدد دی۔ مغربی ممالک آج بھی سائنس و ٹیکنالوجی کے میدان میں سب سے آگے ہیں۔ وہاں عدل و انصاف اور قانون کی حکمرانی کا راج ہے۔ عوام کو سہولیات میسر ہیں۔ اِسی باعث پاکستان ہی نہیں، کئی اسلامی ممالک میں آباد نوجوان یورپی ملک میں جانے کے لیے بے تاب رہتے ہیں، لیکن یہ سکّے کا ایک رُخ ہے۔

دوسرا بھیانک رُخ یہ ہے کہ مغربی ممالک میں تمام تر خوش حالی و ترقی ہندوستان، چین اور اَفریقی و جنوبی امریکی ممالک کے وسائل لُوٹ کر عمل میں آئی۔ مغربی ملک استعماری طاقتیں ہیں جنہوں نے سازشوں اور جدید اسلحے کے بل بوتے پر ہندوستان جیسے ملکوں پر قبضہ کیا، وہاں کی دولت لُوٹی اور اَپنے آپ کو خوش حال اور ترقی یافتہ بنا لیا۔ برطانیہ، امریکا اور یورپی طاقتوں کی ترقی دراصل لُوٹ مار، چوری اور ڈاکے ڈالنے کا نتیجہ ہے۔ اِس ترقی میں مغربی سائنس دانوں، دانش وروں اور فلسفیوں کی ذہانت بہت بعد میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ آغاز میں انگریزوں سمیت سبھی مغربی ہمیں مکار، دھوکے باز اَور سازشی دکھائی دیتے ہیں۔

یورپ کا تاریک دور

شمارہ اگست میں شائع شدہ مضمون ''ڈوبتے جہاز کے فرسٹ کلاس مسافر'' میں ہم تفصیل سے بتا چکے کہ مغربی قوتوں نے ہندوستان اور ایشیائی ممالک کا رخ کیوں کیا۔ 1400ء سے قبل اندلس کو چھوڑ کر بقیہ یورپی ممالک میں غربت و افلاس کا دور دَورہ تھا۔ وہاں صرف آبادی کا ایک فی صد حکمران و ایلیٹ طبقہ آرام و آسائش کی زندگی گزارتا۔ بقیہ لوگ اچھی

غذا، اچھے لباس اور عمدہ رہائش سے محروم تھے۔ وہ عموماً جانوروں کی طرح زندگی گزارتے۔ یہ زمانہ یورپی تاریخ میں ''تاریک دور'' (Dark age) کہلاتا ہے۔

اسی زمانے میں اندلس، ہندوستان، ایران، ترکی، مصر، انڈونیشیا، شام، مراکش، تیونس، سوڈان اور نائیجیریا کے اسلامی ممالک معاشی قوت کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہاں آبادی کا بیشتر حصہ پُرآسائش زندگی گزارتا تھا۔ چین اور جاپان کا شمار بھی بڑی معاشی قوتوں میں ہوتا۔ تب امریکا کا تو وجود ہی نہ تھا۔ برطانیہ، جرمنی اور فرانس بھی علاقائی طاقتیں تھیں۔ اِن طاقتوں نے صلیبی جنگوں کے دوران اسلامی علاقوں میں لُوٹ مار سے مال بنایا تھا۔

یورپی تاجروں پر ٹیکس لگ گئے

صورتِ حال میں بڑی تبدیلی 1453ء سے آئی جب ترک عثمانی مسلمانوں نے قسطنطنیہ فتح کرلیا۔ یہ شہر ایشیا اور یورپ کے مابین بین الاقوامی تجارت کا مرکز تھا۔ ایشیائی اور یورپی تاجر وہیں اپنا مال لاکر خرید و فروخت کرتے تھے۔ قبل ازیں یہ شہر بازنطینی حکمرانوں کے قبضے میں تھا۔ وہ یورپی تاجروں پر بہت کم ٹیکس لگاتے تھے۔ اسی لیے یورپی تاجروں کے لیے تجارت منافع بخش تھی، مگر عثمانی سلاطین نے یورپی تجار پر ٹیکسوں کی شرح بڑھادی۔ اس سے یورپی تاجر بہت جزبز ہوئے۔

یورپی تاجروں نے پھر ایشیائی مال و اسباب کی قیمتیں بڑھا دیں جن میں گندم، چاول، شکر، چائے، مسالے اور ملبوسات جیسی عام استعمال کی اشیا بھی شامل تھیں۔ ان اشیا کی قیمتیں بڑھنے سے یورپی ممالک میں مہنگائی نے جنم لیا اور عوام میں بے چینی پھیل گئی۔ وہ اپنے حکمرانوں پر تنقید کرنے لگے۔ عوامی تنقید سے اس خطرے نے جنم لیا کہ وہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرسکتے ہیں، چنانچہ ہر یورپی حکمران مہنگائی کم کرنے کے اقدامات کرنے لگا۔

دوسری اہم تبدیلی 1490ء میں سامنے آئی جب اندلس سے اسلامی حکومت ختم ہوگئی۔ اس کی جگہ دو عیسائی ریاستیں پُرتگال اور اسپین وجود میں آئیں۔ اِن ریاستوں کے حکمران مسلمانوں کے دشمن تھے کہ طویل عرصے سے مسلم حکمرانوں سے جنگیں لڑ رہے تھے۔ اب وہ اسلامی ممالک پر حملہ کرکے اپنے انتقام کی پیاس بجھانا چاہتے تھے۔

معاشی پہلو یہ تھا کہ انھیں ایشیا پہنچنے والے ایسے راستے کی تلاش تھی جو قسطنطنیہ کو بائی پاس کرتے ہوئے انھیں وہاں پہنچا دے۔ اِس طرح پُرتگالی اور ہسپانوی تاجر مال و اسباب فروخت کرنے والے ایشیائی ملکوں تک پہنچ جاتے۔ وہ پھر ان سے سامان خرید کر یورپی منڈیوں میں فروخت کرتے، تو منافع کئی گنا بڑھ جاتا، کیونکہ نہ صرف ایشائی تاجر درمیان سے نکل جاتے بلکہ قسطنطنیہ میں عائد ٹیکسوں سے بھی نجات ملتی۔

دورِ استعمار کا آغاز

مذہبی اور معاشی مقاصد مدِنظر رکھ کر پُرتگالی اور ہسپانوی ایشیا تک پہنچنے والے راستے کی تلاش میں سمندروں میں نکل کھڑے ہوئے۔ 1520ء تک اُنھوں نے نہ صرف راستہ تلاش کرلیا، بلکہ وہ شمالی اور جنوبی امریکا دریافت کرنے میں کامیاب بھی رہے۔ انھیں معلوم ہوا کہ براعظم افریقا کے نیچے سے گزر کر ایشیا پہنچنا ممکن ہے۔

جلد ہی پُرتگالی اور ہسپانوی بحری جہازوں پر توپیں لاد اور ہاتھوں میں توڑے دار بندوقیں تھام کر ایشیا، افریقا شمالی و جنوبی امریکا کے علاقوں پر دھاوا بولنے لگے۔ وہاں اُنھوں نے اپنی چوکیاں بنائیں اور مقامی آبادی کو غلام بنالیا۔ پھر دونوں یورپی طاقتیں ان علاقوں کے وسائل لُوٹ کر اپنے ملکوں میں لے جانے لگیں۔ اس طرح مغربی نے ''استعماریت'' کا آغاز کردیا۔ اُنھوں نے نوآبادیوں میں زبردستی عیسائیت پھیلائی۔ جن قبائل نے اطاعت نہیں کی، اُن پر بے انتہا مظالم ڈھائے۔ افریقی و ایشیائی ساحلی علاقوں

پرآباد مسلمان بھی اُن کے ظلم کا نشانہ بنے۔

1556ء کے بعد مگر پروٹسٹنٹ برطانیہ اور کیتھولک پُرتگال و اَسپین کے مابین مذہبی جنگ چھڑ گئی۔ اگلی نصف صدی تک برطانیہ و ہالینڈ اور پُرتگال و اَسپین کے مابین زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ انھی جنگوں کے دوران برطانوی اور ولندیزی مہم جوؤں نے بھی ایشیا پہنچنے کا بحری راستہ تلاش کر لیا۔

چنانچہ اپنے حکمرانوں کے آشیر باد سے برطانوی تجار نے 1600ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد رکھی۔ جلد ہی ولندیزی تاجروں نے بھی ڈچ ایسٹ انڈیا قائم کر لی۔ ابتداً ان کے قیام کا واحد مقصد یہی تھا کہ ایشیائی سامان خصوصاً مسالے، اشیائے خورونوش اور ملبوسات لا کر یورپی منڈیوں میں فروخت کیے جائیں۔ برطانوی و ولندیزی تاجر مسلمانوں سے مذہبی جنگ لڑنے کے خواہش مند نہیں تھے۔

ہندوستان، انڈونیشیا، ملائیشیا وغیرہ پہنچ کر مگر انھوں نے دیکھا کہ وہاں کے حکمران عسکری لحاظ سے کمزور ہیں۔ یہ دیکھ کر برطانوی اور ولندیزی تاجروں پر لالچ و ہوس غالب آ گئے۔ اُنھوں نے بھی عسکری طاقت اور ظلم کے بل بوتے پر انڈونیشیا و ملائیشیا میں اپنی نوآبادیاں قائم کر لیں۔

انڈونیشیا سے ولندیزیوں نے پُرتگالیوں کو مار بھگایا اور وہاں کے حاکم بن بیٹھے۔ حتیٰ کہ ان کی طاقت کے سامنے انگریزوں کی دال بھی نہ گل سکی۔ ولندیزی جلد جزائر ملایا کے وسائل لُوٹ کر ہالینڈ لے جانے لگے۔ نو دریافت دولت سے وہاں ''دورِ زریں'' شروع ہوا اور مملکت میں سائنس و ٹیکنالوجی اور فنونِ لطیفہ کی ترقی ہونے لگی۔ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی تو 1750ء کے بعد زوال پزیر ہو گئی، مگر ولندیزی حکومت نے 1945ء تک انڈونیشیا پر قبضہ برقرار رکھا۔ انڈونیشی سرزمین پر علمائے کرام کا ولندیزی استعمار کے خلاف زبردست جہاد اسلامی تاریخ میں ولولہ انگیز باب ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے بھی ابتداً انڈونیشیا کو اپنا مرکز بنایا

تھا، مگر جب انگریزوں کی ولندیزیوں سے لڑائیاں ہوئیں، تو وہ پیچھے ہٹ گئے۔ اُنھوں نے پھر ہندوستان پر توجہ مرکوز کر دی۔ یہ حکمتِ عملی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے بھاگوان، مگر ہندوستانی قوم کی خاطر تباہ کن ثابت ہوئی۔

ہندوستان میں مرکزی حکومت

ہندوستان میں زمانہ قدیم سے مختلف اقوام آباد ہیں۔ یہ سبھی اپنے مذاہب، رسوم، رواج، اقدار و روایات رکھتی ہیں۔ چندر گپت موریہ پہلا ہندوستانی حکمران ہے جس نے ہندوستان پر ایک بڑی سلطنت قائم کی۔ وہ شاید جین مت کا پیروکار تھا۔ اس کے پوتے، اشوک اعظم نے سلطنت کو دورِ عروج میں پہنچا دیا، مگر اشوک کے مرتے ہی ہندوستان میں کئی چھوٹی بڑی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔ جب افغان مسلمان ہندوستان پہنچے، تو وہ شمالی ہند میں اپنی حکومت بنانے میں کامیاب رہے۔

شیر شاہ سوری پہلا مسلمان حکمران ہے جس نے اپنے دور (1549ء تا 1554ء) میں اچھے نظامِ حکومت (گُڈ گورننس) کی طرح ڈالی۔ اُس نے افسر شاہی تشکیل دی۔ زرعی ٹیکسوں کا عوام دوست نظام وضع کیا۔ تجارتی ٹیکس ختم کر دیے۔ شاہراہیں اور بندرگاہیں تعمیر کرائیں۔ نیز کرنسی کا عمدہ نظام قائم کیا۔ آنے والے مغل بادشاہوں نے شیر شاہ سوری کے نظامِ حکومت کو بہتر بنایا۔ نتیجتاً ہندوستان دنیا کی معاشی و عسکری سپر پاور بن گیا۔

زراعت میں ترقی سے ملک میں کپاس، اون اور ریشم خوب پیدا ہونے لگی۔ اسی دوران دنیائے عرب سے مختلف ایجادات مثلاً آبی پر، چرخہ، تکلا، کھڈی وغیرہ ہندوستان آ پہنچیں۔ انھوں نے صنعت و حرفت کو ترقی دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ مغل بادشاہوں پر اکثر یہ الزام لگتا ہے کہ اُنھوں نے یونیورسٹیاں قائم نہیں کیں اور عمارتیں تعمیر کرنے میں لگے رہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے، مگر یہ بھی واضح رہے کہ مغلیہ سلطنت میں مدارس جابجا پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں دینی و دُنیاوی، دونوں اقسام کی تعلیم دی جاتی تھی۔

مغلوں کا عمدہ انتظامِ حکومت

شیر شاہ سوری۔۔۔ایک غیر معمولی حکمران

اکبرِ اعظم کے دور (آغاز 1556ء) سے لے کر اورنگ زیب عالمگیر کی وفات (1707ء) تک مغل بادشاہوں نے گُڈ گورننس کو یقینی بنایا اور عوام سے نسلی، لسانی یا مذہبی طور پر کوئی امتیاز نہیں برتا۔ دورِ جدید میں انتہا پسند ہندو تنظیم ''آر ایس ایس'' کے مورخین اورنگ زیب کو ہندو دشمن قرار دیتے ہیں، لیکن خود غیر جانب دار ماننے والے بھارتی مورخین کا کہنا ہے کہ اورنگ زیب مذہبی نہیں سیاسی وجوہ کی بنا پر غیر مسلم حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ حقیقت میں اُن کی افسر شاہی میں کئی ہندو افسر شامل تھے۔ نیز اُنھوں نے مندر بنائے اور ان کے اخراجات برداشت کیے۔ مزید

برآں کسی مغل بادشاہ نے بت پرستوں کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا۔ یہ تو انتہا پسند ہندو راہنما ہیں جنہوں نے انیسویں صدی سے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریکیں (سنگھٹن، گھر واپسی) کا آغاز کیا۔

سپر پاور ہندوستان

پروفیسر انگوس میڈیسن (متوفی 2010ء) برطانیہ کے مشہور معاشیات دان گزرے ہیں۔ وہ اپنی کتاب "The World Economy: Historical Statistics" میں لکھتے ہیں کہ "1600ء میں دنیا کی 22 فی صد مصنوعات (جی ڈی پی) ہندوستان میں پیدا ہو رہی تھیں۔ 1700ء تک یہ عدد 24 فی صد تک پہنچ گیا۔ یوں ہندوستان کا جی ڈی پی چین اور یورپ سے بھی بڑھ گیا۔" گویا 1700ء تک ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی معاشی طاقت بن چکا تھا۔ یہی مقام آج امریکا کو حاصل ہے۔ ہندوستان کو یہ اعزاز مغل مسلمان حکمرانوں کی گڈ گورننس کے ذریعے ہی ملا۔ انھوں نے ہندوستان کی بکھری اقوام کو یکجا کیا اور مملکت کو سپر پاور بنا دیا۔

امریکا کے بھارتی نژاد مؤرخ پرنسان پرتھا سرتھی اپنی کتاب "Why Europe grew rich and Asia did not" میں لکھتے ہیں "1600ء کے بعد اگلے ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان مینوفیکچرنگ کے شعبے میں عالمی لیڈر رہا۔ دنیا کی 25 فی صد صنعتی پیداوار وہاں جنم لیتی تھی۔ مغل دورِ حکومت میں ہندوستان کے جی ڈی پی میں جتنا اضافہ ہوا، وہ پچھلے ڈیڑھ ہزار برس میں دیکھنے کو نہیں ملا تھا۔"

یہ بھی واضح رہے کہ اشوک اعظم کے بعد اورنگ زیب عالمگیر واحد ہندوستانی حکمران ہیں جن کی سلطنت تقریباً پورے برصغیر پر پھیلی ہوئی تھی۔ اسی لیے کئی مسلم مؤرخین اورنگ زیب کو اکبرِ اعظم سے زیادہ بڑا مغل حکمران قرار دیتے ہیں۔

مغل دورِ حکومت کو زرعی ٹیکسوں سے بیشتر آمدن ہوتی تھی، مگر کسان کو پیداوار کا نصف سے زائد حصہ مل جاتا۔ اس لیے وہ بھی خوش اور مطمئن تھا۔ کسان بڑی تعداد میں گندم، چاول، جو، کپاس، تیل اور افیون اُگانے لگے۔ اُنھوں نے اون اور ریشم تیار کرنے کے طریقے بھی سیکھ لیے۔

کپاس، اون اور ریشم کی پیداوار بڑھنے سے ہندوستان میں ٹیکسٹائل کی صنعت نے جنم لیا۔ ہندوستانی ہنرمند خام مال کی فراوانی کے باعث قسم قسم کے کپڑے تیار کرنے لگے۔ 1700ء تک ہندوستان میں دنیا کا 25 فی صد کپڑا بنایا جا رہا تھا۔ جاپان سے لے کر امریکا تک ہندوستانی کپڑے کی مانگ تھی۔ یورپ میں تو ہندوستان سے آنے والے سوتی، ریشمی اور اُونی ملبوسات پر ہی فیشن کا دارومدار تھا۔

کپڑے اور ملبوسات کے علاوہ دھاگا، ریشم، پٹ سن کی مصنوعات، بحری جہاز، دھاتی اشیا، شکر، گھی اور مکھن بھی ہندوستان کی اہم برآمدی اشیا تھیں۔ بعد ازاں ان مصنوعات میں مسالے، مرچیں، تیل اور شورہ (Saltpetre) بھی شامل

ہوگئے۔ شورہ گولہ بارود بنانے میں استعمال ہوتا تھا۔

مؤرخین لکھتے ہیں کہ 1700ء سے 1800ء تک برطانیہ کی ''90 فی صد'' درآمدات ہندوستان سے آئیں۔ جبکہ ولندیزی بھی 40 فی صد درآمدات ہندوستان سے منگواتے رہے، لیکن ہندوستان میں یورپی اشیا کی مانگ بہت کم تھی۔ ہندوستان صرف یورپ کے بنے اونی ملبوسات، دھاتیں اور کچھ آرائشی اشیا ہی خریدتے تھے۔

ہندوستانی تاجر اور مال کے مالکان طلائی اور چاندی کے سکّے لے کر اپنا سامان فروخت کرتے تھے۔ اسی لیے 1650ء سے 1750ء کے دوران ہزارہا ٹن سونا، چاندی یورپ سے ہندوستان منتقل ہوا۔ طلائی و نقرئی سکّوں کی بھرمار نے ہندوستان میں نہ صرف بڑے طبقے کو امیر کبیر بنایا بلکہ وہاں پتّیوں یا جدید معنی میں بینکاروں کا نیا طبقہ پیدا ہوگیا۔

امیر ترین صوبہ

مغل حکومت میں بنگال سلطنت کا امیر ترین صوبہ تھا۔ جب اکبر کے دور میں یہ علاقہ مغل سلطنت کا حصّہ بنا، تو مغلوں نے وسیع پیمانے پر وہاں درخت کٹوائے اور کھیت قائم کر دیے۔ کھیتوں میں کام کرنے کی غرض سے ہندوستان بھر سے کسان لائے گئے۔ یوں بنگال میں زراعت نے جنم لیا جو تیزی سے پروان چڑھنے لگی۔ بعدازاں زرخیزی کے سبب اورنگ زیب نے بنگال کو ''اقوامِ عالم کی جنت'' قرار دیا۔

اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں حکومت کو 50 فی صد آمدن بنگال سے ہوتی تھی۔ یورپی ممالک جانے والے 50 فی صد ملبوسات اور 80 فی صد ریشمی کپڑے بنگال ہی سے جاتے تھے۔ مزید برآں اسی صوبے میں شورے کے سب سے بڑے ذخائر واقع تھے۔

ہم حصّہ اوّل میں بیان کر چکے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام میں ایک دولت مند تاجر، تھامس اسمتھ نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس نے 1608ء میں ہیکٹر نامی ایک جہاز ہندوستان بھجوایا جس کا کمانڈر سر ولیم ہاکنز تھا۔ ولیم ہاکنز 1612ء تک ہندوستان میں مقیم رہا۔ اس کی کوششوں سے مغل بادشاہ جہانگیر نے کمپنی کو 1611ء میں مچھلی پٹنم (خلیج بنگال) اور 1612ء میں سورت (گجرات) میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

انگریز تجارت کرتے ہوئے مغل حکومت کو مطلوبہ ٹیکس ادا کرتے تھے، اس لیے اُن سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا۔ چنانچہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیاں بڑھتی چلی گئیں۔ 1640ء میں انھوں نے مدراس (چنائے) میں تجارتی کوٹھی کھول لی۔ اسی دوران فرانسیسی اور ڈینش تاجر بھی ہندوستان آپہنچے تاکہ ہندوستانی مال و اسباب یورپ لے جا کر فروخت کریں اور اچھا منافع کمائیں۔

1680ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کو احساس ہوا کہ ہندوستان میں بنگال تجارتی و کاروباری سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اگر وہاں کمپنی کی کوٹھیاں قائم ہو جائیں، تو منافع میں کئی گنا اضافہ ہوسکتا تھا۔ یہ خیال مزید پروان چڑھا، تو کمپنی کا گورنر، سر جوشوا چائلڈ بنگال پر قبضے کے خواب دیکھنے لگا۔

جاہ طلب انگریز سرمایہ کار

جوشوا چائلڈ ایک تاجر کا بیٹا تھا۔ وراثت میں اُسے جو دولت ملی، اُسے وہ سود پر دینے لگا۔ اس کے گاہکوں میں برطانوی بادشاہوں سے لے کر عام افراد شامل تھے، لہٰذا اُسے بَتّیا کہہ لیجیے یا جدید زبان میں بینکار۔ اس کاروبار سے جوشوا کو خوب دولت ملی۔ اُس کا شمار اپنے وقت کے امیر ترین انگریزوں میں ہونے لگا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جوشوا ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصص خریدتا رہا۔ آخرکار وہ کمپنی کے سب سے زیادہ حصص کا مالک بن گیا۔ اس بنیاد پر وہ پہلے کمپنی کا ڈائریکٹر بنا، پھر ڈپٹی گورنر اور آخرکار 1681ء میں گورنر یا سی ای او بن گیا۔ اب وہ کمپنی

کو ذاتی جاگیر کی طرح چلانے لگا۔

جوشوا چائلڈ اپنے پیش رو، سر تھامس اسمتھ کی عین ضد تھا۔ تھامس ایک مخیر اور نیک نام ہستی تھا، مگر جوشوا لالچی اور مکار شخصیت کا مالک تھا۔ اسی لالچ نے اُسے بنگال پر قبضہ کرنے پر اُکسا دیا۔ اس کو برطانوی بحری قوت پر بہت غرور تھا۔ طاقت کے بل بوتے پر ہی اُس نے بنگال پر قبضے کا منصوبہ بنا لیا۔

پلان کے مطابق جوشوا چائلڈ نے بنگال کے مغل گورنر، شائستہ خان کو یہ درخواست بھجوائی کہ وہ ہیگلی شہر میں ایک قلعہ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ شائستہ خان نے انکار کر دیا۔ البتہ یہ پیغام بھجوایا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی شہر میں تجارتی کوٹھی بنا سکتی ہے۔ شائستہ خان ایک جہاں دیدہ اور تجربے کار حکمران تھا۔ شاہ جہان کی بیگم، ملکہ ممتاز محل اُس کی بہن جبکہ ملکہ نور جہاں پھوپھی تھی۔ لہٰذا اُسے احساس ہو گیا کہ کمپنی کے انگریز تاجر بنگال میں قلعہ بنا کر کوئی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں۔

جوشوا چائلڈ کا منصوبہ مگر یہی تھا کہ شائستہ خان کے انکار کو بنیاد بنا کر بنگال پر حملہ کر دیا جائے۔ 1885ء میں جیمز دوم بادشاہ بن گیا۔ یہ جوشوا چائلڈ کے زیر اثر تھا۔ جوشوا کی فرمائش پر برطانوی بادشاہ نے بارہ جہازوں پر مشتمل ایک جنگی بیڑا بنگال روانہ کر دیا۔ اس پر چھے سو فوجی سوار تھے۔ یہ تب تک مشرق جانے والا برطانیہ کا سب سے بڑا بیڑا تھا۔

موسم نے منصوبہ ناکام بنا دیا

منصوبہ یہ تھا کہ مدراس سے بھی کمپنی کے تین جہاز اس جنگی بیڑے میں شامل ہو جائیں۔ یہ بیڑا پھر چٹاگانگ بندرگاہ پر حملہ کر کے اُسے اپنے قبضے میں کر لے۔ بعد ازاں شاہ اراکان کی مدد سے انگریز پورے صوبہ بنگال پر قبضہ کر لیتے، مگر موسم کی خرابی سے جوشوا چائلڈ کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ سمندری طوفان نے کئی جہازوں کو نقصان پہنچایا اور ان پر لگی توپیں قابلِ استعمال نہیں رہیں۔

کمپنی اور مغل حکومت کے مابین لڑائی پھر وقفے وقفے سے جاری رہی۔ برطانیہ سے بادشاہ کمپنی کی فوج کو کمک بھجواتا رہا۔ 1688ء میں انگریزوں نے حج پر جانے والے حاجیوں کے جہاز پر قبضہ کر لیا۔ اس حرکت سے اورنگ زیب عالمگیر شدید طیش میں آ گئے۔ اُن کے حکم سے پورے ہندوستان میں کمپنی کی تمام کوٹھیاں بند کر دی گئیں جبکہ وہاں موجود سامان ضبط کر لیا گیا۔ کمپنی صرف مدراس اور بمبئی تک محدود ہو گئی۔

1689ء میں مغل بحری بیڑے نے بمبئی کا محاصرہ کر لیا۔ اِس بیڑے کی کمان یاقوت خان کے ہاتھوں میں تھی۔ محاصرہ ایک سال جاری رہا۔ اسی دوران بمبئی میں قحط پڑ گیا۔ کئی سو انگریز مارے گئے۔ آخر کمپنی نے ہتھیار ڈال دیے۔ یوں بنگال پر قبضے کا جو خواب سر جوشوا چائلڈ نے دیکھا تھا، وہ آئینے کی طرح چکنا چُور ہو گیا۔

انگریزوں کو اورنگ زیب عالمگیر کے قدموں میں سر جھکا کر معافی مانگنا پڑی۔ نیز کمپنی نے ڈیڑھ لاکھ روپے بطورِ تاوان ادا کیے۔ رحم دل مغل بادشاہ نے انگریز تاجروں کو

معاف کر دیا۔ اِس جنگ میں انگریزوں کو ذلت و رُسوائی ہوئی تھی۔ اِسی لیے انگریز مؤرخین سرسری انداز میں اِس جنگ کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی ایک شرط یہ تھی کہ جوشوا چائلڈ کو بطورِ کمپنی گورنر ہٹا دیا جائے۔ یوں مغرور و متکبر جوشوا کو استعفیٰ دینا پڑا۔

جوشوا کو ملی رسوائی

شکست کھانے سے لندن میں جوشوا چائلڈ کا اثر و رسوخ ختم ہو گیا۔ وہ پھر اپنے گھر پر ہی بیشتر وقت گزارنے لگا اور نو سال بعد چل بسا۔ یہ شخص اِس امر کا حامی تھا کہ برطانیہ کے فقیروں، چوروں اور قاتلوں کو نو آبادیوں میں بھجوا دیا جائے۔ چنانچہ حکومت نے اس کی پالیسی پر عمل کیا۔ آج امریکا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ وغیرہ میں آباد اکثر انگریزوں کے اجداد چور، ڈاکو اور قاتل تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر نے کمپنی کو ہندوستان میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ کمپنی کو دریائے ہگلی پر ہیگلی شہر سے کچھ دور ایک نئی کوٹھی تعمیر کرنے کی اجازت بھی مل گئی۔ یہ کوٹھی بعد ازاں فورٹ ولیم کہلائی اور آج ''کلکتہ'' کہلاتی ہے۔

اورنگ زیب کی غلطی پر

یہ واضح رہے کہ اورنگ زیب عالمگیر ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان سے نکال دیتے، تو آج شاید اس ملک کی تاریخ مختلف ہوتی۔ بعض مؤرخین کے نزدیک مغل بادشاہ نے کمپنی کو ہندوستان ٹھہرنے کی اجازت دے کر غلطی کر ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کو جنگ سے معلوم ہو گیا کہ انگریز تاجر عیار، سازشی اور لالچی ہیں۔ وہ روپیہ کمانے اور منافع بڑھانے کے چکر میں کوئی بھی غلط قدم اُٹھا سکتے ہیں، لہٰذا اُنھیں کم از کم کمپنی کو مزید کوٹھیاں بنانے کی اجازت نہیں دینی چاہیے تھی۔ فورٹ ولیم کی کوٹھی تو بعد ازاں اتنی اہم ہو گئی کہ اسی کے ذریعے کمپنی ہندوستان سے اسلامی حکومت ختم کرنے میں کامیاب رہی۔

1707ء میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغل شہزادوں میں اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی کے باعث کئی علاقوں کے گورنر خود مختار ہو گئے۔ یوں مغل سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ کا آغاز ہوا۔ 1717ء میں کمپنی کے ڈاکٹر ہملٹن نے مغل بادشاہ، فرخ سیر کو ایک مرض سے چھٹکارا دِلا دیا۔ اِس معمولی علاج سے خوش ہو کر بادشاہ نے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں کمپنی کی تجارت پر عائد سارے ٹیکس معاف کر دیے۔ نیز اُسے کئی مراعات دیں۔ مثلاً کمپنی کو سکّے ڈھالنے کی اجازت مل گئی۔ نیز یہ کہ وہ مخصوص جگہوں پر زمینیں خرید سکتی ہے۔ فرخ سیر کی مراعات کمپنی کے لیے چھپڑ پھاڑ کر ملی دولت کے مصداق تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے بنگال میں اس کی تجارت کئی گنا بڑھ گئی۔

اس زمانے میں مرشد قلی خان گورنر بنگال تھے۔ اُنھیں یہ پسند نہیں آیا کہ ایک غیر ملکی تجارتی کمپنی کو اتنی زیادہ سہولتیں دے دی گئیں۔ اُنھوں نے کافی احتجاج کیا، مگر شاہی فرمان پر عمل درآمد کرانے کی اجازت دے دی۔ یہی وجہ ہے صوبے

ہیں کمپنی کا اثرورسوخ بڑھتا چلا گیا۔

بنگال کے جگت سیٹھ

بین الاقوامی تجارت کا مرکز بننے سے بہرحال صوبہ بنگال کو بھی مالی طور پر فوائد پہنچے۔ صوبے میں روپے پیسے کی ریل پیل ہوگئی۔ اس صوبے سے مغل حکومت کو سب سے زیادہ آمدن ہونے لگی۔ جبکہ عالمی تجارت نے بنگال کے گورنروں کو جو نواب کہلائے، اُس زمانے کے امیر ترین حکمرانوں میں شامل کر دیا۔ بنگال میں اسی تجارت کے باعث دولت مند بنیے بھی سامنے آئے جن میں نمایاں ترین جگت سیٹھ کا خاندان تھا۔ یہ تب دنیا کا امیر ترین بینکار خاندان تھا۔

ہندوستان میں جاری خانہ جنگی سے فائدہ اُٹھا کر یورپی تاجر بھی ہندوستان میں اپنی نوآبادیاں قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اسی باعث برطانوی اور فرانسیسی تجارتی کمپنیوں کے مابین ٹکراؤ ہوگیا۔ ہندوستان میں دونوں کمپنیوں کی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ کمپنیوں نے مقامی افراد کو بطور سپاہی بھرتی کیا اور اُنھیں بندوقیں اور توپیں چلانے کی تربیت دی۔ اس طرح اُنھوں نے تربیت یافتہ اور جدید اسلحے سے لیس لشکر تیار کر لیے۔ باہمی لڑائیوں نے اُنھیں تجربے کار بھی بنا دیا۔ یہ امر بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے معاون ثابت ہوا۔

فرانسیسی اور برطانوی تاجروں کی لڑائیوں ہی سے وہ شخصیت سامنے آئی جس نے ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور انگریز تاجروں کو مسلمانوں اور غیرمسلموں کا حاکم بنا دیا۔ اس کا نام رابرٹ کلائیو ہے۔

کلرک سے افسری تک

رابرٹ کلائیو بچپن سے لڑاکا اور جھگڑالو تھا۔ جیسے تیسے بنیادی تعلیم پائی، تو وکیل باپ نے اپنے اثرورسوخ سے اُسے 1744ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی میں بطور کلرک بھرتی کرا دیا۔ جب فرانسیسی تجارتی کمپنی سے لڑائیاں شروع ہوئیں، تو کلائیو نے اِن میں سرگرمی سے حصّہ لیا۔ اس پر کمپنی نے اُسے پہلے سپاہی پھر فوجی افسر بنا دیا۔ کلائیو نے بہ حیثیت افسر خاصی رقم کمائی اور 1753ء میں واپس برطانیہ چلا گیا۔ وہاں عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کے باعث اپنی ساری دولت گنوا بیٹھا۔ چنانچہ روپیہ کمانے وہ پھر ہندوستان چلا آیا۔ اِس بار اُسے تامل ناڈو میں واقع کمپنی کے تجارتی مرکز، کڈالور میں نائب گورنر بنایا گیا۔ وہیں جون 1756ء میں اُسے اطلاع ملی کہ نواب سراج الدولہ نے قاسم بازار اور کلکتہ کی تجارتی کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔

کانٹوں کا حکومتی تاج

سراج الدولہ بنگال کے پانچویں نواب تھے جو اپریل 1756ء میں مسند نشیں ہوئے۔ وہ سابقہ نواب، علی وردی خان کے نواسے تھے۔ انھیں لاڈ پیار سے پالا گیا تھا، اس لیے اپنی مرضی کرنا پسند کرتے۔ انتظامِ حکومت کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا کہ صرف 23 سال کی عمر میں حاکم بن گئے۔ مزید برآں

حکمران بنتے ہی اُنھیں قریبی رشتے داروں کی سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔

نواب کی خالہ، گھسیٹی بیگم اپنے دوسرے بھانجے، شوکت جنگ کو نواب بنگال بنانا چاہتی تھی۔ دربار کے بعض سرکردہ سردار بھی سراج الدولہ کے مخالف تھے جن کا قائد میر جعفر تھا۔ یہ علی وردی خان کا ساتھی تھا۔ علی وردی نے اس سے اپنی سوتیلی بہن کی شادی کرادی۔ یوں وہ بھی شاہی خاندان کا حصّہ بن گیا۔

علی وردی خان اقتدار کے آخری برسوں میں بڑھاپے کی وجہ سے حکومتی معاملات سے لاتعلق ہوگئے تھے۔ اس امر سے فائدہ اُٹھا کر کئی علاقوں میں سردار خودمختار ہوگئے اور سرکاری ٹیکسوں کی رقم خورد برد کرنے لگے۔ ان میں ڈھاکا کا ہندو دیوان، راجا راج بلبھ قابلِ ذکر ہے۔ یہ ڈھاکا میں مقیم گھسیٹی بیگم کا خاص کارندہ تھا۔ اسی دوران ایسٹ انڈیا کمپنی نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور کلکتہ میں اپنے مرکز، فورٹ ولیم میں توپیں نصب کردیں۔ نیز تجارتی معاملات میں گھپلے کرنے لگی۔

حکومتی نظام تبدیل ہوا

سراج الدولہ کو بہرحال ساری صورتِ حال کی خبر تھی۔ اُن کے مشیر اُنھیں ریاستی معاملات سے خاصی حد تک باخبر رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے، حکومت سنبھالتے ہی اُنھوں نے کرپٹ سرداروں سے چھٹکارا پانے اور کمپنی کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ وہ انگریز تاجروں کو مکار اور لالچی سمجھتے تھے۔ یہ تاجر غیر قانونی تجارت میں بھی ملوث تھے۔

اُنھوں نے میر مدن کو میر جعفر کی جگہ ریاستی افواج کا سربراہ بنا دیا۔ جبکہ ایک وفادار غیر مسلم، موہن لال کو وزیرِ اعظم (دیوان) مقرر کیا۔ وہ جگت سیٹھ کا اثر و رسوخ بھی کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ جگت سیٹھ جین مت کے پیروکار تھے۔ سراج الدولہ کو یقین تھا کہ وہ سرکاری خزانے کی

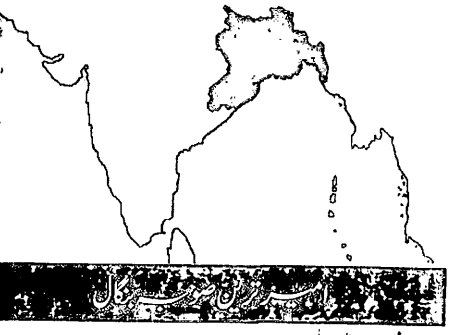

خرد برد میں ملوث ہیں۔

غرض سراج الدولہ نے حکومت سنبھالتے ہی انتظ
مملکت کے وہ مہرے تبدیل کردیے جو کئی برس سے اپنی جگ
براجمان تھے۔ کرپشن کی بدولت اُنھوں نے کثیر دولت جمع
لی تھی۔ سراج الدولہ کی آمد سے اُنھوں نے اپنی آمدن ا
اثر و رسوخ کم ہوتا دیکھا، تو وہ قدرتاً نواب سے ناراض
گئے۔ اِس صورتِ حال سے انگریز تاجروں نے فائدہ اُٹھایا
کمپنی نے دراصل ریاستی صدر مقام، مرشد آباد میں
اپنے خفیہ ایجنٹ چھوڑ رکھے تھے۔ انھی سے تاجروں کو علم ہوا
کہ دربار میں نواب کے کئی دشمن سرگرم ہیں اور یہ کہ اس
حکومت زیادہ مضبوط نہیں۔ یہی وجہ ہے کمپنی نے سرا
الدولہ کو خاطر میں نہ لانے کا فیصلہ کرلیا۔

ہمیں اپنا نواب چاہیے

مئی 1656ء میں نواب نے فورٹ ولیم، کلکتہ میں ا
سفیر بھجوایا۔ انھوں نے گورنر راجر ڈریک کے سامنے تی
مطالبات رکھے۔ اوّل یہ کہ کمپنی بنگال میں اپنی تمام کوٹھیو
سے توپیں ہٹا دے۔ نیز جو خندقیں کھودی گئی ہیں، وہ بھی خ
کردی جائیں۔ دوم یہ کہ انگریز تاجروں نے تجارت کے
غیر قانونی دھندے جاری رکھے ہوئے ہیں، وہ ختم کر د
جائیں۔ سوم یہ کہ حکومت کے جن باغیوں اور کرپٹ سردارو

نے کمپنی کی کوٹھیوں میں پناہ لی ہے، اُنھیں واپس کیا جائے۔

منصوبے کے مطابق راجر ڈریک نے سفیر سے ہتک آمیز سلوک کیا اور اُسے کہا ''نواب ہمارے دربار میں آ کر حاضری دے، ورنہ ہم نیا نواب مقرر کرلیں گے۔'' اس بات سے قدرتاً سراج الدولہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُنھوں نے فوراً لشکر تیار کیا اور قاسم بازار و کلکتہ پر حملہ کر کے کمپنی کے تجارتی مراکز پر قبضہ کرلیا۔ ڈریک فورٹ ولیم چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

کمپنی کے انگریز تاجر مگر نواب کی خراب پوزیشن اور اپنے جدید اسلحے کی وجہ سے سراج الدولہ سے مفاہمت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے کلکتہ پر قابض ہونے کی خاطر فوج بھجوانے کا فیصلہ کیا۔ اس فوج کا سربراہ رابرٹ کلائیو کو بنایا گیا۔ یہ فوج مدراس سے اکتوبر 1756ء میں روانہ ہوئی جو ہندوستان میں کمپنی کا ہیڈکوارٹر تھا۔ بحری فوج کی کمان ایڈمرل چارلس واٹسن کر رہا تھا۔ جنوری 1757ء میں یہ فوج کلکتہ پر قبضہ کرنے میں کامیاب رہی۔ رابرٹ کلائیو کو کمپنی کی فوج کا سربراہ خاص وجہ سے بنایا گیا۔ ہندوستان میں کمپنی کے تمام انگریز افسر منظم یا تاجر تھے۔ انھیں لڑائی کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ جبکہ عام انگریز فوجی جاہل اور موالی ہوتے۔ وہ زیادہ تنخواہ کے لالچ میں ہندوستان آ جاتے۔ ہندوستان میں نفسیات کمپنی کے افسروں میں رابرٹ کلائیو واحد افسر تھا جو تجارت کے علاوہ جنگ و جدل کے امور میں بھی طاق ہو چکا تھا۔ اسی لیے وہ کلرکی سے ترقی کر کے افسر بن گیا۔ اب ایک بہت بڑی مہم اس کی منتظم تھی۔

نواب سراج الدولہ کو انگریز فوج آنے کی خبر ملی، تو وہ لشکر لیے کلکتہ روانہ ہوئے۔ اِس لشکر میں بیشتر فوجی کرائے کے سپاہی تھے۔ اُن کے دلوں پہ توڑے دار بندوقوں کی دہشت بیٹھی ہوئی تھی۔ مشہور ہو چکا تھا کہ ایک دھماکے سے انسان کی جان چلی جاتی ہے۔ لشکر میں بہت کم سپاہی بغیر لڑے گولی کھا کر جان دینے کو تیار تھے۔

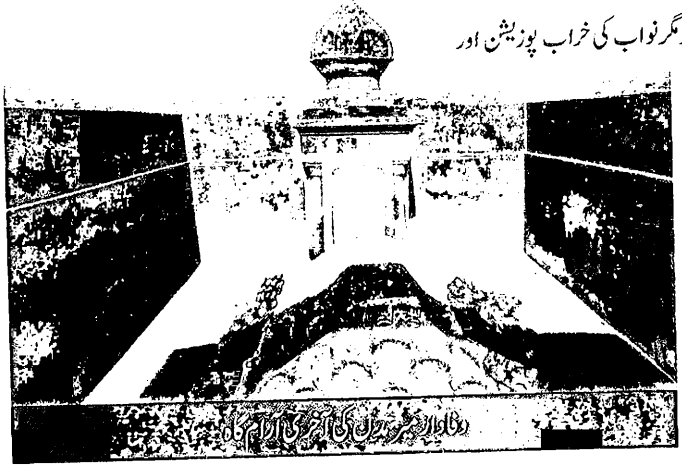

کمپنی کا پسندیدہ افسر

رابرٹ کلائیو بھی جانتا تھا کہ نواب کی فوج انگریزوں کے جدید اسلحے سے خائف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 3 فروری 1757ء کو صبح سویرے اُس نے نواب کے لشکر پر دھاوا بول دیا۔ انگریز فوج کی توپیں اور بندوقیں نواب کے سپاہیوں پر بارود اُگلنے لگیں۔ ریاستی لشکر میں بھی توپیں تھیں، مگر وہ زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئیں۔ انگریز فوج ریاستی لشکر کے پانچ سو فوجی مارنے میں کامیاب رہی اور پھر فورٹ ولیم میں جا چھپی۔ اس کے صرف ستاون سپاہی مارے گئے۔ یہ فوج تقریباً دو ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ جبکہ نواب کے لشکر میں

چالیس ہزار فوجی شامل تھے، مگر وہ حریف کو شکست نہیں دے سکے۔ جدید اسلحے کا فرق بہت نمایاں ہو کر سامنے آیا۔

کلکتے ہی میں نواب سراج الدولہ کو اطلاع ملی کہ احمد شاہ درانی نے دہلی کو ملیامیٹ کر ڈالا ہے۔ اب ممکن ہے کہ افغان حکمران بنگال کی سمت مارچ پاسٹ شروع کر دے۔ نواب کو محسوس ہوا کہ فی الوقت انگریز نہیں افغان ریاستی حکومت کے لیے بڑا خطرہ بن چکے۔ اسی لیے انھوں نے فوج کا بیشتر حصہ راجا رام نارائن کی زیرِ قیادت پٹنہ بھجوا دیا تاکہ وہ افغانوں کا حملہ روک سکے۔ اور اِدھر کمپنی سے معاہدہ جنگ بندی کر لیا۔ اُنھوں نے کمپنی کو بنگال میں تجارت کرنے کی دوبارہ اجازت دے دی۔

انگریزوں کی احسان فراموشی

انگریز تاجر مگر احسان مند ہونے کے بجائے نواب سراج الدولہ کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ اُنھوں نے اپنے دو ایجنٹ، ولیم واٹسن اور لیوک سکرافٹن مرشد آباد بھجوا دیے۔ دونوں بنگالی، ہندوستانی اور فارسی زبانیں روانی سے بولتے تھے۔ اُن کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ نواب سے برگشتہ ٹولے سے رابطہ کریں اور انھیں سراج الدولہ کے خلاف بغاوت پر اُبھاریں۔ چنانچہ مارچ تا مئی دونوں انگریز ایجنٹ مرشد آباد میں نواب کے مخالفین سے مل کر سراج الدولہ کی حکومت گرانے کے منصوبے بناتے رہے۔ اس سازشی ٹولے میں میر جعفر، جگت سیٹھ، کلکتہ کا ایک تاجر، امیر چند (امی چند) اور ریاستی فوج کے سردار شامل تھے۔

مئی 1757ء میں آخر کمپنی اور نواب مخالف گروہ کے مابین ایک معاہدہ طے پا گیا۔ معاہدے کے اہم نکات یہ تھے:

- سراج الدولہ کو ہٹا کر میر جعفر نواب بنگال بن جائے گا۔
- نواب بن کر میر جعفر کمپنی کو دس لاکھ پونڈ ادا کرے گا۔ یہ کلکتہ پر حملے کا معاوضہ اور خرچۂ جنگ تھا۔
- میر جعفر پانچ لاکھ پونڈ کلکتہ کے برطانوی شہریوں کو ادا کرے گا۔
- دو لاکھ پونڈ کمپنی کے مقامی ملازمین کو دیے جائیں گے۔
- ستر ہزار پونڈ آرمینی تاجروں کو ملیں گے جن کا کلکتہ حملے میں نقصان ہوا تھا۔

چلاسی کا بدقسمت میدان

منصوبے کے مطابق وسط جون میں رابرٹ کلائیو اپنے لشکر سمیت مرشد آباد کی سمت بڑھا اور پلاسی نامی ایک میدان میں ڈیرے ڈال دیے۔ اس کی فوج ایک ہزار برطانوی اور اکیس سو مقامی فوجیوں پر مشتمل تھی۔ آٹھ بڑی توپیں ساتھ تھیں۔ سراج الدولہ کو اطلاع ملی، تو وہ بھی اپنا لشکر لیے پلاسی چلے آئے۔ ان کی فوج بیس ہزار گھڑسواروں اور پیالیس ہزار پیدل فوجیوں پر مشتمل تھی۔ پچاس چھوٹی توپیں تھیں جن میں سے کچھ فرانسیسی تجارتی چلا رہے تھے۔ نواب نے برطانوی کمپنی کے خلاف فرانسیسی کمپنی سے دوستانہ معاہدہ کر لیا تھا۔

23 جون 1757ء کو صبح آٹھ بجے لڑائی شروع ہوئی اور وقفے وقفے سے جاری رہی۔ پلان کے مطابق میر جعفر اور اس کے ہم نوا سرداروں کی 35 ہزار پیدل فوج اور 15 ہزار گھڑسوار لڑائی سے لاتعلق رہے۔ بقیہ فوجی موہن لال اور میر مدن کی زیرِ قیادت لڑتے رہے، تاہم ان میں جوش و جذبے اور تنظیم کا فقدان تھا۔ بہرحال نواب کے جاں نثاروں نے انگریزی توپوں اور بندوقوں کا سامنا ہمت و دلیری سے کیا۔ اُنھوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں، مگر پیٹھ نہیں دکھائی۔

رابرٹ کلائیو کو اتنے سخت مقابلے کی توقع نہیں تھی۔ سہ پہر تک اس کی فوج کے 22 فوجی مر چکے تھے جبکہ 50 زخمی ہو گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ رات کو پسپا ہو جائے، لیکن اسی وقت میر مدن گولہ لگنے سے شہید ہو گئے۔ جلد ہی موہن لال اور دیگر وفادار سردار بھی مارے گئے۔ اس امر نے نواب کی فوج میں

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

سراسیمگی اور بددلی پھیلا دی۔

اس ہنگامے میں میر جعفر نے نواب سراج الدولہ کو صلاح دی کہ پسپا ہو کر مرشد آباد میں دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ نواب نے یہ تجویز قبول کر کے فوج کو مرشد آباد جانے کا حکم دے دیا۔ یہ مگر ایک سازش تھی۔ کمپنی کی فوج نواب کے واپس ہوتے فوجیوں پر فائرنگ کرنے لگی۔ نواب کی فوج میں افراتفری پھیلی اور وہ تتر بتر ہوگئی۔ سراج الدولہ مرشد آباد پہنچے اور پھر وہاں سے پٹنہ کا رخ کیا، تاہم راستے میں میر جعفر کے کارندوں نے انھیں شہید کر دیا۔

مسلمانوں کے قومی ہیرو

نواب سراج الدولہ فرشتہ نہیں تھے، ان میں بعض خامیاں موجود تھیں۔ وہ کچھ ضدی تھے اور جذباتی بھی۔ مصیبت آنے پر گھبرا جاتے۔ ان کی حکومت میں انٹیلی جنس کا شعبہ موثر نہیں تھا۔ اِس لیے آخر تک وہ دشمن و دوست میں تمیز نہیں کر سکے۔ اِن خامیوں کے باوجود نواب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی انگریز اور میر جعفر وغیرہ کی طرح دھوکے بازی اور مکاری سے کام نہیں لیا۔ وہ اپنی رعایا کا بھلا چاہتے اور حکومت مستحکم کرنا چاہتے تھے۔ اِس لیے اُنھوں نے بیک وقت کئی لوگوں کو اپنا دشمن بنالیا۔

یہ متنازع حکمتِ عملی تھی، تاہم سراج الدولہ نے مردانہ وار دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ وہ پٹنہ جا کر مقابلہ جاری رکھنا چاہتے تھے، مگر دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ آج بھی مسلمانانِ ہند مکار انگریزوں کے سامنے صف آرا ہونے پر سراج الدولہ کو اپنا ہیرو اور مردِ مجاہد قرار دیتے ہیں۔ جبکہ میر جعفر ''غدارِ اعظم'' کہلاتا ہے۔

اس طرح ایک سابقہ انگریز کلرک، رابرٹ کلائیو عیاری و مکاری سے ہندوستان کے امیر ترین صوبے، بنگال پر اپنا کٹھ پتلی نواب (میر جعفر) بنانے میں کامیاب رہا۔ کہا جاتا ہے کہ فتح کے بعد رابرٹ کلائیو کشتیوں کا جلوس لیے مرشد آباد سے کلکتہ روانہ ہوا تھا۔ تب انگریز قافلے کی ساری کشتیاں سونے چاندی کے سکوں اور ہیرے جواہرات سے بھری ہوئی تھی۔ یہ نوابانِ بنگال کا سرکاری خزانہ تھا جو کمپنی کے انگریزوں نے دن دیہاڑے لوٹ لیا۔ اسی خزانے نے رابرٹ کلائیو کو کنگال سے کروڑ پتی بنا دیا۔ اس نے انگلستان واپس پہنچ کر عالیشان محل خریدے اور پُرآسائش زندگی بسر کرنے لگا۔ مگر بڑھاپے میں ضمیر کے کچوکوں نے اُسے چین نہیں لینے دیا۔ آخرکار اس مکار

غدارِ اعظم میر جعفر

انسان نے سر میں گولی مار کر اپنا خاتمہ کر دیا۔

نواب کی شہادت سے ہندوستان پر کمپنی کی حکومت کا آغاز ہو گیا۔ جلد ہی بنگال انگریز تاجروں کے قبضے میں آ گیا۔ وہاں کی بے پناہ دولت سے کمپنی نے پھر زبردست فوج کھڑی کر لی۔ میسور کے شیروں، حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے زبردست مقابلہ کیا، لیکن وہاں بھی سازشوں، مکاری اور میر صادق جیسے غداروں کے ذریعے انگریز تجار نے کامیابی پائی۔ 1857ء سے قبل تقریباً پورا ہندوستان کمپنی کے زیرِ نگیں آ چکا تھا۔ یوں کمپنی کے انگریز ایجنٹوں نے بڑی عیاری و مکاری سے سونے کی چڑیا پر قبضہ کیا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت ختم کر ڈالی۔

انگریز مؤرخین کی چالاکی ملاحظہ فرمائیے کہ وہ جنگِ پلاسی کو اپنی ''عظیم''، ''انقلاب انگیز'' اور ''یادگار'' فتح قرار دیتے ہیں۔ حقیقت میں یہ جیت عسکری صلاحیتوں اور بہادری نہیں، دھوکے بازی اور عیاری کے بل بوتے پر حاصل کی گئی۔ یہ فتح انگریزوں کی تاریخ کا سیاہ باب ہے۔

کمپنی کی لوٹ مار

ہندوستان کے وسائل پر ڈاکہ ڈالنے کی خاطر کمپنی نے پھر مختلف ہتھکنڈے اختیار کیے۔ ایک معروف طریقِ واردات یہ تھا کہ جس علاقے پر انگریز قبضہ کرتے، وہاں کی آبادی پر بھاری ٹیکس ٹھونس دیتے۔ انھی ٹیکسوں کی رقم سے پھر مقامی افراد سے اونے پونے داموں پر خام مال خریدا جاتا۔ یہ خام مال برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں پہنچتا۔ اس مال سے مصنوعات تیار ہوتیں۔ وہ مصنوعات پھر یورپی ممالک اور ہندوستان میں مہنگے داموں فروخت ہوتیں۔

جب برطانیہ کسی جنگ میں کودتا، تو ہندوستانی قوم پر خراج بڑھا دیتا۔ ہندوستانی انھیں رقم اور فوج، دونوں مہیا کرتے۔ یہ بھی ہندوستانی وسائل لوٹنے کا طریق کار تھا جو دوسری جنگ عظیم تک جاری رہا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی افیون چین بھیج کر وہاں بھی ہانگ کانگ جیسی نوآبادیاں کھڑی کر لیں۔

سونے کی چڑیا کے وسائل بروئے کار لا کر ہی انگریزوں نے صرف دو سو برس میں ''انسانی تاریخ کی عظیم ترین سلطنت'' قائم کر لی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ ایک کروڑ پینتیس لاکھ مربع میل رقبے پر مشتمل تھی۔ یہ دنیا کا 26.53 فی صد رقبہ تھا۔ تبھی اس مثل نے جنم لیا کہ برٹش ایمپائر میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔

پہلے انگریز تاجروں اور پھر 1857ء سے برطانوی حکومت کے دورِ اقتدار نے ہندوستان کو سپر پاور سے ایک بھکاری مملکت میں بدل ڈالا۔ جب انگریز 1947ء میں رخصت ہوئے، تو دنیا کی پیداوار میں ہندوستان کا 25 فی صد حصہ کم ہو کر صرف 4 فی صد رہ گیا تھا۔ شہریوں کی آمدن میں بھی 60 فی صد کمی واقع ہوئی۔

پروفیسر اتسا پٹنائک بھارت کی ممتاز معاشیات دان ہیں۔ آپ نے تحقیق کے بعد افشا کیا کہ دو سو سال میں برطانوی ہندوستان سے 45 ہزار کھرب ڈالر (45 ٹریلین ڈالر) کا سرمایہ اور وسائل لوٹ کر برطانیہ لے گئے۔ یہ تاریخ انسانی کی سب سے بڑی ڈکیتی ہے جو انگریز کے ہاتھوں ظہور پزیر ہوئی۔ رقم کی وسعت کا اندازہ یوں لگائیے کہ پاکستان پر چڑھے کُل قرضوں کی مالیت سوا دو ہزار ارب ڈالر ہے۔

تیسری دنیا میں مغربی استعمار کی لوٹ مار آج بھی ختم نہیں ہوئی۔ اس نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے مانند آئی ایم ایف اور عالمی بینک جیسے ادارے قائم کر لیے۔ یہ ادارے پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کو قرضے دے کر پھر ان کی معاشی پالیسیاں کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان معاشی پالیسیوں سے عوام پر ٹیکسوں کا بوجھ پڑتا اور وہ ادھ موئے ہو جاتے ہیں۔ کمپنی کے انگریز تاجروں نے بھی اسی قسم کی معاشی پالیسیاں بنا کر ہندوستانی قوم پر ظلم ڈھائے تھے۔ افسوس دیسی حکمرانوں کے ادوار میں بھی عوام پر ظلم و ستم کا سلسلہ جاری ہے۔ ○○○

عافیہ مقبول جہانگیر

صائمہ سلیم اور نرجس ماؤلوالہ کا روشن سفر

انسان جب اپنا ایک ہدف متعین کر کے اس کے حصول کی کوشش میں تن من دھن کی بازی لگا دیتا ہے۔ خاص طور پر جب اسے یہ یقین ہو جائے کہ وہ جس ہدف کے حصول میں کوشاں ہے وہی ہدف صحیح ڈگر پر لے جانے والا ہے تو پھر چاہے اس کی راہ میں مضبوط سے مضبوط چٹان کیوں نہ حائل ہو جائے، وہ اسے چکنا چور کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہی عزم و استقلال اسے اس کامیابی سے ہمکنار کرواتا ہے جسے پھر دنیا سراہتی ہے۔

اور بات ہو اگر عورت کی ہمت و لگن کی، تو پھر راہ کی بڑی سے بڑی رُکاوٹ بھی عورت کے پایۂ استقلال کو کمزور نہیں بنا سکتی۔ وہ ماں ہے تو جنت ہے، بیٹی ہے تو رحمت ہے، بیوی ہے تو برکت ہے اور بہن ہے تو مرد کے لیے سراپا دعا ہے۔ سوچیے کہ جو صنف مردوں کے لیے اتنا مضبوط سہارا بننے کی اہلیت رکھتی ہو، کیونکہ اُسے کامیابی سے ہمکنار کروانے میں عورت کے انہی کرداروں کا ہاتھ ہوتا ہے تو جب یہی عورت، اپنے لیے کوئی راہ چُن کر کوئی فیصلہ کر لے اور اپنی منزل کا تعین کر کے اُس پر ڈٹ جائے تو پھر اُسے کامیابی کیسے نہ ملے؟

اُن باہمت خواتین کے سفرِ زیست کا تذکرہ جنہوں نے اپنے مقصد کے حصول کو ہی نصب العین بنالیا

اسلام نے بھی، خواتین کو جو مقام عطا کیا اور انھیں جو اہمیت دی، اس کی مثال دنیا کا کوئی دوسرا مذہب دینے سے قاصر ہے۔ ایک تعلیم یافتہ، باشعور اور باہمت عورت اللہ کا عطا کردہ بیش قیمت تحفہ ہے جس کی گود میں نسلیں پروان چڑھتی ہیں۔ مرد کو عظیم اور کامیاب بنانے والی عورت جب خود کوئی قابلِ فخر کارنامہ انجام دے تو اس پر محض اس کے گھر والوں کو ہی نہیں بلکہ پوری قوم کو فخر ہوتا ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ قومیں جن کی قسمت بنانے میں باہنر، باصلاحیت کامیاب خواتین بھی اپنا حصہ ڈالتیں اور ملک وقوم کا نام روشن کرتی ہیں۔ یہ صرف وہی جانتی ہیں کہ اس منزل کو پانے کے لیے انھیں کتنی صعوبتیں اُٹھانا پڑیں، کن کن جذباتی کیفیات سے گزرنا پڑا، کتنی راتوں کو جاگنا پڑا پھر کہیں جا کر انھیں منزل پر کامیاب و کامران پہنچنے کی نوید ملی۔

پاکستان کی ہیلن کیلر

ہم بطور خواتین عام طور پر یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ کامیابی کی راہ میں ہماری روزمرہ کی زندگی میں جن رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان پر قابو پانا مشکل ہے۔ ہم جس سرپرست معاشرہ میں رہتے ہیں اس میں آسانی سے کامیابی حاصل کر لینا بہت مشکل امر ہے، خصوصاً صنفِ نازک کے لیے۔ رکاوٹوں، پریشانیوں اور لوگوں کے منفی رویوں کی سوچیں ہمارا ذہن جکڑے رکھتی ہیں اور یہی چیز ہمیں اُونچی اُڑان تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ ان سب کے باوجود ہمارے ہی معاشرے میں کچھ ایسی خواتین بھی ہیں، جنھوں نے ان حدود و قیود کو اپنے راستے سے ہٹا دیا اور تمام راستے چمک اُٹھے۔ ایسی ہی ایک شاندار مثال کا نام صائمہ سلیم ہے جو اُمید کی ایک حقیقی روشنی ہے۔ ہماری قوم کے ہیروز میں سے ایک نام، جنھیں پاکستان کی ہیلن کیلر بھی کہا جاتا ہے، پاکستان کی پہلی نابینا سی ایس ایس آفیسر، ایک ایسی شخصیت جس سے ہم سب کو یہ سیکھنا چاہیے کہ اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کہ آپ کہاں ہیں؟ کیا کرتے ہیں اور منزل تک پہنچنے کے لیے آپ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ آپ کو بس اتنا کرنا ہے کہ آپ آگے بڑھیں اور ہار نہ مانیں۔

صائمہ نوعمری میں ہی جینیاتی بیماری، ریٹینائٹس پگمنٹوسا (Retinitis Pigmentosa) کی وجہ سے بصارت سے محروم ہوگئیں۔ اس کے بعد انھیں معاشرے سے الگ حصہ سمجھا جانے لگا۔ انھیں اسکول میں امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑا۔ انھیں عام بچوں کی فہرست سے باہر سمجھتے ہوئے بنیادی انسانی حقوق دینے سے انکار کر دیا گیا۔ یہ سب ایسا ہی تھا جو بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کے ہر معذور فرد کے ساتھ ہوتا ہے۔

پھر جب سب ہار مان چکے تھے..... اس نے ہار ماننے سے انکار کر دیا اور اس مشکل زندگی میں بھرپور ہمت کے ساتھ قدم رکھ دیا۔ اُس نے اپنی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں دُور کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ معذوروں جیسی، قابلِ رحم زندگی نہیں جینا چاہتی تھی۔ وسائل کی کمی، طے شدہ معاشرتی نظریات و پالیسیاں بھی اس کے عزم کو نہ روک سکیں۔ اس باہمت لڑکی نے زندگی میں کچھ غیر معمولی کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ وہ معذور افراد کے لیے معاشرے کی سوچ کو بدلنا چاہتی تھی۔ وہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ معذور فرد بھی پوری طرح سے معاشرے کا کامیاب اور باعزت شہری بن کر زندگی گزارنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ اس نے معذوری کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا اور اپنا مستقبل خود سنوارنے کی ٹھان لی۔ اُس نے وقت کو اپنی مٹھی میں قید کر لیا اور اس کے ہر لمحے سے مستفید ہونے لگی۔

صائمہ نے دل و جان سے اپنی تعلیم کا سفر جاری رکھا اور یوں وہ اپنے اسکول کی ممتاز طالب علم بن گئیں۔ انھوں نے کنیئر ڈ کالج یونیورسٹی برائے خواتین سے بیچلرز اور ماسٹرز میں طلائی تمغہ حاصل کیا۔ ان کے اصرار اور لگن کو دیکھتے ہوئے، پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار، ان کے تمام امتحانات بریل

میں لیے گئے۔ انھوں نے معاشرے کی فرسودہ روایات اور سوچ کے آگے جھکنے سے انکار کیا اور اپنے حقوق کے لیے سینہ سپر ہو کر جنگ لڑی۔ انھوں نے کسی کو بھی مصنف کا انتخاب کر کے روایتی انداز میں امتحانات دے کر اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا سسٹم اپنانے سے صاف انکار کر دیا۔ ماسٹرز میں بہترین کامیابی حاصل کرنے کے بعد، انھوں نے پاکستان کے پہلی بلائنڈ سول سرونٹ بننے کے لیے سی ایس ایس پیپرز میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔

ابھی ایک لمبا سفر ان کا منتظر تھا۔ مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں۔ امتحانات اور معاشرے کا بدصورت بے رحم رویہ ابھی مزید رکاوٹیں لیے ہوئے تھا۔ ہاتھ تھامنے کے بجائے راستے میں پتھر رکھنے والے کئی ہاتھ موجود تھے۔ ایف پی ایس سی نے اسے کمپیوٹر پر مبنی امتحان دینے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔

جب انھوں نے داخلہ لیا تو انھیں صرف چار پیشہ ور مضامین بطور انتخاب پیش کیے گئے: کامرس، اکاؤنٹس، ڈاک اور معلومات۔ ایک بار پھر وہ امتیازی سلوک کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں اور پاکستان کی خدمت کے لیے، غیر ملکی سروس میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اپنے خوابوں کی تعبیر پانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ انتھک محنت کے ساتھ ساتھ حکومت کو بھی قائل کر سکیں اور ان کی پالیسی تبدیل کرنے پر مجبور کریں۔ اُن کی کوششیں رنگ لائیں اور آخر کار انھیں میرٹ پر داخلہ مل گیا۔

دل و جان سے ساری تربیت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے فارن سروس اکیڈمی کے ذریعہ ایک اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اسکالرشپ حاصل کرنے کے بعد جنیوا میں اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مشن میں انسانی حقوق سے متعلق سیکریٹری کے طور پر بھی کام کیا۔

ملک میں انسانی حقوق میں بہتری لانے کے جذبے کی وجہ سے، وہ گزشتہ پانچ سالوں سے اس شعبہ میں کام کر رہی ہیں۔

اقوام متحدہ میں بطور نمائندہ پاکستان کی خدمت کرنا ان کی زندگی کا نصب العین بن چکا۔ انھوں نے سفرِ زیست کے ہر قدم پر بار بار یہ ثابت کیا ہے کہ بلاشبہ وہ پاکستان کے لیے باعثِ فخر ہیں۔ ایک ایسی عورت، جس نے انسانی حقوق کے حصول کے لیے ہر جنگ لڑی اور اس کی عدم روک تھام کا مقابلہ کرتے ہوئے تمام چیلنجوں پر قابو پایا، وہ کبھی اُمید کا دامن نہیں چھوڑ سکتی اور نہ ہی حالات سے مایوس ہوتی ہے۔

قارئین کو یہ جان کر بھی دلی مسرت محسوس ہوگی کہ صائمہ سلیم کے بھائی، یوسف سلیم پاکستان کے پہلے نابینا جج ہیں۔ انھوں نے ایل ایل بی (آنرز) میں پنجاب یونیورسٹی سے طلائی تمغہ جیتا۔ یوسف 6500 اُمیدواروں کے درمیان ہونے والے تحریری امتحانات میں ٹاپ پر رہے۔ وہ ان 21 افراد میں شامل ہیں جنھوں نے انٹرویو کے لیے کوالیفائی کیا۔ اپنے اندھے پن کی وجہ سے پہلے وہ انٹرویو میں ناکام رہے لیکن چیف جسٹس آف پاکستان میاں ثاقب نثار کی سفارش پر ان کی درخواست پر از سرِ نو غور کیا گیا اور پھر انھیں سول جج مقرر کیا گیا۔

ریٹینائٹس کیا ہے؟

یہ آنکھوں کی ایسی بیماری ہے جس میں انسان کو شروعات میں پہلے کم نظر آنا شروع ہوتا ہے اور پھر اس کے بعد وہ رات کے وقت مکمل طور پر دیکھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری جنیاتی ہے اور عموماً یہ بچپن میں ہی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ پیدائشی بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بیماری ہر 4 ہزار میں سے 1 فرد کو اپنا نشانہ بناتی ہے۔ اس کا علاج بہرحال ممکن نہیں کیونکہ اس میں آنکھ کے خلیات بری طرح متاثر ہو کر ختم ہو جاتے اور انسان مکمل طور پر اندھا ہو جاتا ہے۔ البتہ شروعات میں اس کی رفتار کم کرنے یا بطور علاج وٹامن اے زیادہ کھانے پر ڈاکٹر زور دیتے ہیں۔ اس روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہو سکتا ہے جسم میں یا خون میں وٹامن اے کی کمی یا

اس کا بالکل نہ ہونا بھی اس بیماری کی وجہ بن سکتا ہے یا اس کو بڑھاتا ہے۔

ہمارے معاشرے کی خواتین کے لیے حتمی رول ماڈل ہونے کے ناتے، یہ آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے افعال کی تعریف اسی سوچ کے ذریعے ہوتی ہے جو اذہان میں موجود ہو۔ باہمت خواتین اگر کچھ کر دکھانے کی ٹھان لیں تو رکاوٹیں اور حدود، کچھ بھی انھیں کامیاب ہونے یا کیریئر کے حصول سے نہیں روک سکتا۔

یہ حقیقت محض خواتین نہیں بلکہ مرد وزن دونوں کے لیے ہے کہ جو آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں اگر آپ صرف اس پر دھیان دیں، خود پر اور اپنی قابلیت پر بھروسا کریں اور امتیاز برتنے نہ دیں تو آپ دیکھیں گے کہ یقین آپ کی کامیابی کے راستے پر کھڑا آپ کو ملے گا۔

انسان کی منزل کہکشاں لیے باہمت پُرعزم ستاروں جیسی شخصیات کا بے صبری سے ہمیشہ انتظار کرتی ہے بس قدم اُٹھانے کی دیر ہے اور اگر بات ہی ستاروں اور خلا کی ہو تو ایک اور چمکتا دمکتا نام جو ذہن میں آرہا، وہ نرجس ماؤلوالا کا ہے۔

شاعروں نے اپنی شاعری میں جب بھی عورت کے حسن کی تعریف کی، تو کبھی اس کی آنکھوں کو ستارہ کہا، کبھی اس کے چہرے کو چاند سے شبیہہ دی، کسی نے گیتوں میں اپنی محبوبہ کو چاند پر لے جانے کی بات کہی تو کسی نے آسمان سے تارے توڑنے کی.....اور اگر وہی نازک اندام، صنف نازک خود تاروں کے جھرمٹ میں جا پہنچے تو اس کی تعریف میں آپ کیا کہیں گے؟

ابھی حال ہی میں ماہرین فلکیات کی ماہر پاکستان کی نرجس ماؤلوالہ کو ایم آئی ٹی کے اسکول آف سائنس کا نیا ڈین نامزد کیا گیا ہے۔ بلاشبہ وطن عزیز کے لیے یہ قابل فخر بات ہے۔ ہمارا وطن ایسے بے شمار نایاب جواہر سے مالا مال ہے جو پاکستان کی عزت وشہرت میں چار چاند لگانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ نرجس بھی انھی میں سے ایک ہیں۔

پاکستانی نژاد امریکی ماہر فلکیات نرجس ماؤلوالہ پاکستان کے شہر لاہور میں 1968ء کو پیدا ہوئیں مگر ان کا بچپن کراچی میں گزرا۔ اُن کی فطرت میں بچپن ہی سے وہ لڑکیوں والی خاص نزاکت، نخرے یا عادات نہیں تھیں۔ گاڑی خراب ہونے پر اکثر نرجس، کہنیوں کے بل خود گاڑی کا معائنہ کرتی اس کے نیچے گریس اور آئل میں لتھڑی ہوئی لیٹی پائی جاتیں۔ وہ موٹر سائیکل کی مرمت میں خود کو گم کر لیا کرتی۔ نرجس نے کانونٹ آف جیسس اینڈ کوئین میری اسکول سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسکول میں، ان کا ابتدا ہی سے ریاضی اور طبیعیات کی طرف رجحان رہا۔ ان کی خوش قسمتی یہ تھی اس کے والدین، بیٹیوں کی بہترین تعلیم کے حامی تھے۔ انھوں نے اپنی بیٹی کا قدم قدم پر بھرپور ساتھ دیا اور اُس نے والدین کی حمایت پا کر بیرون ملک کالج میں درخواست دے ڈالی اور نوعمری میں ہی میساچوسٹس میں واقع ویلسلے کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے امریکا چلی گئی۔ آیئے ایک نظر ان کے تعلیمی مدارج پر ڈالتے ہیں۔

انھوں نے 1990 میں طبیعیات اور فلکیات میں ویلسلے کالج سے بی اے کیا اور 1997 میں ایم آئی ٹی سے طبیعیات میں پی ایچ ڈی بھی مکمل کر لی۔ ایم آئی ٹی میں پی ایچ ڈی کا کام مکمل کرنے کے بعد وہ 1997 میں کال ٹیک کی حیثیت سے کالٹیک چلی گئیں جہاں انھوں نے کائناتی مائیکرو ویو کے پس منظر کا مطالعہ کیا۔ 2000 میں، وہ LIGO لیبارٹری میں عملے کے سائنسدان کی حیثیت سے شامل ہوگئیں۔ یہاں ایک نئی ہی دنیا آباد تھی۔ وہ اس میں کھو گئیں اور یہاں انھوں نے محققین کے ساتھ مل کر LITO کے ڈپٹی ڈائریکٹر بنانے کے لیے وائس گروپ کے ساتھ تعاون کیا۔ 2002 میں انھوں نے فزکس کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے فیکلٹی میں شمولیت اختیار کی۔

اس کے بعد انھوں نے ایم آئی ٹی LIGO گروپ بنانے میں اپنی تمام تر محنت اور قابلیت صرف کرنا شروع کر دی۔ جہاں انھوں نے انٹرفیومیٹر کے مختلف حصوں کو ڈیزائن اور بہتر بنانے کے لیے کام کیا۔ انھوں نے سائنس دانوں کی ایک ٹیم کے ساتھ مل کر کوانٹم اثرات کا مطالعہ کرنے والے اوزار تیار کرنے میں بھی مدد کی۔

ان کے مشیر، رینر ویز، جو اب طبیعات کے پروفیسر ہیں، اُس وقت گریوٹی کی لہروں کا پتا لگانے کے لیے انتھک محنت اور کام کر رہے تھے۔ بعد ازاں اس پراجیکٹ میں نرجس بھی شامل ہوگئیں۔ ان کے آجانے سے ویز کو اپنے پی ایچ ڈی تھیسس کے طور پر کشش ثقل کی لہر کا پتا لگانے والا ابتدائی پروٹو ٹائپ بنانے میں بہت مدد ملی۔ وہ نرجس کی ذہانت، قابلیت اور محنت کے قائل ہو گئے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ بہت جلد ان کا منصوبہ کامیاب ہو جائے گا۔ سنہ 2016 میں جب کشش ثقل کی لہروں کی پہلی براہ راست کھوج کی گئی تو یہ ایک تاریخی دریافت تھی۔ اس کی وجہ سے ہی ویز اور دیگر کارکنان نے طبیعات میں 2017 کا نوبل انعام جیتا۔ ایک نوبل انعام یافتہ کے ساتھ کام کا تجربہ حاصل کرنا اور اس کا اعتماد جیتنا بلاشبہ نرجس کے لیے بہت اہم تھا۔ تحقیق کی اس دنیا نے بلاشبہ ان کے لیے سائنس کی دنیا کی نئی جہتیں اور راہیں کھول دیں۔

اپنے کام اور قابلیت کے بارے میں پُراعتماد نرجس نے اس وقت ایک انٹرویو میں کہا تھا: ''ہم فلکیات کے لیے ایک نیا آلہ لا رہے ہیں۔ ہم نے ایک نئی حس کا رخ کیا ہے۔ ہم دیکھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب ہم سن بھی سکیں گے۔''

اسپیس ٹائم میں کشش ثقل کی لہروں کی موجودگی کی تصدیق 11 فروری 2016 میں ہوئی۔ اس کے پیچھے دنیا بھر کے ممتاز دماغوں کے ساتھ ساتھ نرجس کا زرخیز دماغ بھی شامل ہے۔ جس نے خلاء میں کشش ثقل کی لہروں کی موجودگی کی تصدیق کا اعلان کیا۔ دنیا بھر کے چوٹی کے دماغوں سے جڑے اس منصوبے کا نام لیگو سائنسی شراکت داری تھا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی راتوں رات نرجس پاکستانی آئیکون بن گئیں اور شہرت، کامیابی اور عزت باندیاں بن کر ان کی زندگی میں آگئیں۔ گزشتہ 20 سال سے اس شعبے سے وابستہ ماؤلوالہ 2002 سے تاحال ایم آئی ٹی سے منسلک ہیں۔

نرجس ماؤلوالہ کو تحقیق اور درس وتدریس کے میدان میں خدمات کے باعث کئی اعزازات سے نوازا جا چکا۔ وہ 2015 سے شعبۂ طبیعات کی ایسوسی ایٹ ہیڈ ہیں۔ وہ ایم آئی ٹی اسکول آف سائنس کی ڈین بننے والی پہلی خاتون ہوں گی۔

نرجس ماؤلوالہ اس حوالے سے کافی پُرجوش اور پُرامید ہیں۔ ان کے جوش وجذبے کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے اسکول اور انسٹیٹیوٹ کو مجموعی طور پر درپیش غیر معمولی چیلنج بھی تسلیم کیے ہیں اور وہ ان سے نمٹنے کے خود کو پوری طرح تیار کر چکی ہیں۔

ان کا کہنا ہے، ''ہم اس لمحے میں جی رہے جہاں بہت بڑی تبدیلیاں وجود میں آ رہی ہیں۔ ہم ایک عالمی وبا اور معاشی چیلنج کے وسط میں ہیں اور کم از کم امریکی تاریخ کے ایسے لمحے میں موجود ہیں جہاں نسلی اور سماجی انصاف مضبوط ہوتا ناگزیر ہے۔''

نرجس ماؤلوالہ کے مطابق، ''لیڈرشپ پوزیشن پر ہونے کا مطلب ہے کہ آپ کے پاس اہم اور پُرامید طور پر دیرپا اثرات مرتب کرنے کے مواقع موجود ہیں۔'' اپنے تحقیقی کام اور اس شعبے کے متعلق نرجس کا کہنا ہے:

''جغرافیائی اور ثقافتی فاصلوں سے زیادہ تر اور پیچیدہ ایل آئی جی او کے کام جیسے تجربے حاصل کرنے کے لیے مجھے سیکڑوں سائنس دانوں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ میں خوش قسمت ہوں کہ ڈین کا مقام پانے سے قبل میں نے ایسی تربیت حاصل کر لی جو میرے لیے بہت معاون ثابت ہوئی

کیونکہ اس کے لیے نہ صرف طبیعات کے مختلف شعبے بلکہ سائنس کے مختلف شعبوں میں پھیلاؤ اور ان کی زبان سیکھنا بھی ضروری ہے۔

''ایم آئی ٹی جدید سائنس کرنے کے لیے دنیا میں ایک اعلیٰ مقام ہے اور ہم اس وقار کو برقرار رکھیں گے۔ ساتھ ہی ہمیں تنوع کے معاملات، نسلی اور معاشرتی انصاف کے امور اور کام کی زندگی میں توازن کے معاملات پر بھی زور دینا ہوگا۔ میں جو کرنا چاہتی ہوں اس کا ایک حصہ، اور بہتر ایم آئی ٹی کے بارے میں میرے ویژن کا ایک حصہ، ان چیزوں کے ساتھ ساتھ توازن برقرار رکھنے کے لیے راستے تلاش کرنا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سب کرنا مشکل ہوگا، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں کوشش نہیں کرنی چاہیے۔''

کائنات میں کشش ثقل کی لہروں کی موجودگی کا اعلان کر کے پاکستانی خاتون سائنسدان نرجس ماؤلوالہ بھی آئن اسٹائن جیسے سائنس دانوں کی صف میں کھڑی ہو چکیں۔ ہماری کائنات کی خلائی لچک اور وسعت پر اولین نظریہ پیش کرنے والے سائنسدان آئن سٹائن تھے اور ان کی تھیوری پر اس وقت سے آج تک تحقیق کا کام جاری تھا، جس کی حال ہی میں مزید تصدیق ہوئی۔

نرجس ماؤلوالہ کو ملنے والے اعزازت میں 2010 میں میک آرتھر فیلوشپ شامل ہے۔ سن 2014 میں، سائنسدانوں اور تکنیکی پیشہ ور افراد نے انھیں سال کا سائنسدان تسلیم کیا۔ 2015 میں لیگیوٹیم کے ایک حصے کے طور پر بنیادی طبیعات میں خصوصی پیش رفت انعام اور 2017 میں انفارمیشن ٹیکنالوجی یونیورسٹی کے ذریعے پہلا لاہور ٹیکنالوجی ایوارڈ جیتا۔

ایک پاکستانی کا ایم آئی ٹی جیسے ادارے کا ڈین ہونا اپنے آپ میں ایک اعزاز ہے اور اگر وہ اعزاز ایک پاکستانی خاتون حاصل کرلے تو یقیناً وہ قوم کی دعاؤں، تالیوں اور خراجِ تحسین کی مستحق ہے۔ قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ نہ صرف پاکستان کو ان کی کامیابی پر فخر اور ان سے وابستہ ڈھیروں اُمیدیں ہیں، بلکہ خود ایم آئی ٹی کے صدر ایل رافائیل ریف کو بھی نرجس کی صلاحیتوں پر بے تحاشا اعتبار ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''بطور محقق اور ماہر تعلیم، نرجس ماؤلوالہ کے لیے فصاحت ان کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بطور ڈین ان کے تقرر سے متعلق ان میں موجود قائدانہ خصوصیات مجھے پُرجوش کرتی ہیں۔ وہ قابل ہیں، باہمی تعاون سے مسئلہ حل کرنے والی ایک عقلمند اور فیاض ساتھی، لاجواب سرپرست اور جامع امتیاز کی چیمپئن ہیں۔ جب ہم اس انتہائی غیر معمولی تعلیمی سال کے آغاز کی تیاری کر رہے ہیں تو مجھے یہ جان کر بہت سکون ملتا ہے کہ اسکول آف سائنس قابل ہاتھوں میں ہو گا۔ میں ان کے ساتھ کام کرنے اور سائنسی مواقع، متعدی تجسس، حقیقت پسند انداز اور عملی دانشمندی کے اس احساس سے مستفید ہونے کا منتظر ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ نرجس ماؤلوالہ کو مبارکباد دینے میں میرا ساتھ دیں گے کیونکہ وہ اس نئے کردار میں بطور قائد اپنے عظیم تحائف ساتھ لائیں گی۔''

بات چاہے صائمہ سلیم کی ہو، نرجس کی، شیریں مزاری، مسلسل شاندار کامیاب سفر میں مصروف فرزانہ شاہد ہوں یا شانِ پاکستان کی سی ای او ہما نصر۔ یہ تمام خواتین پاکستان کا سرمایہ ہیں اور ہماری نسلِ نو کی بہترین پرورش کی ضامن بھی۔ جس ملک و قوم کے معاشرے ایسی خواتین کا تعارف پیش کرتے ہوں، وہاں ایک کامیاب نئی پود کیسے جنم نہ لے گی؟

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشت خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اسی درج کا در مکنوں
مکالمات فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرار افلاطوں

بھٹو، ضیاء الحق اور دائیں بازو کے صحافی

رؤف طاہر

معاملہ دلائل کا ہو تو شامی صاحب سے جیتنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شعیب بن عزیز تو مزاحاً یہ بھی کہا کرتے ہیں کہ مؤکل کا کیس جتنا کمزور ہوگا، شامی صاحب اسے اتنی ہی زیادہ مضبوطی سے لڑیں گے اور یہاں تو شامی صاحب کا اپنا کیس تھا اور تھا بھی بہت مضبوط۔ شامی صاحب گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بی اے کرنے کے بعد ایل ایل بی کرنے کراچی گئے تھے لیکن پاکستانی صحافت کی قسمت میں کچھ اور بڑے ناموں کے ساتھ ایک ''شامی'' بھی لکھا تھا، سو مجیب الرحمٰن شامی ایڈووکیٹ کے بجائے جرنلسٹ بن گئے۔ کراچی کے سب سے بڑے ہفت روزے میں شامی صاحب کے انٹرویوز نے دھوم مچادی تھی۔ قریشی برادران نے لاہور سے اپنا ہفت روزہ نکالنے کا پروگرام بنایا تو اس کی مدیری کے لیے شامی صاحب ان کی جوہر شناس نگاہوں میں آگئے اور دل میں سما گئے۔ صلاحیت کے ساتھ قدرت نے انھیں جرأت و ہمت اور حوصلہ و ولولہ بھی وافر مقدار میں عطا کیا تھا۔ بھٹو صاحب کے (سول) مارشل لاء کا چوتھا مہینہ تھا کہ قریشی برادران کے ساتھ شامی صاحب بھی حوالۂ زنداں ہوئے۔ ''ڈان'' والے الطاف گوہر پہلے ہی جیل میں تھے (اور فرصت میں وہاں مولانا مودودیؒ کی تفہیم القرآن کے بعض حصوں کا ترجمہ کر رہے تھے)۔ چند دنوں بعد صلاح الدین (شہید) بھی ان کے ہم نشیں ہوگئے۔ اس دور کی سیاسی و نظریاتی اصطلاحات کے مطابق یہ سب ''دائیں بازو'' سے تھے۔ ''بائیں بازو'' کے حسین نقی اور ان کے سالے پنجاب پنچ کے پرنٹر مظفر قادر بھی عتاب شاہی سے بچ نہ سکے، ان پر بھی اسی روز (5/اپریل 1972ء) کو در زنداں کھلا۔ ''دلچسپ''

بات یہ کہ بھٹو صاحب کے آخری مہینوں میں بھی قریشی برادران اور شامی صاحب کوٹ لکھپت جیل میں تھے۔ قریشی برادران تاجپورہ لاہور کے خونی سانحہ کی رپورٹ شائع کرنے کی پاداش میں جیل کاٹ رہے تھے۔ شامی صاحب پر ائیر مارشل اصغر خان کے ساتھ مل کر ایک سرکاری گاڑی کو روکنے، ڈرائیور سمیت اس میں سوار اہلکاروں کو مارنے پیٹنے اور گاڑی کا مانا اور جیک چرانے کا الزام تھا (محمود علی قصوری، جاوید ہاشمی، خورشید محمود قصوری اور ملک حامد سرفراز تھے)۔ صلاح الدین کی طویل قید پر پروفیسر غفور احمد نے کہا تھا کہ بھٹو صاحب ایوانِ اقتدار سے اور صلاح الدین جیل سے اکٹھے نکلیں گے، یہی ہوا۔ صلاح الدین نے اس دوران ''بنیادی حقوق'' کے نام سے کتاب لکھی اور رہائی کے بعد ان سطور کے ساتھ بھٹو صاحب کو بھجوائی کہ میں جیل میں تھا تو یہ کتاب لکھی۔ اب آپ جیل میں ہیں تو اس کا مطالعہ فرمائیں۔

شامی صاحب نے 16/اگست کے ''جلسۂ عام'' میں ''فیلڈ مارشل'' ضیاء الحق کے عنوان سے کالم باندھا۔ اہلِ قلم میں بھٹو کے چاہنے والوں میں سے بعض نے اس کا بہت برا منایا اور باقاعدہ کالم آرائی کر کے غبار نکالا۔ شامی صاحب اپنے تازہ کالم (23/اگست) میں اس کا جواب دے چکے۔ شامی صاحب کا قریبی حلقہ احباب (جس میں شمولیت کا اس خاکسار کو بھی اعزاز حاصل ہے) جانتا ہے کہ ان کے ہاں بھٹو صاحب کے خلاف وہ پہلی سی شدت اور تلخی نہیں رہی۔ ان کی تحریروں اور تقریروں سے بھی یہ حقیقت عیاں ہے لیکن تاریخ تو تاریخ ہے اور بعض تاریخی حقائق کا اظہار شامی صاحب اپنے تازہ کالم میں بھی کر گزرے ہیں۔ اس میں اس ستم کا ذکر بھی ہے، جس کا شامی صاحب (اور ان کے رفقا) اُس دور میں مسلسل نشانہ بنے لیکن انھوں نے ایک اور واقعہ کا ذکر نہیں کیا جسے وہ مظفر محمد علی

(مرحوم) سے اپنے ایک انٹرویو میں ریکارڈ پر لا چکے تھے۔ تو وہ کہانی، شامی صاحب کی زبانی: ''اسی دوران بھٹو صاحب کے ایک قریبی معاون میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ دیکھیں، ذرا احتیاط کریں۔ میں نے کہا کہ ہم احتیاط سے ہی چیزیں چھاپتے ہیں اور کوئی اخلاق سے گری ہوئی یا قانون کے خلاف کوئی چیز نہیں چھاپتے۔ ہاں کئی چیزوں پر تنقید ضرور کرتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ آپ کی شادی ہو چکی ہے اور آپ کی بیٹی بھی ہے۔ میرے نزدیک بھٹو صاحب کا پورا عہد اس ایک فقرے میں بند ہے کہ ''آپ کی بیٹی بھی ہے۔'' اس سے پہلے کا ایک اور واقعہ بھی یاد آیا، جو شاید ریکارڈ پر تو نہیں لیکن شامی صاحب بھی موڈ میں ہوتے تو اپنے دوستوں کو سنایا کرتے۔ سرکاری میڈیا ٹیم میں ایک صاحب شامی صاحب کے دوست بھی تھے۔ وہ شامی صاحب کے درپے ہو گئے کہ آپ ایک بار بھٹو صاحب سے مل تو لیں۔ شامی صاحب ٹالتے رہے۔ انھی دنوں مولانا مودودیؒ بھٹو صاحب سے مل چکے تھے۔ 1973ء کا آئین تیاری کے آخری مراحل میں تھا۔ بھٹو صاحب آئین پر اتفاق رائے کے لیے مولانا سے بھی ملنا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس کے لیے اچھرہ میں مولانا کی رہائش پر آنے کی خواہش کا اظہار کیا، تو مولانا کا جواب تھا کہ وہ ایک بڑے قومی مقصد کے لیے ملنا چاہتے ہیں تو میں خود گورنر ہاؤس آ جاؤں گا۔ مولانا گورنر ہاؤس جا کر بھٹو صاحب سے مل آئے۔ بھٹو سے ملاقات کے لیے اصرار کرنے والے دوست نے اسے مثال بنایا تو شامی صاحب نے ہنستے ہوئے جواب دیا: ''مولانا کی عزت ایک ٹن ہے۔ اس میں سے پاؤ بھر کم بھی ہو گئی تو کیا فرق پڑے گا۔ اپنی تو کل عزت ہی ایک چھٹانک ہے، یہ بھی چلی گئی تو اپنے پلے کیا رہ جائے گا؟

جنرل ضیاء الحق اور دائیں بازو کے صحافیوں میں تعلقات کا معاملہ بھی دلچسپ رہا، جنھیں ضیاء الحق کے قریبی حلقے میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ ان کی افغان پالیسی کے حامی اور پبلک میں اس کی بھرپور تائید اور وکالت کرتے تھے، لیکن ضیاء الحق کی سیاسی پالیسیوں کے ناقد تھے اور ان کے منہ پر بھی اس کے اظہار سے گریز نہ کرتے۔ ضیاء الحق، مجید نظامی صاحب سے کہا کرتے: ''آپ کا واسطہ جابر سلطان سے رہا ہے (ان کے اخبار کے ادارتی صفحے پر شائع ہونے والی اس احادیث کی طرف اشارہ کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے) لیکن اب آپ کا واسطہ ایک صابر سلطان سے ہے، لیکن صابر سلطان کا پیمانہ صبر بھی چھلک پڑتا۔ ضیاء الحق کے مارشل لاء کا دوسرا ماہ تھا، جب الطاف حسن قریشی صاحب نے ان کا ایک طویل انٹرویو شائع کیا۔ اگلے ماہ انھوں نے اداریہ لکھا کہ شیر اپنا شکار کسی کو نہیں دیتا اور یہ کہ جو افراد بھٹو صاحب کی حکومت میں اعلیٰ مناصب پر فائز تھے، انھی کو مزید کلیدی ذمے داریاں سونپ دی گئی ہیں جس سے کسی بڑی تبدیلی کی توقع عبث لگتی ہے۔ اس پر انھیں 20 اکتوبر کی شب مارشل لاء کے تحت گرفتار کر کے کوٹ لکھپت جیل پہنچایا گیا۔

جنرل ضیاء الحق نے 1979ء میں دوسری بار عام انتخابات کیے تو شامی صاحب بگڑ گئے۔ ایک اخبار کے فورم میں انھوں نے شدید تنقید کی اور کہا کہ اسلامی نظام مارشل لاء سے نہیں، جمہوریت سے آئے گا۔ ضیاء الحق اگلے روز لاہور میں تھے۔ ان کا جواب تھا، بعض لوگوں کے ذہنوں میں جمہوریت کا کیڑا کلبلاتا رہتا ہے۔ طویل عرصہ تک دونوں میں ٹھنی رہی۔ یہ قطع تعلق 1983ء میں جنرل ضیاء الحق کی طرف سے 1985ء کے انتخابات کے اعلان کے بعد ختم ہوا۔ کراچی والے صلاح الدین شہید کی بھی، طویل عرصہ جنرل ضیاء الحق سے بول چال بند رہی۔ جنرل ضیاء کے غیر جماعتی انتخابات کے فیصلے کے وہ سخت مخالف تھے، وہ تو کچھ مشترکہ دوست درمیان میں پڑے اور صلاح الدین صاحب کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ اسے مارشل لاء سے جمہوریت کی طرف سفر کا پہلا مرحلہ سمجھیں۔ انتخابات ہو گئے تو یہ اسمبلیاں غیر جماعتی نہیں رہیں گی اور یہیں سے جماعتی سیاست کا احیا ہوگا اور پھر واقعی یہی ہوا۔

◆◆◆

آپ بیتی

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

سفر بخیر مسافر من

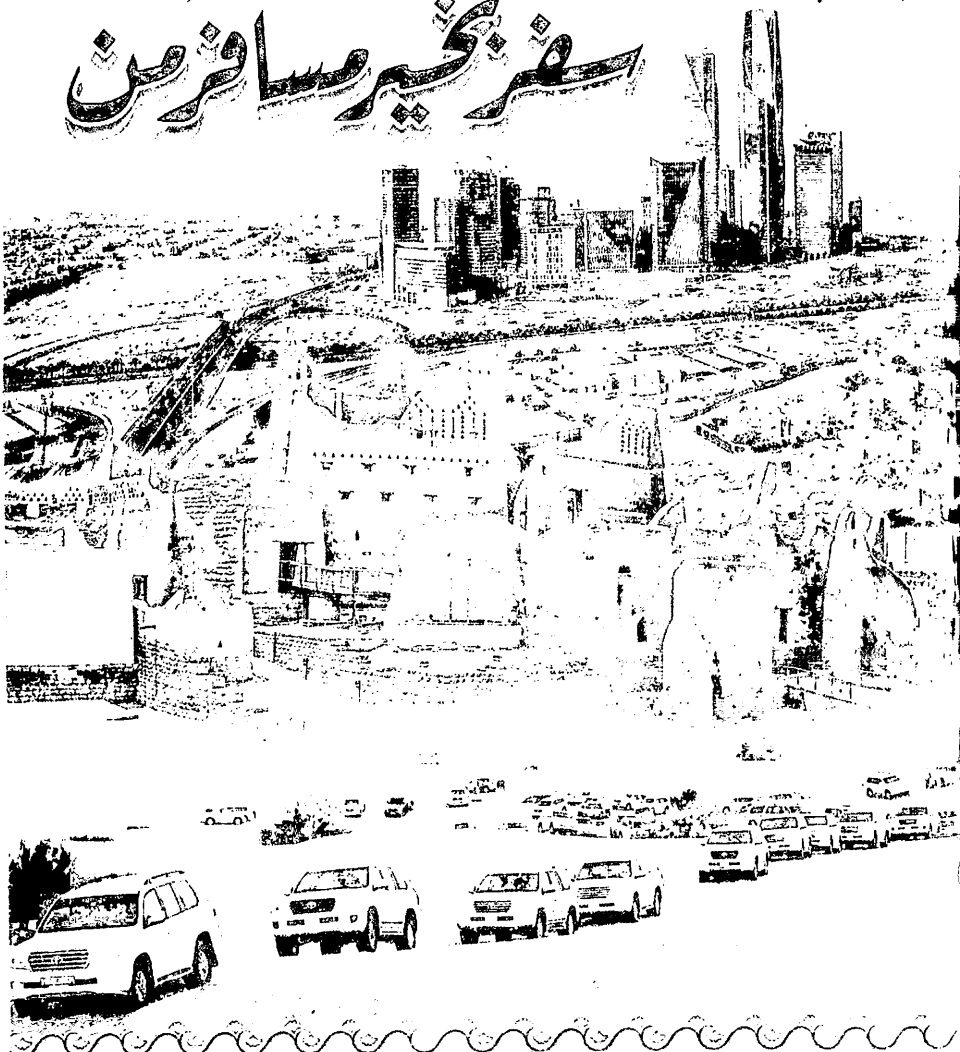

بے میں پڑھاتے ہوئے میرا تیسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ اگرچہ یونیورسٹی میں، مَیں نے اپنی جگہ بنالی تھی اور

لباس بدلنے سے اندر کا آدمی نہیں مرجاتا... میرے اندر بھی ایک خالص پاکستانی ہمیشہ زندہ رہا

اگر چاہتا، تو یہاں عمر گزار سکتا تھا، لیکن میں یہاں کی سردی سے عاجز آ چکا تھا۔ اس لیے میں نے کسی گرم مستقر کی تلاش شروع کر دی۔ مختلف یونیورسٹیوں میں درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں۔ کچھ عرصہ پہلے پروفیسر وید پرکاش نے ٹیلی فون پر مجھے بتایا کہ وہ میرا نام اقوامِ متحدہ میں سعودی عرب میں اربن اینڈ ریجنل پلاننگ کے مشیر کے طور پر تجویز کر آئے ہیں۔ میری دوسری عرضیاں بھی رنگ لائیں۔ یونیورسٹی آف ساؤتھ کیرولائنہ سے مجھے انٹرویو کی دعوت موصول ہوئی۔ اُنھوں نے میرا آنے جانے کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھیج دیا۔ ہوائی اڈے پر اربن اور ریجنل پلاننگ کے چیئرمین اپنی بیگم کے ساتھ مجھے لینے آئے۔ ایک ہوٹل میں میرا کمرا بُک تھا۔ اُنھوں نے مجھے ہوٹل میں چھوڑتے ہوئے کہا آپ آرام کریں، کل صبح آپ کو لینے کے لیے آؤں گا۔ میرا انٹرویو تین روز چلا۔ تیسرے روز چیئرمین نے مجھے بتایا ہم نے آپ کو منتخب کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آپ کو یونیورسٹی آف وسکونسن کی طرف سے دو ہزار ڈالر سے زیادہ تنخواہ دینے کا فیصلہ بھی ہو گیا ہے۔ ہماری پیشکش آپ کو بذریعہ ڈاک گرین بے پہنچ جائے گی۔ آپ اگلے سمسٹر سے ہماری یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر سکتے ہیں۔

کچھ دنوں بعد مجھے پہلوی یونیورسٹی آف شیراز (ایران) سے بھی پیشکش کا ایک خط ملا جس میں مجھے مطلع کیا گیا تھا کہ آپ کو ریجنل ڈیولپمنٹ پلاننگ کے پروفیسر کی آسامی کے لیے 100,000 تومان سالانہ کے مشاہرہ پر منتخب کر لیا گیا ہے۔ آپ ایرانی سفارت خانہ، واشنگٹن سے اپنا ویزہ اور شیراز آنے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی اثنا میں پروفیسر وید پرکاش کی سفارش بھی بارآور ثابت ہوئی اور مجھے اقوامِ متحدہ سے سعودی عرب میں بطور مشیر اقوامِ متحدہ برائے اربن اور ریجنل پلاننگ کی پیشکش کا خط ملا۔ تینوں نوکریوں میں ظاہر ہے، اقوامِ متحدہ کی نوکری زیادہ پُرکشش تھی، اس لیے میں نے وہ منظور کر لی اور گرین بے کی یونیورسٹی سے ایک سال کی چھٹی لے لی۔ بشریٰ نے بھی اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کا افسر کہتا رہا کہ آپ کے شوہر صرف ایک سال کے لیے سعودی عرب جا رہے ہیں۔ آپ اتنی اچھی نوکری نہ چھوڑیں۔ ہم آپ کو ایگزیکٹو ڈائریکٹر کے طور پر ترقی دے سکتے ہیں، لیکن بشریٰ نہ مانیں۔

میری ایک سال کی چھٹی منظور ہونے کے بعد میرے چیئرمین نے مجھ سے کہا کہ آپ خود اپنی جگہ پر بھرتی کا اشتہار دے دیں اور اُمیدواروں کا انٹرویو کر کے کسی کو منتخب کر کے ہمیں اس کی اطلاع دے دیں۔ ہم اسے یونیورسٹی کی طرف سے تقرری کا خط جاری کروا دیں گے۔ میں نے پلانرز کے جرنل میں اپنی جگہ کا اشتہار دیا، لیکن ایک سال کی عارضی نوکری کے لیے کوئی درخواست موصول نہ ہوئی۔ میں نے اقوامِ متحدہ سے اپنے ریاض کے ٹکٹ براستہ جدہ منگوائے تاکہ ریاض میں اقوامِ متحدہ کی نوکری شروع کرنے سے پہلے عمرہ ادا کرتا ہوا ریاض پہنچوں۔ چھٹی پر جانے سے پہلے میں اپنی یونیورسٹی کے ریکٹر سے الوداعی ملاقات کے لیے ملا، تو اُنھوں نے پوچھا کتنے عرصہ تک سعودی عرب رہنے کا پروگرام ہے؟ میں نے جواب دیا شاید دو سال۔ پہلے سال تو آدمی نئے سوشل سسٹم سے مانوس ہوتا ہے اور دوسرے سال وہ اس قابل ہوتا ہے کہ حقیقت پر مبنی بامقصد تجاویز دے سکے۔

ہم 1978ء میں اقوامِ متحدہ کی نوکری کا آغاز کرنے کے لیے براستہ جدہ، ریاض کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ میرے حصولِ روزگار کے چوتھے دور کا آغاز تھا۔ جدہ پہنچ کر ہم لوگ اپنے بے حد عزیز دوست ڈاکٹر فرحت علی برنی کے پاس ٹھہرے۔ فرحت علی برنی اور میں نے اپنی پی ایچ ڈی کے دوران میڈیسن وسکونسن میں ایک ساتھ ٹرکیوں کے ہاسٹل کی چوکیداری کی تھی اور میں ان کی کار لڑکیوں کے ہاسٹل جانے کے استعمال کیا کرتا تھا۔ فرحت علی برنی اُن دنوں شاہ

عبدالعزیز یونیورسٹی کے انڈسٹریل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر فائز تھے۔ جدہ پہنچتے ہی ہم لوگوں نے عمرہ ادا کیا۔

فرحت علی برنی نے مجھے بتایا کہ ان کی یونیورسٹی کے اربن اینڈ ریجنل پلاننگ ڈیپارٹمنٹ میں اساتذہ کی بے حد کمی ہے۔ اُنھوں نے میری ملاقات متعلقہ ڈین سے طے کروا دی۔ ڈین بہت شریف انسان تھے۔ بہت محبت سے ملے۔ مجھے یونیورسٹی میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں نے کہا اگر مجھے فُل پروفیسر کی آسامی کے لیے منتخب کیا جاسکے، تو اسی صورت میں یونیورسٹی جوائن کرسکتا ہوں۔ اُنھوں نے کہا فل پروفیسر کی تقرری میرے دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ اِس عہدہ پر تقرری کے لیے خاص کیس بنا کر مجھے ذاتی طور پر ریکٹر سے ملنا پڑے گا۔ سعودی عرب میں فل پروفیسر کی بہت قدر و منزلت ہے۔ اس کا درجہ وائس منسٹر کے برابر تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی تنخواہ مشیر اقوامِ متحدہ سے زیادہ تھی، رہنے کے لیے فرنشڈ رہائش، تقریباً سال میں چار ماہ کی چھٹیاں اور ہر سال امریکا جانے، آنے کا ہوائی جہاز کا فرسٹ کلاس کا کرایہ بھی یونیورسٹی ادا کرتی تھی۔

بہرحال میں جدہ سے ریاض اپنی اقوامِ متحدہ کی ملازمت شروع کرنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ ریاض پہنچ کر مجھے مدینہ منورہ کی شہری منصوبہ بندی کے پروجیکٹ کی نگرانی کا کام تفویض کردیا گیا۔ ریاض پہنچ کر کچھ دنوں کے بعد مجھے شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کی طرف سے فل پروفیسر کی تقرری کی اطلاع ملی۔ فرحت علی برنی نے بے حد خوشی کا اظہار کیا اور بتایا کہ میں نے آپ کے لیے اچھی سی فل فرنشڈ رہائش ڈھونڈنی شروع کردی ہے۔

فل پروفیسر کی پیشکش پر مجھے شمس العلماء استاد ابراہیم ذوقؔ یاد آ گئے۔ بہادر شاہ ظفر کی جلاوطنی کے بعد ذوق کے ٹھاٹھ باٹھ اور وظیفہ ختم ہوگیا تھا۔ صرف بہادر شاہ کا دیا ہوا خطاب باقی رہ گیا تھا۔ نظامِ حیدرآباد نے بڑے اعزاز کے ساتھ اُنھیں حیدرآباد آنے کی دعوت بھجوائی، تو ذوقؔ نے یہ شعر لکھ کر معذرت کرلی۔

اِن دنوں گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

سعودی عرب میں اقوامِ متحدہ کی ایک سال کی ملازمت کے بعد مجھے حکومتِ پنجاب کی طرف سے بھی ایک حکم نامہ ملا کہ تمہاری ایک سال کی اقوامِ متحدہ میں ڈیپوٹیشن کی مدت ختم ہوگئی ہے، اس لیے واپس آ جاؤ۔ میں نے درخواست بھیجی کہ آج کل میں مدینہ منورہ کے ماسٹر پلان پروجیکٹ کی نگرانی میں مصروف ہوں، اِس لیے میری اقوامِ متحدہ میں ڈیپوٹیشن میں مزید ایک سال کی توسیع کردی جائے۔ حکومت نے قطعی انداز میں جواب دیا کہ تمہاری مزید توسیع نہیں ہوسکتی یا تو تم واپس آجاؤ ورنہ ہم تمہیں ریٹائر کردیں گے۔ میں نے جواب دیا مجھے ریٹائر کردیا جائے، میں مدینہ ماسٹر پلان کی تکمیل سے پہلے واپس نہیں آ سکتا۔ لہٰذا حکومت نے میری ریٹائرمنٹ کے احکامات پوری پنشن کے ساتھ جاری کردیے۔

میں نے تصرف کے ساتھ ذوقؔ کا یہ مصرع پڑھا: کون جائے ذوقؔ پر مدینہ کی گلیاں چھوڑ کر۔ میں نے ڈین کا اس پیشکش پر تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ کیونکہ فی الوقت میں مدینہ کے ماسٹر پلان کی نگرانی میں مصروف ہوں، اس لیے اگر آپ اس پیشکش کو دو سال کے لیے مؤخر کروا سکیں، تو میں بے حد مشکور ہوں گا۔

مجھے اقوام المتحدہ کی ملازمت میں دو سال کی بجائے تقریباً دس سال لگ گئے اور ایک کے بعد دوسرے پروجیکٹس کی نگرانی کا کام ملتا رہا۔ میں نے اس دوران میں الابہاء، حائل اور تبوک انجینئرنگ کے ریجنل اور شہری منصوبہ بندی کے پروجیکٹس کی نگرانی کی اور سعودی عرب کے مختلف علاقوں کا دورہ کرکے ان کی امکانی منصوبہ بندی کی رپورٹس

تیار کیں۔

سعودی عرب ایک بہت وسیع و عریض ملک ہے۔ یہ رقبہ میں پاکستان سے تقریباً ڈھائی گنا بڑا ہے۔ اس میں تین ریگستان ہیں۔ سب سے بڑا ریگستان اس کے جنوب مشرقی حصے میں ربع الخالی ہے۔ اِس میں کوئی جیپ چلاتے ہوئے غلط رخ پر نکل جائے، تو اُسے ریت کا کفن ہی میسر آتا ہے۔ دوسرا بڑا ریگستان نفود ہے جو حائل ایمیریٹ میں واقع ہے۔ جن دنوں میں حائل ایمیریٹ کے ریجنل پلان کی نگرانی کر رہا تھا، میں نے امریکن کنسلٹنٹس (consultants) سے نفود ریگستان دیکھنے کی فرمائش کی۔ کئی جیپوں کا قافلہ، کافی تعداد میں پٹرول اور کھانے اور پینے کے پانی کے ہمارے ساتھ چلا۔ ایک سعودی کھوجی جو نفود سے واقف تھا، ہمارے ساتھ تھا۔ ہماری منزل نفود کے وسطی علاقہ میں واقع ایک نخلستان تھا۔ بدو بہت میزبان ہوتے ہیں۔ نخلستان میں بدوؤں نے ہمیں خوش آمدید کہا اور کہا کہ اگر ان کو تین چار گھنٹے دیے جائیں، تو وہ ہماری ضیافت کرنا چاہیں گے۔ ایک بہت بڑی سینی (ایک بڑا تھال) میں پلاؤ کے اُوپر ایک پوری روسٹ کی ہوئی بھیڑ رکھ دی جاتی ہے اور لوگ اس سینی کے چاروں طرف بیٹھ کر روسٹ کی ہوئی بھیڑ کا گوشت ہاتھوں سے توڑ کر پلاؤ کے ساتھ کھاتے ہیں۔ میزبان، مہمانِ خصوصی کو بطور خاص بھیڑ کی آنکھ نکال کر پیش کرتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اس قسم کی دعوتوں میں میزبان سے دور بیٹھنے کی کوشش کی۔ سعودی عرب کے ایک اور چھوٹے سے ریگستان میں مجھے اُس وقت جانے کا موقع ملا جب میں الاباہاء امیریٹ کے ریجنل پلان کی پروجیکٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔ میں اور میرے مصری خیر المنورہ الاباہاء کنسلٹنٹ کا کام دیکھنے الاباہاء گئے۔ ہم نے الاباہاء کے امیر کو جو شاہ فہد کے خسر بھی تھے، پیغام بھجوایا کہ ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔

امیر اُن دنوں ریگستان میں کیمپنگ کر رہے تھے۔ اُنھوں نے کہا اقوام المتحدہ کے ماہرین کو میرے ریگستان کے کیمپ میں لے آؤ۔ ہم شام کے وقت امیر کے کیمپ میں گئے۔ ایک بہت بڑے کیمپ میں جس میں قالین بچھے ہوئے، امیر آف الاباہاء زینت افروز تھے۔ چاروں طرف بدوئین بیٹھے ہوئے تھے۔ سعودی قہوہ اور کھجوروں کا دور چل رہا تھا۔ ہر بدو اپنی اپنی عرضداشت امیر کے سامنے بیحد عزت و احترام کے ساتھ پیش کر رہا تھا۔ ہمیں بطورِ خاص امیر کے ساتھ بٹھایا گیا اور ہم بھی قہوہ اور کھجوروں کی ضیافت میں شامل ہو گئے۔ امیر نے اپنے مینیجر سے کہا کہ اقوام المتحدہ کے ماہرین میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ مغرب کے بعد سب سعودی یکے بعد دیگرے رخصت ہوئے اور ہم ایک چھوٹے سے خیمہ میں منتقل ہو گئے۔ دستر خوان بچھایا گیا اور گرم گرم کھانا پیش کیا گیا۔ کھانے کے بعد بڑے بڑے گلاسوں میں امیر کی اونٹنی کا تازہ نکالا ہوا دودھ پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے مجھے کبھی اونٹنی کا دودھ پینے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرے مصری ساتھی جو امیر کے ساتھ بیٹھے تھے، اُنھوں نے اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر امیر کی خدمت میں عرض کیا "یا سیدی، طال عمرک (آپ کی عمر دراز ہو) میرا پیٹ خراب ہے۔" امیر نے فوراً کہا پھر تو تم اونٹنی کا دودھ ضرور پیو، یہ پیٹ کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک سعودی نے مجھ سے کہا کہ مجھے تو اگر ایک گلاس اور مل جائے تو میں وہ بھی پی لوں گا۔ تم پی کر تو دیکھو، بہت لذیذ ہوتا ہے۔ بہر حال امیر کے اصرار پر ہمیں اونٹنی کا دودھ پینا پڑا۔ واقعی بہت لذیذ تھا۔ کافی گاڑھا تھا اور اس میں ہمک (خاص بُو) بالکل نہیں تھی۔

سعودی عرب میں 1970s اور 1980s کی دہائیاں شہری اور علاقائی منصوبہ بندی اور تعمیری کاموں کے لیے بڑی اہمیت کی حامل تھیں۔ 1970ء کے اوائل میں تیل کی قیمتیں یک لخت بڑھ جانے کے باعث سعودی آمدنی میں بے تحاشا اضافہ ہو گیا تھا اور حکومت نے بڑے پیمانے پر بین الصوبائی

ہائی ویز، پُلوں، ہوائی اڈّوں کی تعمیر کا بیڑا اُٹھا لیا تھا۔ سعودی شہروں کے مرکزی علاقوں میں ٹریفک بڑھ جانے کی وجہ سے بھیڑ بڑھ گئی تھی اور ٹریفک رُک رُک کر چل رہی تھی۔ مرکزی علاقوں میں پہنچنے کے لیے کئی گھنٹے لگ جاتے تھے۔ ان علاقوں کے گرد عمارتوں کو توڑ کر سڑکوں کو کشادہ کیا جا رہا تھا۔ جتنی تیزی سے تعمیری کام سعودی شہروں میں 70s اور 80s کی دہائیوں میں ہوا، وہ شاید ہی دنیا کے کسی ملک میں ہوا ہو۔ تعمیری کاموں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ شہروں کی شکل، دنوں میں تبدیل ہو رہی تھی۔ پرانے شہر نئے شہروں میں تبدیل ہو رہے تھے۔

سعودی عرب میں آبادی اور کام کرنے والوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے مختلف ملکوں سے ہنرمند اور غیر ہنرمند بڑی تعداد میں آ رہے تھے۔ اتنے لوگوں کے آنے کے باعث رہائش کی بے تحاشا کمی واقع ہو گئی تھی۔ رہائشی سہولت کا یہ حال تھا کہ ایک ایک کمرے میں آٹھ، دس باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو رہنا پڑتا۔ میرے ایک دوست نے بتایا کہ وہ امریکا سے منسٹری آف ڈیفنس کی میٹنگ میں شرکت کے لیے ریاض گئے۔ ریاض میں اُن دنوں صرف دو ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ اُن میں کوئی کمرا خالی نہیں تھا، اس لیے وہ ایک ہوٹل کی لاؤنج میں ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور سوچا کہ اسی کرسی پر رات گزار کر صبح منسٹری آف ڈیفنس کی میٹنگ میں شرکت کر کے امریکا واپس چلا جاؤں گا، لیکن مغرب کے وقت ہوٹل کی انتظامیہ کے ایک شخص نے اُن سے کہا، جناب یہ کرسی خالی کر دیں، یہ رات کے لیے کرایے پر دی ہوئی ہے۔

مجھے خود ریاض میں اپنی رہائش کے لیے مکان ڈھونڈنے میں بہت دقت ہوئی اور ایک زیرِ تعمیر ڈوپلیکس (Duplex) میں - 84,000 ریال سالانہ کرایے پر لینا پڑا، اس کے علاوہ دس فی صد کمیشن بھی ایجنٹ کو دینا پڑا۔ یہ کرایہ اقوام المتحدہ دیا کرتی تھی۔ اس ڈوپلیکس کے دوسرے حصہ میں ایک انگریز رہا کرتا تھا۔ یہ ڈوپلیکس ایک فلسطینی عورت کا تھا جس کا سعودی شوہر انتقال کر گیا تھا اور وہ اپنے دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے ساتھ اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اس کے پاس اِس ڈوپلیکس کو مکمل کرانے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ میرے دیے ہوئے کرایے سے یہ گھر مکمل ہوا۔ میرے انگریز ہمسائے کا اپنا انداز تھا۔ میرے حصّہ میں چوہے بہت ہو گئے تھے۔ میں نے اپنی پریشانی اپنے ہمسایہ سے بیان کی۔ اُس نے مجھے چوہے مارنے کی گولیاں دیں کہ گھر میں کچن اور گھر کے کونوں میں ڈال دو۔ سب چوہے مر جائیں گے۔ میں نے پوچھا یہ چوہے کہاں مریں گے، گھر میں یا گھر کے باہر؟ اُس نے کہا یہ تمہارا نہیں چوہوں کا مسئلہ ہے۔ اُس نے اپنے گھر کے ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں ایک ''بار'' بنائی ہوئی تھی۔ ایک دن جب میں اُس سے ملنے گیا، تو اُس نے ہاتھ کے اشارہ سے مجھ سے پوچھا، پیو گے؟ میں نے کہا تمہیں معلوم ہے کہ سعودی عرب میں شراب پینے کی ممانعت ہے اور تم نے اپنے گھر میں بار سجا رکھی ہے۔ تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ اُس نے کہا ڈر کس بات کا؟ سعودی پولیس کا چیف خود شراب پینے میرے پاس آتا ہے۔

کافی سالوں کے بعد جب ایک مرتبہ میرا ریاض جانے کا اتفاق ہوا، تو میں عہدِ ماضی کو آواز دینے کے لیے وہ گھر دیکھنے گیا۔ گھر مکمل ہو کر بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ میں نے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی۔ میری مالکۂ مکان کے بڑے بیٹے نے دروازہ کھولا۔ جوان ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اُس نے کہا ڈاکٹر انیس یہ گھر تو تمہارا ہے۔ تمہارے دیے ہوئے کرایے کی رقم سے تعمیر ہوا ہے۔ میرے پاس ہی ٹھہرو۔ میں نے کہا میں تو آج واپس جا رہا ہوں۔ صرف یہ گھر دیکھ کر ماضی کی یادیں تازہ کرنے آیا تھا۔ اُس نے کہا جب آپ اگلی مرتبہ ریاض آئیں، تو مجھے صرف ٹیلی فون کر دیں۔ میں خود آپ کو ایئرپورٹ پر لینے آؤں گا۔

سعودی عرب میں اپنی اقوام المتحدہ کی ملازمت کے

دوران میرا یہ دستور رہا کہ ہر سال میں ایک ماہ کی چھٹیوں میں امریکا جاتے ہوئے کئی ملکوں کی سیاحت کرتے ہوئے جایا کرتا۔ اقوام المتحدہ کے پاسپورٹ کی وجہ سے مجھے بعض ملکوں میں تو ویزہ سے استثنا حاصل تھا، لیکن بعض ملک قومی پاسپورٹ پر ویزا لگاتے تھے۔ میں نے جنرل ایوب کی حکومت کے بعد پیپلز پارٹی اور نواز شریف کے دورِ حکومت میں پی آئی اے اور پاکستانی پاسپورٹ میں بتدریج بے قدری دیکھی ہے۔ پی آئی اے جس کا شمار کبھی دنیا کی بہترین فضائی کمپنی میں ہوتا تھا، ایئرلائنز کی ترجیحات کی نچلی سطح پر آ گئی تھی۔ اس کی ذمہ داری دونوں پولیٹیکل پارٹیز کے سربراہان پر جاتی تھی۔ پیپلز پارٹی کے دور میں بے شمار سفارشی جیالے پی آئی اے میں بھرتی کیے گئے۔ یہ صرف تنخواہ لینے والے بے ہنر لوگ تھے جن کا خرچ پی آئی اے کو برداشت کرنا پڑا۔ کمیشن کھانے کی وجہ سے کمتر کوالٹی کے جہاز پی آئی اے کے لیے خریدے گئے۔ بے قدری کے باعث پی آئی اے کے ماہر پائلٹوں اور انجینئروں نے نوکریاں چھوڑ کر دوسری انٹرنیشنل ایئرلائنوں کی ملازمتیں اختیار کر لی تھیں۔ ناقص کام کرنے والوں کی وجہ سے جہازوں کی مرمت اور بحالی کے کام کا معیار بھی گر گیا۔ پی آئی اے کے ڈائریکٹر جنرل سیاسی بنیاد پر ایسے لوگ تعینات کیے گئے جن کو اتنے بڑے ادارے کو چلانے کا بالکل تجربہ نہ تھا۔ کچھ سیاسی راہنماؤں نے اپنی نجی ایئرلائنز بھی کھول لی تھیں۔ ان میں پی آئی اے کے ہنرمندوں کو زیادہ تنخواہوں پر بھرتی کر لیا تھا اور پی آئی اے میں نیم ہنرمندوں کو سیاسی بنیاد پر بھرتی کر لیا تھا۔ اس سے ان کے دو مقاصد کی تکمیل ہوئی، ایک تو ان کی نجی ایئرلائنیں چل پڑیں اور پی آئی اے کے مسافروں نے ان میں سفر کرنا شروع کر دیا اور اپنے جیالوں کو پی آئی اے میں بھرتی کرانے کے سبب اُن کو سیاسی طور پر سستی مقبولیت حاصل ہوئی۔

پچھلے زمانہ میں چور اُچکے اور اُٹھائی گیرے آنکھ جھپکنے میں چوری کر لیا کرتے تھے۔ یہاں تو غضب اللہ کا پی آئی اے کا پورا جہاز چوری ہو گیا اور میڈیا نے سرخی کے ساتھ کوئی خبر بھی نہ چھاپی۔ یہ کسی ایک فردِ واحد کی کارستانی نہیں تھی۔ سیاسی راہنماؤں کی سرپرستی میں اداروں کے تعاون سے یہ کام سرانجام دیا گیا تھا۔

پھر پی آئی اے کے بیرونی اثاثے بھی بکنے شروع ہو گئے۔ مجھے یاد ہے جب میں 1957ء میں پہلی بار انگلستان پڑھنے گیا، تو پی آئی اے کا دفتر لندن کی بیحد کشادہ ریجنٹ سٹریٹ (Regent street) پر بڑے نمایاں مقام پر واقع تھا۔ اتنی اچھی جگہ پر پی آئی اے کا وسیع و عریض دفتر دیکھ کر میں بہت مرعوب ہوا تھا۔ لندن کے دوسرے دورے میں جب میں اپنی پی آئی اے کی ریزرویشن تبدیل کرانے ریجنٹ سٹریٹ گیا، تو پی آئی اے کے دفتر کی جگہ سنگاپور، ایئر فرانس اور لفتھانزا ایئرلائنز کے دفاتر کھل گئے تھے۔ پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ پی آئی اے کا دفتر یہاں سے منتقل ہو چکا۔ نئے دفتر کا پتا پوچھتا پوچھتا پہنچا، تو معلوم ہوا کہ ایک تنگی سی گلی میں دوسری منزل کے ایک فلیٹ میں پی آئی اے کا دفتر قائم کیا گیا تھا۔ یہی حال پی آئی اے کے نیویارک میں روز ویلٹ ہوٹل (Rosevelt Hotel) کا ہونے لگا تھا۔ اسے برائے فروخت لگا دیا گیا تھا۔ شاید مناسب کمیشن اور مخالف سیاسی پارٹیوں کے اعتراض کے باعث یہ بکنے سے بچ گیا۔

پاکستانی پاسپورٹ کی بھی وہ قدر و منزلت نہیں رہی تھی جو کبھی جنرل ایوب کے زمانہ میں ہوا کرتی تھی۔ کئی ملکوں نے جہاں پاکستانی پاسپورٹ کو ویزے سے استثنٰی حاصل تھا، ویزے کی شرط عائد کر دی تھی۔ پاکستانی پاسپورٹ کے حامل کو شک کی نظروں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ ایک چینی کہاوت کے مطابق دریا میں گند اوپر سے نیچے بیٹھتی ہے۔ نیچے سے اوپر نہیں آتی۔ رہنماؤں کی اقدار عوام میں سرایت کرتی ہیں، عوام کی اقدار رہنماؤں میں نہیں۔

پاکستانی لیڈروں کی منافقانہ اقدار عوام میں بڑی تیزی سے

سہولیات کرنے لگی تھیں۔ اِس لیے میں نے امریکی شہریت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ شہریت کی تبدیلی میرے لیے لباس بدلنے کے مترادف تھی لیکن بہرحال لباس بدلنے سے اندر کا آدمی تبدیل نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے میں نے امریکا میں ایک وکیل سے رابطہ کیا۔ اُس نے بتایا کہ امریکی امیگریشن ایکٹ کے مطابق تمہارے پاس پانچ سالوں میں ڈھائی سال امریکا کی سکونت لازم ہے جو تمہارے پاس نہیں ہے، اس لیے تم امریکی شہری نہیں بن سکتے۔ اگر تم چاہو، تو میں متعلقہ کانگرس مین کی معرفت ایک پرائیویٹ بل کانگریس میں ڈھائی سال کی سکونت سے مستثنیٰ قرار دینے کا بل کانگرس میں داخل کروا سکتا ہوں۔ میرے کہنے پر مجھے امریکی ڈھائی سال کی سکونت سے مستثنیٰ قرار دینے کا بل 05/اپریل 1983ء کو داخل کروا دیا گیا۔ یہ بل امریکی کانگرس اور سینیٹ کی ذیلی کمیٹیوں سے پاس ہوتا ہوا 11/اکتوبر 1984ء کو پریزیڈنٹ ریگن کی منظوری کے لیے بھیجا گیا اور 19/اکتوبر 1984ء کو صدر ریگن کے دستخطوں کے بعد ایک پرائیویٹ ایکٹ بن گیا۔ میرے سینیٹر رابرٹ کسٹن مائر (Robert Kastenmeier) کا خط مجھے اِس پرائیویٹ بل کی کاپی کے ساتھ ملا جس میں اُنھوں نے لکھا تھا کہ تم امریکا کے کسی بھی شہر کے امیگریشن کے دفتر میں جا کر امریکی شہریت حاصل کر سکتے ہو۔ اگر کوئی دقت ہو، تو مجھ سے رابطہ کرنا۔ جب میں اس ایکٹ کی کاپی کے ساتھ ملواکی (Milwakee) کے امیگریشن آفس کے انچارج سے ملا، تو اُس نے حسرت سے کئی بار کبھی مجھے دیکھا اور کبھی اس ایکٹ کی کاپی کو پڑھا اور مجھے امریکی شہریت حاصل کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔

بشریٰ بھی امریکی شہریت اختیار کر سکتی تھیں، لیکن وہ اپنی پاکستانی شہریت چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ اس لیے اُنھوں نے گرین کارڈ پر رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اگرچہ بعد میں اُن کو بھی پاکستانی پاسپورٹ پر ویزہ لینے کی صعوبت سے بچنے کے لیے امریکی شہریت اختیار کرنا پڑی۔

سعودی عرب میں تعمیری کاموں کی تیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ عام طور پر تعمیری کام منصوبہ بندی کے بعد کیے جاتے ہیں، لیکن سعودی عرب میں منصوبہ بندی تعمیری کاموں کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ 1970ء کی دہائی کے اوائل میں گھروں، ہوٹلوں، شاپنگ سینٹروں اور ہائی ویز کی کمی 1980ء کے عشرہ کے اوائل میں پوری ہو گئی تھی۔ 1980ء کی دہائی کے آخر میں سعودی حکومت کی ''صرف سعودیوں کے لیے'' (Saudization) کی پالیسی کی وجہ سے باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے بڑی تعداد میں اخراج کے سبب گھروں، دفاتر اور ہوٹلوں کے خالی ہونے کی شرح (vacancy rate) بہت بڑھ گئی تھی اور ان کے کرائے جو پہلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے، کافی گر گئے تھے۔

میں اپنی اقوام المتحدہ کی ملازمت کے دوران، دو سعودی اشخاص سے بہت متاثر ہوا۔ ایک تو ڈاکٹر صالح التہول تھے اور دُوسرے ڈاکٹر الانکاری۔ دونوں بنیادی طور پر پروفیسرز تھے۔ ڈاکٹر التہول منسٹری آف میونسپل افیئرز میں ڈپٹی منسٹر تھے۔ سات سال ہارورڈ اور ایم آئی ٹی میں پڑھنے کے بعد اربن اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کر کے واپس لوٹے تھے۔ مجھ سے بیحد خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ اُن کے ساتھ میں نے کئی ریسرچ پیپرز بھی لکھے۔ اُن سے آج تک میرا تعلق برقرار ہے۔ میری ای میل کا فوراً جواب دیتے ہیں۔ ڈاکٹر الانکاری بھی کچھ عرصہ تک ڈپٹی منسٹر رہے۔ پھر وائس منسٹر ہو گئے تھے اور بعد میں اُن کی تقرری بطور منسٹر برائے ہائر ایجوکیشن ہو گئی تھی۔ وہ ابھی کے امیر کے داماد اور شاہ فہد کے ہم زلف تھے۔ وہ بھی بہت خوش اخلاق تھے۔ میرا تعلق اُن سے اقوام المتحدہ کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی قائم رہا۔

1987ء میں اقوام المتحدہ کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد امریکا واپسی سے پہلے میں نے ایک عرضی ڈاکٹر

فرحت علی برنی کی معرفت شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کے اربن اور ریجنل پلاننگ کے ڈیپارٹمنٹ میں بھجوائی۔ اس میں مَیں نے ڈیپارٹمنٹ کی دس سال پہلے دی گئی فل پروفیسر کی پیشکش کا حوالہ بھی دیا۔ ڈاکٹر طارق علی فدعق نے جو اُس وقت اربن اور ریجنل پلاننگ کے محکمہ کے چیئرمین تھے، مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا۔ وہ مجھ سے ملنے ریاض آنا چاہتے تھے۔ ایک مقامی ہوٹل میں اُن سے ملنے کی تاریخ اور وقت طے ہوا۔ اُنھوں نے مجھے بتایا کہ فی الحال محکمہ میں فل پروفیسر کی کوئی جگہ خالی نہیں، اِس لیے آپ کی بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کی تقرری کی سفارش کی جاسکتی ہے۔ میں نے اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں چونکہ امریکا واپس جارہا ہوں، اس لیے میری تقرری کا خط میرے امریکا میں دیے ہوئے پتہ پر بھجوا دیجیے گا۔ امریکا سے منتخب ہوکر آنے کا فائدہ یہ تھا کہ یونیورسٹی جہاں سے پروفیسرز کو منتخب کرتی ہے، وہاں کا ہی ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں آنے جانے کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ فراہم کرتی ہے۔

میری بطور ایسوسی ایٹ پروفیسر کی تقرری کا خط جب متعقدین (contractees) کے محکمہ میں پہنچا، تو اُنھوں نے یہ اعتراض لگا کر کہ کیونکہ کسی زمانہ میں یہ امریکا میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے، اس لیے ان کو صرف بطور اسسٹنٹ پروفیسر کے ہی منتخب کیا جاسکتا ہے، میری تقرری کا خط جاری کردیا۔ میں یہ پیشکش رد کرنے لگا تھا، لیکن بشریٰ نے کہا تم یہ پیشکش منظور کرلینی چاہیے۔ کسی، بیسری ڈاکٹ بن چکی ہیں۔ مونس یونیورسٹی میں اپنی تعلیم کے آخری سال میں ہے۔ اسسٹنٹ پروفیسر کی تنخواہ ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی ہے۔ جدہ میں مکہ جانے آنے میں بہت سہولت رہے گی۔

شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں 1978ء میں فل پروفیسر کی پیشکش کے دس سال بعد 1987ء میں میں اسی یونیورسٹی میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر اپنے کیریئر کا آغاز کررہا تھا۔ یہ میرے حصولِ روزگار کا پانچواں اور آخری دور تھا۔ جدہ پہنچ کر میں ڈاکٹر فدعق سے ملا۔ بہت خلوص سے پیش آئے۔ وہ بھی اُس وقت بطور اسسٹنٹ پروفیسر کام کررہے تھے۔ اُنھوں نے مجھ سے کہا، ڈاکٹر انیس، میری پروموشن تو ہوجائے گی، لیکن آپ کی ترقی کے امکانات کافی محدود ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دورانِ صدارت میرا بڑا خیال رکھا اور اُن کی سفارش پر مجھے بہترین پروفیسر کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ڈاکٹر فدعق کا معاملہ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ اُن کے والد اور شاہ فہد کا بچپن سے دوستانہ تھا۔ اس لیے ڈاکٹر فدعق کے والد کو شاہ فہد نے جدہ کے میئر کے عہدہ پر فائز کردیا تھا۔ اب اگرچہ اُن کے والد کا انتقال ہوچکا تھا، پھر بھی ہر سال شاہ فہد کے دستخطوں کے ساتھ ڈاکٹر فدعق کو تحفہ کے طور پر امریکا آنے جانے کا ہوائی جہاز کا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ آیا کرتا تھا۔ محکمہ کی صدارت دو سال کے لیے ہوتی تھی۔ وہ دو معیادوں سے محکمہ کے صدر چلے آرہے تھے۔ تیسری مرتبہ اُن کا چیئرمین بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انھیں اپنی پروموشن کے لیے ریسرچ پیپر لکھنے کے لیے وقت درکار تھا، جو پروموشن کے لیے لازم تھے۔

صدارت کے لیے اگلے امیدوار ڈاکٹر یمانی تھے۔ صدر کا انتخاب ہر محکمہ کے پروفیسر بذریعہ ووٹنگ کرتے تھے۔ انتخاب سے پہلے ڈاکٹر یمانی میرے دفتر میں آئے۔ بڑے خلوص و محبت سے مجھے اور میری بیوی کو اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ ایسی ہی دعوت ایک ٹرکش پروفیسر ڈاکٹر ٹونا کو بھی دے چکے تھے۔ ڈاکٹر یمانی کی بیوی، ڈاکٹر فدعق کی طرح امریکن تھی، مسلمان ہوگئی تھی اور سعودی لباس پہنتی تھی۔ ڈاکٹر یمانی کا کھانا بہت پُرتکلف اور لذیذ تھا۔ اُن کی بیوی نے بڑی محبت سے کھانے پر ہماری میزبانی کی۔ اس خاطر مدارت کے بعد ڈاکٹر یمانی کو ووٹ دینا تو لازم تھا۔ بہرحال ڈاکٹر یمانی محکمہ کے اگلے چیئرمین ہوگئے۔

(جاری ہے)

گڈ بائے شوگر

(دوسری قسط)

ایڈووکیٹ زاہد عرفان

اب میں ایک نئے عزم کے ساتھ شوگر کی بیماری سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ سب سے پہلے مروجہ ایلوپیتھی طریقِ علاج کی طرف رجوع کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مختلف قسم کے ٹیسٹ کروائے تاکہ ان کی روشنی میں علاج تجویز کیا جاسکے۔

آج کل میڈیکل ٹیسٹوں کا کاروبار اربوں روپے مالیت کی انڈسٹری کا روپ دھار چکا۔ ہر لیبارٹری اپنے ٹیسٹوں کے نتائج کی درستی پر اصرار کرتی اور اس دعوے کے ساتھ مارکیٹ میں موجود ہے کہ وہ بین الاقوامی معیارات کی حامل ہے۔ اس کاروبار میں بے تحاشا منافع ہے اور چند روپوں کی لاگت والے ٹیسٹ کے ہزاروں روپے لیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبان کی من پسند لیبارٹریاں ہیں جن کے علاوہ کروایا گیا کوئی ٹیسٹ ان کی نظر میں قابل قبول نہیں ہوتا۔

مریض بے چارے ان جگہوں سے مہنگے داموں ٹیسٹ کروانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آج سے دس بیس سال قبل اتنے زیادہ ٹیسٹ کروانے کا رواج نہ تھا۔ ڈاکٹر حضرات اپنے تجربے اور مرض کی علامات دیکھ کر ادویہ تجویز کر دیتے۔ صرف انتہائی پیچیدہ امراض یا سرجری کے لیے ہی ٹیسٹ کروائے جاتے۔ آج کل انتہائی سینئر پروفیسر حضرات بھی معقول فیس لینے کے بعد نسخے پر صرف چند ٹیسٹ لکھتے ہیں اور مریض کو سختی سے ہدایت کرتے ہیں کہ وہ تجویز کردہ لیبارٹری سے ہی ٹیسٹ کروائیں۔ اگلی مرتبہ جب مریض رپورٹیں لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر صاحب فخریہ بتاتے ہیں کہ اگرچہ مجھے پہلے ہی یقین تھا کہ ٹیسٹ کی رپورٹ یہی آئے گی لیکن میں نے اپنی تسلی کے لیے یہ ٹیسٹ کروائے۔ اب آپ اسے ڈاکٹر کی دیانت

اس مرض نے بے شمار نیم حکیموں اور لیبارٹریوں کے فریبِ جال سے متعارف کروا دیا

داری پر محمول کریں یا بد دیانتی پر۔ مریض کا وقت اور پیسہ دونوں ضائع ہوئے۔ دوسری طرف سرکاری اسپتالوں میں حکومت کی طرف سے مہیا کردہ جدید ترین مشینری اکثر خراب ملتی ہے اور مریض نجی لیبارٹریوں سے مہنگے ترین ٹیسٹ کروانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ سرکاری عملے اور نجی لیبارٹریوں کے مالکان کی ملی بھگت سے غریب مریض رُل جاتے ہیں۔

ٹیسٹوں کی رپورٹیں لے کر میں دوبارہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے سرسری انداز میں انھیں دیکھا اور نسخہ لکھنے لگے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کی کہ وہ مجھے اس بیماری کے حوالے سے سمجھائیں کہ میں کیسے اس کے چنگل سے نکل سکتا ہوں۔ میری بات سن کر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کہنے لگے، میاں اب تو اس کے ساتھ ہی بقیہ زندگی بسر ہوگی۔ آپ کھانا چھوڑ سکتے ہیں لیکن دوائی ہر حال میں لینا ہوگی۔ ابھی تو صرف ذیابیطس کی ادویہ تجویز کر رہا ہوں لیکن بعد میں ان کے ساتھ بلند فشارِ خون، کولیسٹرول کی ادویہ بھی آپ کے لیے ناگزیر ہوں گی۔ یہ بھی ذہن نشین کر لیں کہ وقت کے ساتھ ذیابیطس کا مرض بڑھتا ہے اور دوائی کی مقدار بھی بڑھانا پڑتی ہے۔ گویا اُردو زبان کا محاورہ ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' شوگر کی بیماری کے لیے ہی بنا تھا۔ ادویہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے روزانہ آدھا گھنٹہ صبح اور آدھا گھنٹہ شام میں تیز قدمی کرنے کی تاکید کی۔ جبکہ اپنا یہ حال تھا کہ چند قدم چلنے کے بعد سانس پھول جاتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ عام طور پر شوگر کا مرض ظاہر ہونے میں پانچ سے دس سال کا عرصہ لیتا ہے اور یہ جسم کے اندر پنپتا رہتا ہے۔ ہمارا جگر اور لبلبہ خون میں شکر کی مقدار کو متوازن رکھنے کی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں اور آخر کار تھک کر یہ نظام ناکارہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے خون میں شکر کی سطح مستقل طور پر بڑھ جاتی ہے۔ ادھر آپ نے کھانا کھایا، اُدھر شوگر لیول بڑھ گیا۔ جب یہ سطح مسلسل بڑھتی رہے تو جسم میں موجود خون کی باریک نالیاں زخمی ہونے لگتی ہیں۔ اس وجہ سے ہمارا بدن مختلف عوارض کا شکار ہو جاتا ہے۔ بینائی متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہے، گردے ناکارہ ہو کر کام کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ مرض کی شدت کی وجہ سے بعض اوقات مریض کے پاؤں بھی کاٹنا پڑتے ہیں۔

انگریزی ادویات کے استعمال سے خون میں شکر کی سطح مصنوعی طور پر کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات شوگر لیول کا اتنا کم ہو جانا مریض کے لیے جان لیوا بھی ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے ذیابیطس کے مریضوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ دن میں تین وقت کے بجائے چھے مرتبہ تھوڑا تھوڑا کھاتے رہیں تاکہ ان کے خون میں گلوکوز موجود رہے۔ بار بار کھانا شوگر کی سطح کسی حد تک متوازن رکھتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دیگر مسائل جنم لینا شروع کر دیتے ہیں۔ نظام انہضام مسلسل کام کرنے کی وجہ سے سست ہونے لگتا اور جگر کو اپنے افعال سرانجام دینے کے لیے زیادہ متحرک رہنا پڑتا ہے۔ مریض کا وزن بھی بڑھنا شروع ہو جاتا ہے جو مزید مختلف امراض کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ آج کل ذیابیطس کے ہر مریض کے نسخے میں جس کیمیکل کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اس کا نام Metformin ہے۔ اس دوائی کے بغیر کوئی نسخہ نہیں لکھا جاتا۔ اکثر مریضوں کو یہ دوا موافق نہیں آتی اور ان کا پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ بار بار قضائے حاجت کے لیے جانا پڑتا اور پتلے پاخانوں کی وجہ سے کھائی گئی خوراک جزو بدن نہیں بن پاتی۔ یہ اس دوائی کا ایسا مضر اثر ہے جو صحت بحال ہی نہیں ہونے دیتا۔

بدقسمتی سے پوری دنیا میں صحت اور تعلیم کے شعبہ جات خدمت کے بجائے کاروبار کی شکل اختیار کر چکے۔ کسی اسپتال یا ڈاکٹر کے لیے مریض، گاہک کی حیثیت رکھتا ہے۔ کمپنیاں

ڈاکٹر حضرات کو بھاری کمیشن پر اپنی ادویہ فروخت کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ کوئی ایسی دوا مارکیٹ میں آنے ہی نہیں دی جاتی جو کسی مرض کو جڑ سے ختم کر سکے۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہر سال اپنی ادویہ کی فروخت کا طے شدہ ہدف حاصل کرنے کی خاطر پرانے مریضوں کے ساتھ ساتھ نئے مریض بھی بناتی رہتی ہیں۔ مرض کا علاج نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی علامات کو محض وقتی طور پر دبانے کی دوا دی جاتی ہے۔ مریض جب تک اسے استعمال کرے، سکون میں رہتا ہے اور دوائی چھوڑتے ہی دوبارہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہی اس طریقہ علاج کی سب سے بڑی خامی ہے۔

اس امر میں کوئی شک نہیں کہ ایلوپیتھی طریق علاج سائنسی بنیادوں پر قائم ہے اور دنیا بھر میں حکومتیں اس کی سرپرستی کرتی ہیں۔ صحت کے بجٹ کا زیادہ تر حصہ اسی شعبے کے تعلیمی اداروں اور اسپتالوں کو دیا جاتا ہے۔ ایمرجنسی اور سرجری کے حوالے سے اس نظام نے حیرت انگیز ترقی کی ہے لیکن یہ بھی امر واقع ہے کہ ایسے بہت سے امراض جن کے علاج ہمارے خطوں میں صدیوں سے رائج تھے، ایلوپیتھی طریقہ علاج میں ناقابل علاج قرار پا چکے۔

ذیابیطس کے علاج کے حوالے سے میری دلچسپی کسی ایسے طریقہ علاج میں تھی جو اس مرض کو جڑ سے ختم کر دے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت تھی کہ میں کھانا تو چھوڑ سکتا ہوں لیکن دوائی کسی صورت نہیں۔ اب سفر و حضر میں ادویہ میری مستقل ساتھی بن چکی تھیں۔ لاہور شہر میں ہومیوپیتھی ڈاکٹر حضرات اس مرض کے شافی علاج کا دعویٰ کرتے نظر آتے ہیں۔ کچھ ڈاکٹر حضرات تو نجی ٹیلی ویژن چینلوں پر گھنٹوں کے حساب سے وقت خرید کر اس بات کی مشہوری کرتے ہیں کہ ان کی دوائی سے اس مرض کا مکمل خاتمہ ممکن ہے۔ شفایاب مریضوں کے انٹرویو دیکھ کر میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس طریقہ علاج کو بھی آزمانا چاہیے۔ میں ایک مشہور ہومیوپیتھی کلینک پر چلا گیا جہاں ذیابیطس کے مریضوں کا ہجوم تھا۔ میں نے بہت سے مریضوں سے پوچھا کہ وہ براہِ راست کسی ایسے مریض کو جانتے ہیں جو یہاں سے دوائی لے کر رُو بہ صحت ہوا ہو تو کسی نے بھی اثبات میں جواب نہ دیا۔ زیادہ تر لوگ ٹیلی ویژن کے پروگراموں سے متاثر ہو کر آئے تھے۔

میں نے بھی ڈاکٹر صاحب کی اپائنٹمنٹ لی اور انتظار گاہ میں بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹے کے بعد میری باری آئی تو ڈاکٹر صاحب بڑے اخلاق سے ملے۔ کہنے لگے، ذیابیطس کی بیماری کا علاج تو چٹکیوں میں ہو جاتا ہے، بس آپ کے جسم سے انگریزی ادویہ کا اثر ختم کرنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ ہزاروں مریض ان کے علاج سے شفایاب ہو چکے۔ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب ان مریضوں کا کوئی مرتب شدہ ریکارڈ موجود ہے؟ کہ ان سے تصدیق کے لیے رابطہ کیا جا سکے۔ جواب ندارد۔

پندرہ دن کی دوائی اچھی خاصی فیس کے عوض ملی۔ پرہیز میں وہی پرانی باتیں جو ذیابیطس کے ہر مریض کو ازبر ہو چکی ہوتی ہیں، ساتھ ہی ہدایت بھی کہ انگریزی دوائی ابھی نہ چھوڑی جائے۔ کچھ عرصہ ان کا استعمال بھی جاری رکھیں۔ ایک بات جو میرے لیے اچنبھے کا باعث تھی، وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب مریض کو نسخہ نہیں دیتے تھے۔ نسخہ وہیں رکھ لیا جاتا۔ جب میں نے نسخہ مانگا تو انھوں نے کہا کہ کوئی بھی ہومیوپیتھی ڈاکٹر اپنا نسخہ مریض کو نہیں دیتا۔ ایسا کیوں؟ اس کیوں کا کوئی جواب نہ ملا۔

شروع میں تو دوائی نے اچھا اثر کیا اور میری نہار منہ شوگر پہلے سے بہتر ہونے لگی۔ میں خوش تھا کہ دوائی کام کر رہی ہے۔ پندرہ دن بعد جب دوبارہ دوائی لے کر آیا تو میں نے پُراعتماد ہو کر انگریزی دوائی کی مقدار کم کر دی۔ کچھ دن بعد خون میں شکر کی سطح پھر سے بڑھنا شروع ہو گئی۔ اب اگر

انگریزی دوائی کھاؤ تو ٹھیک ورنہ صرف ہومیوپیتھی دوا اثر نہ کرتی۔ تیسری مرتبہ ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا اور پوچھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کہنے لگے کہ کچھ عرصہ لگے گا۔ آپ دوائی باقاعدگی کے ساتھ لیتے رہیں۔ چھے ماہ مسلسل دوائی کھانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہاں میں محض اپنا وقت اور پیسہ برباد کر رہا تھا۔

اسی دوران مجھے ایک دوست نے مشورہ دیا کہ میں لاہور میں پاکستان کے سب سے قدیم ہومیوپیتھی کالج کے پرنسپل سے علاج کرواؤں۔ پرنسپل صاحب نے ایم بی بی ایس کے ساتھ ساتھ ہومیوپیتھی کے معالج کے طور پر تعلیم حاصل کی ہوئی تھی اور ذیابیطس کے علاج کے حوالے سے خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ میں وقت لے کر ان سے ملا، ان کے تجربے اور مہارت نے بہت متاثر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ابھی تک ہومیوپیتھی میں ذیابیطس کے مرض کے مکمل خاتمے کی کوئی دوا موجود نہیں۔ جو لوگ اس طرح کے دعوے کرتے ہیں، ان کے پاس مصدقہ صحت یاب مریضوں کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔ دیگر طریقہ ہائے علاج کے مانند ہومیوپیتھی بھی خون میں شکر کی مقدار متوازن رکھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے لیے آپ کو مسلسل دوا استعمال کرنا ہوگی۔ البتہ ہومیوپیتھی کی ادویہ کے مضر اثرات نہیں ہوتے اور مریض اس سے بہتری محسوس کرتا ہے۔ اب آپ کی مرضی کہ آپ کس طریقۂ علاج کو اپناتے ہیں۔ میں ایک سال ان کے زیر علاج رہا لیکن دن میں چار پانچ مرتبہ دوا لینا میرے لیے ایک مشکل امر تھا۔ اسی لیے میں دوبارہ ایلوپیتھی ادویہ پر آ گیا۔ کیونکہ محفوظ اور مضبوط پیکنگ کی بدولت آپ انھیں سفر میں بآسانی لے جا سکتے ہیں۔

میرا مشاہدہ ہے کہ کسی بھی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اصلی ماہرین فن کبھی بھی بلند بانگ دعوے نہیں کرتے۔ البتہ عطائی حضرات اپنے علاج کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ میرے ایک دور کے رشتے دار عید کے موقع پر ہمارے گھر آئے۔ بات چیت کے دوران انھیں پتا چلا کہ میں شوگر کے مرض میں مبتلا ہوں تو انھوں نے لاہور کے ایک مشہور یونانی دواخانے کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ شوگر کی دوائی فی سبیل اللہ دیتے ہیں۔ اس کے استعمال سے ہزاروں لوگ صحت یاب ہو چکے۔ میں نے جب کچھ تحفظات کا اظہار کیا تو ان صاحب نے میری اہلیہ سے کہا کہ وہ مجھے ان حکیم صاحب کے پاس ضرور لے کر جائیں۔ اب زوجہ کے حکم سے سرتابی کی کس کو مجال ہے لہٰذا میں مذکورہ مطب پہنچ گیا۔

بڑے حکیم صاحب کچھ عرصہ قبل اللہ کو پیارے ہو چکے تھے اور مطب پر ان کے نوجوان بیٹے سے ملاقات ہوئی جو فاضلِ طب و جراحت تھے اور خاصے معقول دکھائی دیے۔ میں نے اپنی رپورٹیں ان کے سامنے رکھیں۔ انھوں نے نبض چیک کی اور کچھ سوالات پوچھے۔ ذیابیطس کی دوائی جو ان کے اپنے مطب کی بنی ہوئی تھی قیمتاً عنایت کی۔ میں نے فی سبیل اللہ دوائی کے بارے استفسار کیا تو فرمانے لگے، وہ بھی موجود ہے۔ آپ کاؤنٹر سے لے سکتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو نسخہ بھی آپ کو دے دیتے ہیں۔ آپ خود بنا لیں۔ مزے کی بات انھوں نے یہ بتائی کہ ان کے پاس ابھی تک کوئی ایک مریض بھی ایسا نہیں آیا جو اس سے شفایاب ہوا ہو لیکن سوشل میڈیا پر لوگ قسمیں کھا کر اس نسخے کی تشہیر کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے جو دوائی مجھے دی ہے کیا اس سے یہ مرض ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟ انھوں نے کہا کہ ایسا نہیں۔ آپ کو دوائی کھاتے رہنا ہوگا۔ حکیم صاحب نے مجھے یہ بتا کر حیران کر دیا کہ ان کے والد صاحب شوگر کے علاج کے لیے ایلوپیتھی ادویات کا سہارا لیتے تھے اور آخری عمر میں انسولین بھی لگاتے تھے۔ کیونکہ مرض اتنی شدت اختیار کر گیا تھا کہ یونانی ادویہ کے استعمال سے کوئی افاقہ نہ ہوتا تھا۔ میں نے نسخہ دیکھا تو اس میں ایک دو شوگر کی ادویات تھیں اور باقی جسم کو حرارت دینے والی چیزیں شامل

تھیں۔

ایک دن عدالت میں ایک حکیم صاحب سے ملاقات ہوئی جو کسی کیس کے سلسلے میں وہاں آئے تھے۔ تعارف کے بعد پتا چلا کہ وہ ہمدرد یونیورسٹی کراچی سے فارغ التحصیل ہیں اور لاہور کے ایک پوش علاقے میں مطب ہمدرد پر مریض دیکھتے ہیں۔ ہماری شام کی ملاقات طے ہوگئی۔ وقت مقررہ پر میں مطب پہنچ گیا۔ حکیم صاحب نے بڑی توجہ سے بات سنی۔ فرمانے لگے: ''میرے بھائی، سچ بات تو یہ ہے کہ ابھی تک اس مرض کا کوئی شافی علاج کہیں پر بھی دریافت نہیں ہو سکا۔ بعض اوقات ہمارے حکما خود انگریزی ادویات سے شوگر کنٹرول کرتے ہیں۔ آپ جو بھی دوائی کھا رہے ہیں اسے جاری رکھیں اور جسمانی ضعف دُور کرنے کے لیے ہماری ادویہ لے سکتے ہیں۔'' حکیم صاحب کی سچ بیانی نے دل جیت لیا۔ گھر آ کر اطمینان سے انسولین اور انگریزی دوائی لی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔

ایک دن صبح کی سیر کے لیے علامہ اقبال ٹاؤن لاہور کے مشہور پارک میں جانا ہوا تو وہاں بہت سے لوگوں کو یوگا کرتے دیکھا۔ میں بھی پاس جا کر بیٹھ گیا۔ جو صاحب یوگا کروا رہے تھے۔ ان سے بات ہوئی اور اپنے مرض کے بارے بتایا تو کہنے لگے کہ آپ روزانہ صبح آ جایا کریں۔ یوگا کی ورزشوں میں ذیابیطس کی بیماری کی شفایابی موجود ہے۔ کئی مریض صحت یاب ہو چکے۔ میں نے سوچا چلو ایک تجربہ اور سہی۔ اگلے دن سے میں نے یوگا کی کلاس میں شرکت شروع کر دی۔ تین چار ماہ مسلسل ورزش کرنے سے جسم پر اچھے اثرات مرتب ہوئے۔ صبح کے وقت صاف اور تازہ ہوا، بدن میں تازگی اور چستی پیدا کر دیتی ہے۔ وزن کم ہونا شروع ہو گیا اور خون میں شکر کی سطح بھی کچھ بہتر ہوئی لیکن ہنوز انگریزی ادویہ چھوڑنے کی نوبت نہ آ سکی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر کوئی شخص تندرستی کے زمانے سے ہی یوگا شروع کر لے تو وہ مستقبل میں بہت سی بیماریوں سے بچ سکتا ہے لیکن ایک مریض یوگا سے اپنے مرض کا علاج نہیں کر سکتا۔

اسی طرح سے آپ کو سوشل میڈیا پر بہت سے لوگ مختلف قسم کے نسخے بتاتے نظر آئیں گے۔ کوئی کلونجی کو تریاق ثابت کرتا ہے تو کسی کی نظر میں سوہانجنا ہر مرض کی دوا ہے۔ کوئی آم کے پتوں سے بنے سفوف میں چھپے تندرستی کے راز اُگل رہا تو کسی کے پاس جامن کی گٹھلیوں میں جادو چھپا ہوتا ہے۔ جَو کا دلیا اکسیر کا درجہ رکھتا ہے تو کہیں میتھی دانہ سو امراض کی دوا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

میرے استاد ایک دن مجھے ملنے چیمبر تشریف لائے تو ان کے ساتھ ایک اور صاحب تھے جو ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے۔ میرے سامنے ان صاحب نے کوکا کولا کی بوتل کے دو گلاس ڈکار لیے۔ میں نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا کہ آپ تو شوگر کے مریض ہیں اور آپ اتنی لاپروائی سے بوتل پی رہے۔ وہ مسکرا کر کہنے لگے:

''وکیل صاحب! میں تو اللہ کے فضل سے ٹھیک ہو گیا اور اب ہر طرح کی بدپرہیزی کرتا ہوں لیکن میری شوگر بالکل ٹھیک رہتی ہے۔''

یہ سنتے ہی میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا کہ وہ کیا علاج ہے جس سے انھیں شفایابی ملی؟ انھوں نے شمالی لاہور میں چھڑہ منڈی کے پاس کسی حکیم صاحب کا بتایا۔ کہنے لگے کہ انھوں نے ایک دوائی کا کورس کروایا جس سے وہ بالکل ٹھیک ہو گئے۔ میں نے اُن حکیم صاحب کا پتا لیا اور اگلے دن ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ حکیم صاحب کا مطب کسی ٹائر پنکچر کی دکان میں بنا ہوا تھا۔ اصل حکیم صاحب تو نہیں ملے البتہ ایک شخص جو خود کو ان کا چھوٹا بھائی بتا رہا تھا، پہلے سے پیک کی ہوئی گولیوں کی ڈبیاں دے رہا تھا۔

مطب میں بیس پچیس شیشے کے چھوٹے مرتبان پڑے تھے اور ان میں دنیا جہان کی جڑی بوٹیاں سجی تھیں۔ حکیم

صاحب کے بھائی کا کہنا تھا کہ یہ جڑی بوٹیاں ان گولیوں میں استعمال کی گئی ہیں اور دوا میں کسی قسم کے مصنوعی کیمیائی اجزا شامل نہیں۔ پندرہ سو روپے میں ایک مہینے کی دوائی ملی اور میں نے گھر کی راہ لی۔ صبح کے وقت جب پہلی خوراک چھے عدد گولیوں کی کھائی تو دو ہی گھنٹے بعد شوگر لیول بہت زیادہ کم ہو گیا۔ فوری طور پر چینی کا شربت پینا پڑا تو حواس قائم ہوئے۔ اسی وقت حکیم صاحب سے فون پر بات کی اور اپنی کیفیت بتائی۔ انھوں نے چار گولیاں فی خوراک مقرر کیں۔ چند دن کے استعمال سے میں نے انگریزی دوا کھانی ترک کر دی اور میرے خون میں شکر کی سطح متوازن ہونے لگی۔ میں بہت خوش تھا کہ بالآخر میں ایسی دوائی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا جو بہترین تھی۔

دو ہفتوں بعد میں نے پورے ایک مہینے کی دوائی لے لی لیکن حکیم صاحب سے اس مرتبہ بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ میں نے پوچھا کہ حکیم صاحب کہاں ملیں گے؟ ان کے بھائی کہنے لگے کہ دراصل حکیم صاحب تو فوت ہو چکے۔ یہ ہمارا خاندانی نسخہ ہے جسے ہم بیچتے ہیں۔ مجھے شک گزرا کہ اس دوائی میں ضرور کوئی کیمیکل شامل ہے جس کی وجہ سے یہ شوگر لیول فوری طور پر کم کرتی ہے۔ بعض اوقات تو لیول اتنا کم ہو جاتا کہ فوری طور پر کوئی میٹھی چیز کھانا پڑتی۔

میں نے اپنے ایک دوست سے جو فارماسوٹیکل کے کاروبار سے وابستہ تھا، اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے مجھ سے کچھ گولیاں لیں اور لیبارٹری میں تجزیہ کے لیے بھیج دیں۔ کیمیائی تجزیے سے پتا چلا کہ دوائی کے اندر اصل چیز ایک کیمیکل ہے جو خون میں شکر کی سطح فوری طور پر کم کرتا ہے۔ اس کیمیکل سے بنی ادویہ ایک عرصے تک شوگر کے مریضوں کو ڈاکٹر حضرات استعمال کرواتے رہے ہیں لیکن اس کے انتہائی مضر اثرات کی وجہ سے اب اس پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ میں نے فوراً یہ دوائی چھوڑی اور واپس انسولین پر آ گیا۔

اگرچہ میرا تلاش کا سفر جاری تھا لیکن میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ابھی تک اگر کوئی بہتر طریقہ جس سے خون میں شکر کی مقدار کو متوازن رکھا جا سکتا ہے، وہ ایلوپیتھی ہی ہے۔ ایلوپیتھی ادویات کے مضر اثرات بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا علم مریض اور ڈاکٹر دونوں کو ہوتا ہے، اس لیے رسک کافی حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے لیکن حکیموں کی ادویات کے اندر کیا اجزا شامل کیے گئے ہیں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ اگرچہ اب ڈرگ ریگولیٹری اتھارٹی آف پاکستان نے ہربل کمپنیوں کی ادویہ کی مارکیٹنگ کے حوالے سخت قواعد وضوابط بنائے ہیں لیکن پھر بھی گلی محلے میں بیٹھے عطائی قسم کے معالج انتہائی نقصان دہ مصنوعی اجزا سے بنی ادویہ ہربل کے نام پر مریضوں کو دے رہے ہیں۔ جن کے مضر اثرات کی وجہ نہ صرف حکمت کا شعبہ بدنام ہو رہا بلکہ کئی انسان اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو چکے۔

انسان جب مستقل مزاجی اور لگن کے ساتھ کسی کھوج میں لگا رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دست گیری ضرور فرماتا ہے۔ میرا سفر جاری تھا اور بالآخر مجھے روشنی کی کرن نظر آ گئی۔

(مصنف کا یہ سفر کس منزل پر پہنچا؟ کیا وہ کوئی بہترین معالج یا طریقۂ علاج ڈھونڈنے میں کامیاب ہو سکے؟ پڑھیے اس دلچسپ روداد کا اگلا حصہ ماہِ اکتوبر میں)

◆◆◆

منفی ریویوز کا زہر

کس طرح انسان کو ڈستا ہے پڑھیے

ڈاکٹر فیاض ہرل کے اس اہم مضمون میں

صفحہ نمبر 129 پر

مولانا امیر حمزہ

1965

ستمبر

اور شہدا کا خوشبودار خون

دشمن نے کس قوم کو للکارا؟ لا الٰہ الا اللہ پڑھتے جاؤ، آگے بڑھتے جاؤ

کیپٹن اسفندیار بخاری کو ملنے والے اعزازات

کالج میگزین کا ایڈیٹر اور بیالوجی کلب کا صدر..... پاک فوج میں جناح ونگ کا کمانڈر..... پنجاب انڈر 19 ہاکی ٹیم کا نائب کپتان، شطرنج چمپین..... ایک سو اٹھارویں لانگ کورس میں اعزازی شمشیر کا حامل

منسوب عمارات

☆ ضلعی اسپتال اٹک کو کیپٹن اسفندیار اسپتال نام دیا گیا۔
☆ شین باغ کے داخلی راستے پر اسفندیار بخاری شہید گیٹ قائم کیا گیا۔
☆ کامرہ آڈیٹوریم کو کیپٹن اسفندیار آڈیٹوریم نام دیا گیا۔
☆ ریلوے پارک اٹک کو اسفندیار ریلوے پارک کے نام سے منسوب کیا گیا۔

پاکستان اور بھارت کے درمیان گھمسان کی جنگ چھے ستمبر 1965ء کو لڑی گئی۔ تب فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان ملک کے صدر تھے۔ میری عمر اُس وقت چھے سال چار ماہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اچھا حافظہ عطا فرمایا ہے۔ اس عمر کی یادیں آج بھی ذہن میں محفوظ اور منقوش ہیں۔ صدر ایوب خان کا یہ جملہ زبان زدِ عام تھا، ''دشمن نے کس قوم کو للکارا ہے، لا الٰہ الا اللہ پڑھتے جاؤ، آگے بڑھتے جاؤ۔'' قوم نے اپنی فوج کے ساتھ محبت کی انتہا کر دی۔ جو بچے اس دوران پیدا ہوئے، اُن کے نام ایوب خان رکھے جانے لگے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میری خالہ اپنے شیر خوار بچے کو پیار سے ایوب خان کہتی تھیں۔

آج سوچتا ہوں کہ ہماری قوم کس قدر عظیم ہے کہ اس نے ایوب خاں کی شخصیت کے ساتھ کسی سیاسی اور دیگر اختلاف کو سامنے نہ رکھا۔ سامنے رکھا، تو صرف اس بات کو کہ جس انڈیا کے ساتھ ہم اہلِ پاکستان کی ٹکر ہے، اس ٹکراؤ میں ہمارا سالار ایوب خان ہے۔ محترمہ فاطمہ جناح اور ساری اپوزیشن اپنے ملک کی حفاظت کے لیے پاک فوج کے پیچھے سیسہ پلائی دیوار بن گئی تھی۔ چھے ستمبر کا تقاضا ہے کہ آج بھی اُنھی جذبوں کو تازہ وَلولہ ملے۔

پاکستان جس کی اساس ''لا الہ الا اللہ'' ہے، اس کے تحفظ اور پاسداری کے لیے سیاست اور فرقہ واریت کو ایک طرف رکھ کر دشمن کے خلاف چٹان بن کر کردار ادا کرنا وقت کی آواز ہے۔ جنگِ ستمبر کے موقع پر لاہور کے زندہ دل شہری مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر اپنے طیاروں کو دیکھ کر تالیاں بجاتے اور ہوابازوں کے دِلوں کو گرما رہے تھے، تو حب الوطنی کے جذبوں میں باقی ملک کے شہروں اور دیہاتوں کے لوگ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ میرا گاؤں نکانہ صاحب کے قریب نئی پور پیراں تھا۔ جب جنگی طیارے ہمارے اُوپر سے گزرتے، تو دلوں کے دھڑکنے کی رفتار تیز ہو جاتی۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ پاک فوج زندہ باد، انڈیا مردہ باد کے نعروں سے فضا میں ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ گاؤں کے لوگ راتوں کو جاگ کر پہرہ دیتے۔ ہمارے گاؤں سے ایک دو فرلانگ پر آموں کا ایک گھنا باغ تھا۔ بمبار طیاروں سے اُس باغ کے اُوپر فضا میں روشنیاں ہوئیں، تو مشہور ہو گیا کہ چھاتہ بردار انڈین جاسوس باغ میں اُترے ہیں۔ تب گاؤں میں بجلی نہ تھی۔ لوگ اپنی لالٹینیں ہاتھوں میں لے کر نکلے۔ اُس دور میں ڈانگ ایک کارگر ہتھیار تھا۔ اس کے اگلے حصّے پر لوہے کی پتری بھی چڑھائی جاتی تھی۔ جذبہ اِس قدر تھا کہ بچے بھی ڈنڈے اُٹھائے ساتھ تھے۔ اُن میں

... میں بھی تھا۔ جی ہاں! پوری قوم ایسے ہی جذبوں سے
... تھی۔ شاہینوں، شیروں اور ڈھول سپاہیوں کے لیے
... وں میں بزرگوں کی دعائیں تھی، تو گھروں میں شب
بیدار بیبیوں کی اپنے رب کریم کے حضور التجائیں تھیں۔ یہ
... وہ اثاثے جن سے پاکستانی قوم مالا مال تھی۔ ہمارے
... تو یہ منظر اچھا لگا اور فتح نے ہمارے قدم چومے۔ انھی
... وں کی برکت ہے کہ میرے دل میں شوقِ شہادت پیدا ہوا۔
... ہم درسی کتابوں میں میجر راجہ عزیز بھٹی شہید نشانِ حیدر
... دلیرانہ شجاعت دیتی ہوئی معرکہ آرا داستان پڑھتے، تو دِل
... تا شہادت ملے اور سیدھے جنت میں جائیں کہ شہید کا
... ان رب کریم کو انتہائی محبوب ہے۔

خون ریزی اور شہادت کا خون

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح کہا ہے کہ انسانوں کی
تخلیق سے پہلے زمین پر جنات تھے۔ ان کو آگ کے شعلے
سے پیدا کیا گیا۔ اللہ کے رسول حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا! اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو نور سے پیدا فرمایا۔ جنات کو نار
سے اور اِنسانوں کو خاک سے۔ یعنی پہلی مخلوق فرشتے ہیں، پھر
جنات ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے مخاطب ہوتے ہیں۔
فرمایا: ”(میرے محبوبؐ) جب آپؐ کے رب نے فرشتوں
سے کہا کہ مَیں زمین پر ایک خلیفہ (نائب) بنانے جا رہا ہوں
(جو نسل در نسل ایک دوسرے کے علم، مال اور اَولاد میں نائب
اور وارث بنتے جائیں گے، آگے بڑھتے جائیں گے) اِس پر
فرشتے کہنے لگے۔ کیا آپ اِس زمین میں (گوشت پوست)
کی ایسی مخلوق پیدا فرمائیں گے جو اس میں فساد مچائے گی اور
خون بہائے گی جبکہ تیری حمد کے ساتھ ہم تسبیح بھی کر رہے
ہیں اور تیری پاکیزگی کے گُن بھی گاتے جا رہے
ہیں۔ اِس پر اللہ تعالیٰ نے جواب دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو
مجھے معلوم ہے، وہ تم نہیں جانتے۔ (البقرہ: 30)۔
قارئینِ کرام! غور فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ
نہیں کہا کہ یہ انسان جسے مَیں بنانے جا رہا ہوں، خون ریزی
نہیں کرے گا، بلکہ یہ کہا کہ جو مجھے معلوم ہے، وہ تمھیں معلوم
نہیں یعنی خون ریزی تو ہو گی۔ اِس مخلوق میں سے بعض لوگ
انسانیت سے نیچے اُتر کر حیوانی جبلت پر آ جائیں گے اور ناحق
خون بہائیں گے۔ عورتوں، بچوں کی کوئی پروا اور اِمتیاز نہ
کریں گے۔ بس زمین اور دَولت کی خاطر خون ریزی کریں
گے۔ اِس ناحق خون ریزی کو روکنے کے لیے بعض دوسرے
ایسے انسان بھی ہوں گے جو مفاداتی ضرورتوں کے اسیر ہو کر بھی
اِس قدر اونچے ہوں گے کہ فرشتہ صورت ہوں گے۔ وہ ناحق
خون ریزی کو روکنے کے لیے اپنا خون پیش کریں گے۔ یہ خون
پاکیزہ ہو گا۔ یہ میری خاطر ہو گا..... جی ہاں! یہ تھا وہ راز جو اللہ
تعالیٰ نے فرشتوں کو نہیں بتلایا۔ اِس کو آنے والے وقت پر چھوڑ
دیا کہ جب شہدا، اپنا خون پیش کریں گے، تو فرشتوں کو معلوم ہو
جائے گا کہ خون ریزی میں کون سی حیوانیت والی خونریزی ہے
اور کون سی روحانی، ملکوتی اور نورانی ہے؟

کشمیر کے لیے جنگ

جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ پنجاب میں پانچ دریا بہتے ہیں جو کشمیر سے آتے ہیں۔ پھر یہ ایک ہو کر کراچی کے قریب سمندر میں جا گرتے ہیں۔ دریاؤں کے ساتھ ہی پہاڑی علاقوں میں راستے یعنی سڑکیں ہوتی ہیں۔ خطۂ کشمیر کے لوگوں کا عقیدہ، زبان، کلچر، ثقافت، پانی، راستے، جغرافیہ، سڑکیں سب کچھ کا تعلق پاکستان کے ساتھ مگر بھارتی فوج نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرلیا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے یہ کہہ کر 1948ء میں جنگ بندی کروائی کہ ہم رائے شماری کروائیں گے۔ 19 سال تک دھوکا دیا اور رائے شماری نہ کروائی۔ جب کشمیریوں نے ہتھیار اُٹھا لیے، تو بھارت نے بین الاقوامی سرحد یعنی لاہور پر حملہ کر کے زیادتی کر دی۔ پاکستانی فوج اور قوم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اب ایک طرف جھوٹ، دجل، فریب اور اہلِ کشمیر پر ظلم اور ظالمانہ قبضہ تھا۔ بہیمیت اور حیوانیت کی جبلّت تھی اور دُوسری جانب مظلوموں کے لیے آزادی کا جذبہ تھا۔ اپنے حق کا حصول تھا۔ حملے میں پہل انڈیا نے کی۔ گویا اہلِ پاکستان نے اپنے پیارے رسولؐ کا یہ فرمان اپنے ماتھے کا جھومر بنائے رکھا: ''دشمن سے مڈبھیڑ (جنگ) کی خواہش نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو۔ پھر جب اُن سے مڈبھیڑ ہو جائے، تو ڈٹ جاؤ۔ یاد رکھو! جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔'' (بخاری 2965)۔ ''لا الہ الا اللہ'' ہمارا کلمہ ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں جو شخص اِس کلمے کی سربلندی کی خاطر لڑا، تو وہ جنگ اللہ کے راستے کی جنگ ہے۔ (بخاری 2810) قارئین کرام! آیئے، اب اِس راستے میں بہائے ہوئے خون کی پاکیزگی کے مناظر ملاحظہ کرتے ہیں۔ آغاز ہم اللہ کے رسول ﷺ کے شہید صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے کرتے ہیں اور پھر ان کے راستے پر چل کر جنہوں نے اپنی جانوں کو پیش کیا، ان کے واقعات کو بھی قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں گے۔

خون آلود پروں والے حضرت جعفر طیارؓ

حضرت جعفر طیارؓ وہ عظیم صحابی ہیں جو مسکینوں کو کھانا کھلانے اور مدد کرنے میں مشہور تھے۔ جب اللہ کے رسولؐ نے مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دی، تو حضرت جعفرؓ اُن مہاجرین میں شامل تھے۔ وہاں اُنھوں نے حبشہ (ایتھوپیا) کے بادشاہ اصحمہ کے دربار میں اسلام کی دعوت پیش کرتے ہوئے سورۃ مریم کی آیات تلاوت کیں، تو اُن کی دعوت سے شاہِ حبشہ مسلمان ہو گئے۔ خدمتِ خلق کے علَم بردار بھی تھے، چناچہ وہ واپس آئے، تو اللہ کے رسولؐ نے اُن سے معانقہ کیا۔ (سلسلہ صحیحۃ: 3551)

موجودہ اُردن کے علاقہ ''موتہ'' میں قیصرِ روم کے خلاف جنگ کے لیے اللہ کے رسولؐ نے حضرت زید بن حارثہ، حضرت جعفر بن ابی طالب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم کو کمانڈر بنا کر بھیجا۔ تینوں شہید ہو گئے اور پھر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے کمان سنبھالی اور فتح حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ نے مذکورہ خبر سے اپنے رسولؐ کو آگاہ کر دیا۔ (بخاری 2976)

حضرت جعفرؓ جب فوج کے سالار بن کر لڑ رہے تھے، تو اُن کے ہاتھ میں حضور ﷺ کا عطا کیا ہوا پرچم تھا۔ ایک ہاتھ کٹ گیا، تو دوسرے ہاتھ میں پرچم تھام لیا۔ وہ بھی کٹ گیا، تو ٹھوڑی اور سینے کے درمیان پرچم کو تھام لیا۔ اتنے میں مسلمانوں نے پرچم اُٹھا لیا، اسے گرنے نہیں دیا۔ حضرت جعفرؓ شہید ہو گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اُن کے بارے میں فرمایا:

''مَیں نے جعفرؓ بن ابی طالب کو دیکھا کہ وہ فرشتوں کے ہمراہ دو پروں کے ساتھ اک بادشاہ کی حیثیت سے پرواز کر رہے ہیں۔ (سلسلہ صحیحۃ للالبانی: 1226)

قارئین کرام! حضرت جعفرؓ کے پروں کا رنگ کیا تھا۔ ان کا سر مبارک اور سینہ کیسا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو یہ سارے رنگ دکھائے ہیں۔ مولانا ضیاء الرحمٰن رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الجامع الکامل'' میں حدیث نمبر

ہیں۔ کہتے ہیں اس حدیث کے راوی مضبوط ہیں۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اسے ''مستدرک'' میں لائے ہیں۔ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی شرطوں پر بھی صحیح ہے۔ اللہ کے رسولؐ فرماتے ہیں: ''رات کو ایسا ہوا کہ جعفرؓ میرے پاس سے گزرا۔ فرشتوں میں سے جو سردار فرشتے تھے، جعفرؓ اُن کے ہمراہ تھا۔ اُس کے دونوں پَر خون میں لت پت تھے۔ جبکہ دل کا مقام (سینہ) انتہائی سفید (چمک دار) تھا۔'' یاد رہے، مذکورہ حدیث سلسلہ صحیحۃ میں بھی موجود ہے۔ شیخ البانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے سلسلہ صحیحۃ میں معروف تبع تابعی حضرت عبداللہ بن مختار رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے بھی حدیث لائے ہیں۔ اس میں ''ابیض القوادم'' کے الفاظ ہیں یعنی حضرت جعفرؓ کا سر مبارک اور چہرہ مبارک بھی انتہائی سفید تھا اور جو پَر تھے، وہ خون میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اللہ اللہ! کیا بلند مقام ہے کہ جنت کے بادشاہ ہیں۔ چہرہ انتہائی سفید اور چمک دار ہے۔ سینہ بھی سفید اور چمک دار ہے۔ اعلیٰ ترین سردار فرشتوں کے ساتھ وہ فردوس کے آسمان میں پرواز کر رہے ہیں۔ جی ہاں! یہ شہادت کے خون کی عظمت اور اللہ تعالیٰ کے ہاں قدر اور عزت فزائی ہے۔ اسی طرح امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ حسن سند کے ساتھ حدیث لائے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جعفرؓ، حضرت جبرائیلؑ اور حضرت میکائیلؑ کے ساتھ جنت میں محوِ پرواز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دو (شہید) ہاتھوں کے بدلے دو پَر عطا فرمائے ہیں۔ امام طبرانیؒ ہی دوسری سند کے ساتھ حدیث لائے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے حضرت جعفرؓ کے بیٹے کو دیکھا، تو اُسے یوں مبارک باد دی ''تمھیں مبارک ہو، تیرا باپ فرشتوں کے ہمراہ آسمان میں اُڑ رہا تھا۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح میں روایت (3709) لائے ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب حضرت جعفر طیارؓ کے بیٹے حضرت عبداللہ بن جعفرؓ سے ملتے، تو اُنھیں یوں مخاطب کرتے۔ وہ جو پَروں والے ہیں، اے اُن کے بیٹے! تجھ پر سلام ہو۔ اللہ اللہ! یہ ہے بدلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیے ہوئے جھنڈے کی حفاظت کا۔ اسلام میں اُنھیں ''طیار'' کا لقب ملا۔ ''ذوالجناحین'' کا خطاب، اللہ کی طرف سے یوں ملا کہ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے اجراء ہوا اور حضرت عمرؓ جیسے عظیم صحابی اور باقی ساری اُمت کی زبانوں پر جاری ہوا اور قیامت کے دن تک جاری رہے گا۔ شہداء جنت میں جاتے ہوں گے، تو حضرت طیارؓ کی پروازوں کو دیکھتے ہوں گے۔ راشد منہاس جو بمبار طیارے کے غیرت مند پائلٹ تھے، نشانِ حیدرؓ پا گئے۔ یہ نشانِ حیدرؓ بھی حضرت جعفر طیارؓ کے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نام پر ہے۔ وہ حیدرِ کرار تھے۔ راشد منہاس کی غیرت مندانہ پرواز پاک فضاؤں میں اور زمین پر نشانِ حیدرؓ۔ اے مولا کریم جی! فردوس کے آسمان میں حضرت جعفر طیارؓ کے ہمراہ اپنے مجاہد بندے راشد منہاس شہید کو بھی اُڑان عطا فرما (آمین)

راشد منہاس شہید

پاک افواج میں بہادری کا سب سے بڑا اعزاز نشانِ حیدرؓ ہے۔ اس تمغے کے بعد بہادری کا دوسرا بڑا تمغہ ''نشانِ

طیارؓ'' ہونا چاہیے۔ حضرت علیؓ اور حضرت جعفرؓ دونوں بھائی ہیں۔ حضور ﷺ کے چچازاد ہیں اور دونوں ہی حضورؐ کے انتہائی محبوب ہیں۔ دونوں کی دلیریاں لازوال اور اپنی مثال میں لاجواب، باکمال اور بے مثال ہیں۔ حضرت جعفر طیارؓ کا امتیازی مقام یہ بھی ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں شہید ہوئے اور حضورؐ کی مبارک زبان سے جو تمغہ حاصل کیا، اُس نے ''طیار'' کا نام پایا۔

خون میں لتھڑے لباس کے ساتھ تدفین

جنگِ اُحد میں اپنے شہید والد کی بات بتاتے ہوئے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ نے اُن کے خون کے ساتھ اُنھیں دفن کرنے کا حکم دیا۔ غسل بھی نہیں دیا اور جنازہ بھی نہیں پڑھا۔ (بخاری 1343) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بتاتے ہیں کہ ''اُحد کے شہداء کو غسل نہیں دیا گیا۔ اُنھیں اُن کے خون (میں لتھڑے لباس) میں ہی دفن کر دیا گیا اور اُن پر نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھی گئی۔'' (ابوداؤد: 1335۔ حسن)

قارئین کرام! مندرجہ بالا احادیث سے چار باتیں ثابت ہوئیں:

1۔ دشمن کے خلاف لڑ کر اپنی ریاستی کمان میں جو شہید ہو
2۔ اُسے غسل دینے کی ضرورت نہیں۔
3۔ اُسے کفن کی ضرورت نہیں۔ اُسے معرکے میں پہنے ہوئے خون آلود لباس یا وردی میں ہی دفن کر دیا جائے۔
4۔ اُس پر نمازِ جنازہ پڑھے بغیر ہی دفن کر دیا جائے۔

اللہ اللہ! کس قدر اونچا مقام ہے شہادت کے خون کی تکریم کا، لیکن یہ اُس خون کی تکریم کی بات ہے کہ جو خون رب کے سامنے، معرکے میں پیش ہو۔ چونکہ ایسا کرنے والا اپنے اللہ سے ملاقات کے لیے خون کو بہانے کا جذبہ رکھتا ہے، اِس لیے اُسے تکریم کے اعلیٰ ترین تمغوں کے ساتھ دنیا میں ہی نمایاں کر دیا گیا ہے۔ یاد رہے! اللہ کے رسولؐ نے اُحد کے شہداء کا جنازہ بھی پڑھایا ہے۔ آپؐ کے چچا جان حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ آپؐ کے سامنے تھے۔ شہداء لائے جاتے تھے اور وہ اُٹھا لیے جاتے تھے جبکہ حضرت حمزہؓ کا مبارک جسم اسی طرح آپؐ کے سامنے رہا۔ یوں حضورؐ نے جنازہ پڑھایا بھی ہے۔ دونوں عمل حضورؐ سے ثابت ہیں، جبکہ علماء کے نزدیک پہلا عمل افضل ترین ہے۔ دوسرے کی اجازت ہے کہ جنازہ بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ غسل بھی دیا جا سکتا ہے۔ کفن بھی پہنایا جا سکتا ہے۔

آنکھ کا قطرہ اور خون کا قطرہ

امام محمد بن عیسیٰ ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ''جامع ترمذی'' میں حدیث لائے ہیں۔ اللہ کے رسول حضرت محمد کریم ﷺ نے فرمایا ''دو قطروں اور باقی رہنے والے دو نشانوں (آثار) سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی شے محبوب ترین نہیں۔ پہلی چیز وہ قطرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ڈر سے آنسو بن کر بہتا ہے اور دُوسرا قطرہ وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں بہایا جاتا ہے (1669۔ حسن) 1965ء کی جنگ میں پاک فوج کے کچھ ایسے سپاہی ضرور ہوں گے جو رات کو اللہ تعالیٰ کے ہاں آنسو بہاتے اور دِن کو اپنا خون اپنے رب کی خدمت میں پیش کرتے ہوں گے۔ رات کی تنہائیوں میں آنسو کون دیکھتا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ اور اِس کے بندے کا معاملہ ہے۔ اللہ اللہ! رحمٰن مولا اور قدردان رَب کریم کے ہاں تو ایک آنسو کی بہت بڑی شان ہے۔ خون کے ایک قطرے کی بڑی آن بان ہے جبکہ بہت سارے آنسو مل جائیں اور بہت سارے قطرے بہ جائیں، تو اُن کی شان کیا ہوگی؟ پھر وہ آنسو جو رات کو گھروں اور مسجدوں میں بزرگوں اور بیبیوں نے بہائے، وہ مولا کریم کو کس قدر پسند آئے ہوں گے۔

وہ زمین جہاں خون گرے

حضرت جابرؓ کے والدِ گرامی حضرت عبداللہؓ غزوۂ اُحد میں شہید ہو گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ میری

پھوپھی نے میرے والد اور میرے ماموں کو برابر برابر اُونٹ پر (دونوں جانب) سوار کیا ہوا ہے۔ وہ دونوں کو مدینہ لائیں تاکہ ہمارے محلے کے قبرستان میں دفن کر دیں۔ (یہ قبرستان بنی سلمہ کا قبرستان تھا)۔ اچانک کیا دیکھا کہ ایک شخص منادی کرتا ہوا اعلان کر رہا تھا کہ ''خبردار ہو جاؤ! اللہ کے رسولؐ تمہیں حکم دے رہے ہیں کہ اپنے مقتولوں کو واپس لے جاؤ اور اُنھیں اُن کے معرکے والے میدان میں اُس جگہ دفن کرو جہاں وہ قتل کیے گئے۔'' چنانچہ ہم اپنے دونوں (شہداء) کو واپس لے گئے اور دونوں کو وہاں دفن کر دیا جہاں وہ قتل کیے گئے تھے۔ (مسند احمد: 15281۔ ابوداؤد: 3165۔ ابنِ ماجہ: 1516 صحیح لِلالبانی) قارئین کرام! علماء کی رائے ہے کہ کسی جنگی یا کسی دوسری حقیقی مجبوری کے بغیر شہید کو دوسری جگہ منتقل نہ کیا جائے۔ افضل و اعلیٰ یہی ہے کہ شہداء کو اُن کی شہادت کی جگہ یا شہادت کے میدان میں یا وہیں قریب ترین قبرستان میں ہی دفن کیا جائے۔ لوگو! اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کے مندرجہ بالا حکم کی حکمت قرآن میں ملاحظہ کر لو۔ حضرت ابوہریرہ ؓ بتاتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ''یومئذٍ تحدث اخبارھا'' اس (قیامت کے) دن یہ زمین اپنی خبروں کو بیان کرے گی۔ آیت سنا کر حضورؐ نے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے پوچھا۔ کیا تم جانتے ہو، اس کی خبریں کیا ہوں گی؟ صحابہؓ نے عرض کیا۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اس پر آپؐ نے آگاہ فرمایا کہ ہر مرد اور عورت نے زمین کی سطح پر جو عمل کیا، زمین اس کا مشاہدہ کروائے گی اور مخاطب کر کے کہے گی، تم نے میرے (سینے) پر فلاں فلاں دن فلاں فلاں عمل کیا۔ حضورؐ نے فرمایا! یہ ہوں گی زمین کی خبریں (مسند امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ: 8854) اللہ اللہ! زمین قیامت کے دن وہ منظر دکھائے گی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم طائف میں توحید کی دعوت دینے تشریف لے گئے، تو طائف کے تین سردار بھائیوں نے اوباش چھوکروں کو دو لائنوں میں کھڑا کر دیا اور اُن کے پتھروں کی بارش سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاکیزہ خون طائف کی سرزمین کو خوں رنگ کرنے لگ گیا۔ اُحد کی زمین منظر دکھائے گی کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک میں زخم آئے۔ دانت مبارک بھی شہید ہوا اور سرخ و سفید چمکتے نورانی چہرے پر بھی زخموں نے خون بہانا شروع کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ برتن میں پانی لائے۔ وہ پانی بہا رہے تھے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے ابا جان کے زخم دھو رہی تھیں۔ خون رک نہ رہا تھا۔ پھر جنتی عورتوں کی رئیسہ حضرت فاطمہؓ نے چٹائی جلا کر اس کا پھایا اپنے بابا جان کے زخموں پر رکھا، تو خون رک گیا..... مدینہ سے کوئی پندرہ کے قریب خواتین صحابیات مرہم پٹی کرنے جلدی سے یہاں پہنچی تھیں۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت اُم سُلیم رضی اللہ عنہا زخمیوں کی خبر لے رہی تھیں۔ بعض زخمیوں کو پانی پلا رہی تھیں۔ حضرت فاطمہؓ جگر گوشہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم رب کے حبیب کی مرہم پٹی کر رہی تھیں۔ یہ سارے مناظر پاکیزہ خون کے زمین سنائے گی، دکھائے گی۔ حضرت حمزہؓ کے مناظر دکھائے گی۔ حضرت جابرؓ کے والدِ گرامی حضرت عبداللہ، حضرت حنظلہ، حضرت معصب بن عمیر رضی اللہ عنہم سب یہیں مدفون ہوئے۔ دو دو تین تین اکٹھے مدفون ہوئے۔ اللہ اللہ! زمین خبریں سنائے گی اور شہداء خون میں لت پت اسی معرکے کے میدان سے اُٹھیں گے۔

لاش محفوظ، ہاتھ کا تازہ خون

اُحد کے معرکے کو چھیالیس سال بیت گئے۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی حکمرانی کا زمانہ تھا۔ حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ اُحد کے پاس سیلاب آ گیا۔ اس سے قبروں کو نقصان پہنچا۔ ہم ان قبروں کے پاس گئے۔ (پتھریلی مٹی) کو ہٹاتے ہوئے حضرت حمزہؓ کے پاؤں پر کدال لگ گئی، تو تیزی سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ ہم نے شہداء کو قبروں سے نکالا اور دُوسری جگہ منتقل کیا۔ ہم نے ان (شہداء) کو ایسا تروتازہ پایا

جیسے وہ کل ہی فوت ہوئے ہیں۔ (موطا امام مالک: 470/2 الاصابہ: 163/4۔ مغازی ابنِ اسحٰق، مسند احمد: 15281)

حضرت جابرؓ مزید کہتے ہیں کہ ہم نے قبر کی مٹی کو کھودا اور جب میں نے اپنے والد حضرت عبداللہؓ کو دیکھا، تو وہ اپنی اسی ہیئت پر سوئے ہوئے تھے (جس پر ہم نے اُنھیں لٹایا تھا)۔ ہم نے اُن کی قبر میں اُن کے ساتھی (اپنے ماموں) حضرت عمرو بن جموحؓ کو دیکھا۔ اُن کا ہاتھ زخمی تھا۔ اُن کو اٹھایا گیا، تو

اُن کے زخم سے خون پھوٹ پڑا۔ اب دونوں کو الگ الگ قبر میں دفنا دیا گیا۔ (الطبقات ابنِ سعد: 562/3، 563)

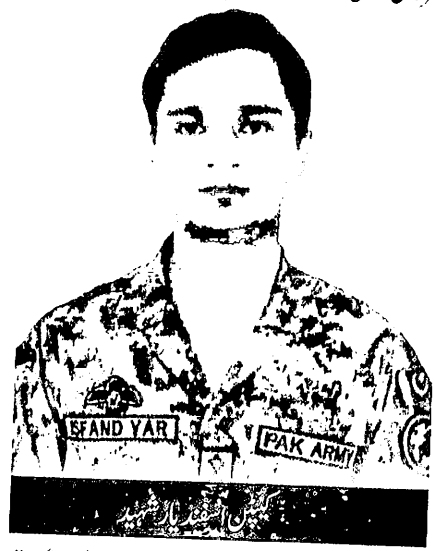

قارئینِ کرام! شہادت کے میدان میں یہ ہیں شہادت کے خون کے رنگ جو ربِ کریم نے دکھائے۔ 46 سال بعد دکھائے۔ اُس وقت دکھائے جب اُحد کی جنگ میں لڑنے والے کئی صحابہؓ زندہ تھے۔ حضرت جابرؓ جو بیان کر رہے ہیں، وہ خود زندہ تھے۔ معرکۂ اُحد کے غازی تھے اور اپنے باپ اور ماموں کو دفن کرنے والے تھے۔ سبحان اللہ! کیا بات ہے شہادت کے خوبصورت رنگوں کی۔ یا مولا کریم! مرنے کے بعد اُن شہدا سے ملاقات اور اُن کے دیدار سے مشرّف اور معزز فرما دینا (آمین)۔ یہاں ہم پاک فوج کے ایسے دو شہیدوں کی بات کریں گے جن کے خون کی تازگی ایمان کو حرارت بخشنے والی ہے۔

شہید کے ہاتھ پر مرہم پٹی کرنا پڑی

میں جس بستی میں رہائش پزیر ہوں، وہاں سیکورٹی کے لیے پاک فوج کے ریٹائرڈ سپاہیوں کی خدمات لی جاتی ہیں۔ کوئی چار پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ سخت سردیوں کے دن تھے اور میرے گھر کے ساتھ سیکورٹی والوں کے پڑاؤ کا جنکشن بنا ہوا تھا۔ میں نے اُنھیں لکڑیاں لا کر دے دیں تاکہ وہ سردی کی شدت کو کم کرتے رہیں۔ بعض اوقات اُن کے ہمراہ بیٹھ بھی جاتا۔ ایک دن دورانِ گفتگو ایک سپاہی کہنے لگا کہ بارڈر پر بیدیاں کے قریب وہ ڈیوٹی پر تھا۔ سمگلروں کی فائرنگ سے ہمارا ایک جوان شہید ہو گیا۔ ہم نے اپنے قریبی قبرستان میں اُسے دفن کرنے کا پروگرام بنایا جہاں 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں شہید ہونے والے مدفون تھے۔ ہم نے اپنے جوان کے لیے قبر کی کھدائی شروع کر دی۔ کھدائی کے دوران نیچے سے ایک جسم کے ہاتھ پر کدال لگنے سے زخم ہو گیا اور خون بہنے لگا۔ خون نہیں رُک رہا تھا، حتیٰ کہ ہم نے قریبی گاؤں سے ڈسپنسر کی خدمات حاصل کیں۔ اُس نے مرہم پٹی کی تب جا کر خون بند ہوا۔ غالب امکان یہ ہے کہ یہ شہید 1965ء میں شہید ہوا تھا۔ اس لحاظ سے اندازہ لگائیں تو 1965ء کی جنگ کو ہوئے آج 2020ء میں پچپن سال ہو چکے ہیں۔ مجھے اس واقعے کا پتا کوئی پانچ سال پہلے چلا۔ جس فوجی نے اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ مجھے سنایا، اُس نے کوئی دس سال پرانا واقعہ سنایا۔ اس طرح شہید فوجی کی لاش چالیس سال بعد بھی تازہ تھی اور اس قدر تازہ تھی کہ ہاتھ پر لگنے والے زخم کی مرہم پٹی کرنا پڑی۔ اب ہم اپنے آج کے دور کا ایک واقعہ ملاحظہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فیاض بخاری پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ ان کا گھرانا ایک دین دار علمی گھرانا ہے۔ وہ اٹک کے رہنے والے ہیں۔ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے۔ پوسٹ مارٹم کے اسپیشلسٹ ہیں۔ اُن کی اہلیہ محترمہ نے اپنے گھر میں ایک مدرسہ بنا رکھا ہے جہاں وہ بچیوں کو ترجمہ اور تفسیر پڑھاتی ہیں۔ اُن کا انتہائی ہونہار بیٹا جس نے کاکول اکیڈمی میں سورڈ آف آنر حاصل کی، اسفند یار بخاری تھا۔ کیپٹن اسفند یار بخاری کو مستقبل کا آرمی چیف کہا جاتا تھا۔ انتہائی ذہین، قابل، فرض شناس، پانچ وقت کا نمازی اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا۔ اٹک میں دہشت گردوں نے حملہ کیا، تو اُس نے اُن کے حملے کو ناکام بنایا اور آخر سینے پر گولی کھا کر شہید ہو گیا۔ تب جنرل راحیل شریف آرمی چیف تھے۔ وہ شہید کے گھر پہنچے۔ اس واقعہ کے کوئی ایک ڈیڑھ سال بعد اٹک میں ایک جلسے میں جانا ہوا، تو وہاں ڈاکٹر فیاض بخاری موجود تھے۔ اسٹیج پر اُنھوں نے بھی گفتگو فرمائی۔ ہم نے کھانا بھی اکٹھے کھایا۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ جب میں اپنے شہید بیٹے کو دیکھنے گیا، تو تب تک کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے بیٹے کے چہرے سے کفن ہٹایا۔ سینہ دیکھا، تو تازہ خون رِس رہا تھا۔ میں نے آفیسرز سے کہا کہ خون تو متواتر رِس رہا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ ہم بھی یہ منظر دیکھ رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا نظارہ کر رہے ہیں۔ خون متواتر صاف کیا جا رہا ہے، مگر رُک نہیں رہا۔

ڈاکٹر فیاض بخاری مجھے بتانے لگے۔ ''حمزہ صاحب! میں نے ساری زندگی پوسٹ مارٹم کیے، مگر ایسا منظر اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔ معرکے کے شہید کی بات ہی کوئی اور ہے۔ ڈاکٹری نکتۂ نظر سے فوت ہونے والا ہو یا گولی لگ کر قتل ہونے والا، وہ سیدھا لیٹا ہوتا ہے۔ دل بند ہو جاتا ہے۔ جسم میں خون کی گردش ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا خون نیچے کمر کی تہ میں چلا جاتا ہے اور وہاں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ہر مردہ انسان کا جسم پیلا پڑ جاتا ہے۔ خون نیچے اس لیے بھی جاتا ہے کہ زمین کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ یہ عمل تین سے چار گھنٹے تک مکمل ہو جاتا ہے، مگر اسفند یار جسے چھتیس گھنٹے بعد دفنایا گیا، اُس وقت بھی اُس کا خون جاری تھا اور متواتر صاف کیا جا رہا تھا۔ لتھڑے کپڑے اور ٹشو ہمارے گھر میں پڑے ہیں۔ یہ منظر دیکھنے والے لوگ سینکڑوں میں ہوں گے۔ میں ایک ڈاکٹر ہوں۔ میڈیکل سائنس کے پاس اِس کا کوئی جواب نہیں۔ مَیں نے کہا ڈاکٹر صاحب! یہ تو اللہ کی طرف سے اعزاز ہے۔ میڈیکل سائنس مادی ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا اعزاز اُگلے جہان کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جو ہمیں مادی دنیا میں دکھائی دی ہے۔ بیچاری میڈیکل سائنس اِس کا جواب نہیں دے سکتی۔ اِس کا جواب صرف ایمان دیتا ہے۔ شہادت کے ایمانی خون کا سلسلہ آخری رسول گرامی حضرت محمد کریم ﷺ کے محبوب چچا جان سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت عمرو بن جموحؓ سے شروع ہوتا ہے اور اگر اسلامی جنگوں کی تاریخ میں ساڑھے چودہ سو سالوں کے پاک باز مجاہدوں کے خون کے ایسے تاریخی نظائر ڈھونڈ کر لائے جائیں، تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ کشمیر کے ہزاروں شہداء کی داستانوں میں یہ نمایاں ترین ہے۔ یہ سلسلہ رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ جب قیامت کا دن ہوگا، تو سماں کچھ یوں ہوگا!

خون کا رنگ سرخ، مگر خوشبو کستوری کی

حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا، ''اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد ﷺ کی جان ہے، کوئی بھی ایسا زخم کہ جو اللہ کی راہ میں لگتا ہے، وہ قیامت کے دن اپنی اسی شکل میں سامنے آجائے گا کہ جب وہ (کسی بھی آلے تلوار، بندوق وغیرہ) سے لگا تھا۔ اس زخم کا رنگ تو خون جیسا (سرخ) ہی ہوگا، مگر اس سے خوشبو کستوری کی آئے گی۔ (بخاری: 36۔ مسلم: 1876) قارئین کرام! اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب آگاہ کرتی ہے کہ پہلے صور یعنی نفخہ کے بعد ساری

آنحضرت ﷺ کو دونوں لاڈلوں حسنؓ اور حسینؓ سے بے حد محبت تھی۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ ﷺ دولت خانے سے باہر تشریف لائے۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ ﷺ کی چادر مبارک میں کوئی چیز چھپی ہوئی ہے۔ عرض کیا، آپ ﷺ نے کیا چھپا رکھا ہے؟ آپ ﷺ نے چادر مبارک ہٹائی تو حسنؓ و حسینؓ برآمد ہوئے۔ فرمایا:

''یہ دونوں میری بیٹی کے لختِ جگر ہیں۔ اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت کرتا ہوں۔ تو بھی ان سے محبت فرما اور جو ان دونوں سے محبت رکھے ان سے بھی محبت فرما۔''

☆..... حسنؓ اور حسینؓ کم سن تھے۔ بھاگے بھاگے آتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نماز میں مصروف ہوتے سر یہ ان کے شانۂ اقدس پر بیٹھ جاتے۔ آنحضرت ﷺ سجدہ طویل کر دیتے تھے تاکہ دونوں شہزادے لاثانی نانا ﷺ کے شانۂ محبت و مرحمت سے جی بھر کے فیضیاب ہوتے رہیں۔

کائنات تباہ ہو جائے گی۔ موجودہ زمین کو ایک دوسری (نئی) زمین کے ساتھ بدل دیا جائے گا۔ اِس دوران ایک وقفے کے بعد دوسرا صُور پھونکا جائے گا اور تمام اِنسان نئی زمین پر اپنے اللہ کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔ قرآن بتاتا ہے ''زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اُٹھے گی۔ نامۂ اعمال سامنے کر دیے جائیں گے۔ انبیاء اور شہداء کو (انتہائی تکریم کے ساتھ) لایا جائے گا اور لوگوں کے درمیان حق سچ کے فیصلے کر دیے جائیں گے اور کسی پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔'' (الزمر:69)

شہدا سے مراد تمام اُمتوں کے گواہ ہیں یعنی وہ لوگ جنہوں نے حق کی دعوت کو آگے پہنچایا۔ وہ گواہی دیں گے کہ اے اللہ! آپ کے انبیاء نے اپنی نبوت و رسالت کے پیغام کو پورا پورا ہم تک پہنچا دیا۔ آخری اُمت کے سرفہرست گواہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوں گے، حضرت خدیجہؓ اور حضرت علیؓ ہوں گے کہ جنہوں نے سب سے پہلے حضور ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی۔ تمام اُمتوں کے علماء اور داعیان بھی گواہی دیں گے۔ شہداء سے مراد تمام اُمتوں کے وہ عظیم لوگ بھی ہوں گے جنہوں نے اپنا خون پیش کر کے گواہی دے دی ہے کہ نبیوں اور رسولوں کی دعوت ہم تک پہنچی اور ہم نے اِس کی بنیاد پر اپنا خون بہا دیا۔ حضرت محمد کریم ﷺ کی اُمت کے اُن شہداء میں سرِفہرست حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی رضی اللہ عنہم اور وہ تمام شہدا ہیں جنہوں نے ایمان کی بنیاد پر اپنا خون اللہ کی راہ میں پیش کیا۔ یہ شہداء جب اللہ تعالیٰ کے دربار میں انبیاء کے ساتھ (عزت و احترام) کے ساتھ لائے جائیں گے، تو ان کے اعزاز کی کیا بات ہوگی کہ ان کے زخم تازہ ہو جائیں گے۔ خون بہے گا، رنگ تو خون جیسا ہوگا، مگر خوشبو کستوری کی ہوگی..... یعنی حشر کے میدان کی یہ ایسی خوشبو ہوگی کہ اسے دیکھ کر فرشتوں کو احساس ہوگا کہ ہم نے ان کے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے اللہ کے حکم سے سجدہ کیا تھا، تو ٹھیک کیا تھا۔ ابلیس اور اُس کی اولاد روئے گی کہ ہم ان کے ساتھ ٹکراتے رہے۔ ہم اور ہمارے ماتحت تو جہنم میں جا رہے ہیں۔ یہ اعزاز پا گئے ہیں۔

اے رحمٰن مولا کریم! اب ہمیں کوئی دن ملے تو 6 کلمہ سے بڑھ کر تیری مدد کا علمبردار دن ملے اور روزِ قیامت ''کستوری خون'' کے تمغے سے کوئی محروم نہ رہے (آمین)

قاضی ظہور الحسن

کشمیر کی آشا

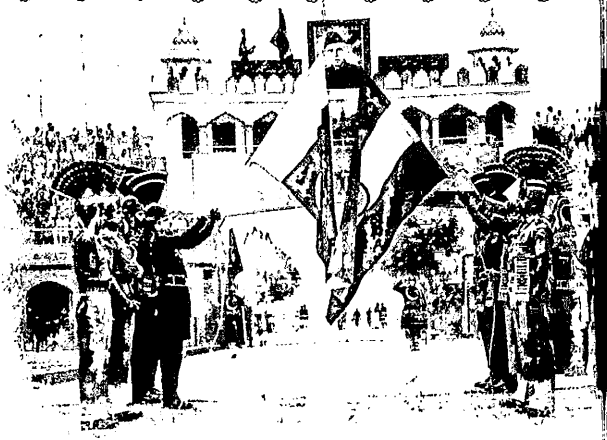

کشمیر میں چند روز میری زندگی کے وہ لمحات ہیں جو میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب بھارتی کشمیر ہمارے لیے ایک شجرِ ممنوعہ تھا۔ یہ جولائی 2004ء کا وہ دِن تھا جب میں پندرہ اسکاؤٹس لے کر سارک سپیشل کیمپ میں شرکت کے لیے بذریعہ ریل بھارت کے راستے کشمیر کے لیے روانہ ہوا۔ ''سمجھوتہ ایکسپریس'' میں مسافروں کی تعداد بہت کم تھی۔ جونہی ریل واہگہ ریلوے سٹیشن میں داخل ہوئی، مسافروں نے چلتی ریل سے اُترنا شروع کر دیا۔ وہ ایک بڑے ہال کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہاں امیگریشن اور کسٹم کے مراحل طے کرنے کے لیے لائن لگ رہی ہے۔ ہم تقریباً آخری مسافر تھے، لیکن ظاہر ہے جب

کشمیری عوام پاکستانی پرچم حاصل کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کرتے رہے

کورونا لاک ڈاؤن اور کشمیر کا (لاک ڈاؤن) کرفیو

پاکستان، انڈیا، چین اور تبت کے درمیان گھرا ہوا خطہ کشمیر جسے جنت نظیر کہتے ہیں، گزشتہ سال سے مسلسل کرفیو کی زد میں ہے اور یہ کرفیو دنیا بھر کے حالیہ لاک ڈاؤن سے یکسر مختلف ہے۔ کشمیر کا ذکر آتے ہی بے مہری ایام کی کربناک داستان ذہن و دماغ کی وادیوں میں گونجنے لگتی ہے۔ ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پر مجبور ان گنت تصویریں اُبھرتی ہیں۔ اگرچہ ڈوگرہ راج کے عہد خون آشام سے لے کر حالیہ کرفیو تک کشمیر کے عوام نے آشفتگی و دیوانگی کے ان مٹ نقوش ثبت کیے ہیں تاہم مودی سرکار کے دورِ فسوں کار میں جبر و تسلط کی جن بے مہر روایات نے جنم لیا، ان کا خاتمہ نہ جانے کب ہو گا۔ مقبوضہ کشمیر کے عوام گزشتہ سال سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر گزرتے سمے روح و بدن کا ناتا کمزور سے کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جسم و جان کا رشتہ کچی ڈور سے بندھا ہوا ہے۔ عشق بلا خیز کا یہ قافلہ سخت جاں معلوم نہیں کب اپنی منزل کو پہنچے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت تک ظلم و ستم کی بے پناہ داستانیں لکھی جا چکی ہوں گی۔ مقبوضہ کشمیر میں جاری کرفیو باقی دنیا کے کرفیو سے بوجوہ مختلف ہی نہیں ہزار گنا زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ بھی ہے۔ کورونا وائرس کی وجہ سے لگنے والے جزوی کرفیو کا سامنا کرنے کے بعد دنیا اب بہتر طور پر کشمیر کے کرفیو کا ادراک کر سکتی ہے۔ حیاتِ انسانی کے رموز و غوامض سے آشنا جتنے بھی دانشور اور مبصرین انسانیت کا پرچار کرتے ہیں انھیں اس لفظ کی حرمت کے صدقے مودی سرکار کے دست تطاول کو روکنے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور وادی میں محبوس و محکوم کشمیری مسلمانوں کی خبر گیری کرنی چاہیے۔ (کالم نگار: نورین فاروق ابراہیم)

تک آخری مسافر کلیئر نہ ہو جائے، ریل گاڑی روانہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لیکن ہم ٹھہرے پاکستانی جنھیں ہر کام کی جلدی ہوتی ہے۔

وچھوڑا کیا ہوتا ہے؟

یہاں معلوم ہوا کہ پاکستانی ہندو یاتریوں کا ایک بڑا جتھا بھی کشمیر روانہ ہو رہا ہے۔ اُن کے لیے پاکستان کی طرف سے پاسپورٹ اور انڈیا کی طرف سے ویزا کوئی مسئلہ نہ تھا جبکہ ہمارے لیے کشمیر جانا یقیناً ایک ناقابلِ یقین امر تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ایک تو یہ ریلی سارک کے حوالے سے تھی، دوسرا یہ کہ اس سے پہلے اپریل 2004ء میں ہونے والی اسکاؤٹ جمبوری میں ہم نے بھارت سے ایک سو چالیس اسکاؤٹس کو اسلام آباد مدعو کیا تھا جس میں چالیس کشمیری مسلمان اسکاؤٹس تھے جنھیں ملنے کے لیے اُن کے کشمیری رشتے دار بڑی تعداد میں آئے جن میں کوئی دادا اور کوئی نانا تھا۔ اُس دن ہمیں احساس ہوا کہ ''وچھوڑا'' کیا ہوتا ہے۔ بچوں سے ملنے کا والہانہ انداز اور آنسوؤں کی برسات، جذبات کا سمندر اور جدا ہونے کا انداز بتا رہا تھا کہ کشمیر کا بٹوارا اور اُس پر ناجائز قبضہ محض زمین کا بٹوارا تو ہو سکتا ہے، دلوں اور رِشتوں کا نہیں۔ میری تحریر کا مقصد بھی یہ ہے کہ میں بتاؤں کہ کشمیری مسلمان پاکستان سے کس قدر محبت کرتے ہیں۔

مہمانوں کی بلاتفریق عزت

2004ء کی اسکاؤٹ جمبوری میں ہم نے بلاتفریق بھارتی مہمانوں کی اس طرح عزت کی کہ واہگہ سے لے کر واپس واہگہ تک اُن کا ایک پیسہ خرچ نہ ہونے دیا۔ آخری دن ڈنر تھا۔ ہماری متعلقہ وزیرِ تعلیم محترمہ زبیدہ جلال جو ہماری چیف کمشنر بھی تھیں، اُن کی طرف سے دعوت پر کینیڈا، سری لنکا اور افغانستان کے سفیر شریک ہوئے، لیکن انڈین ہائی کمیشن کی طرف سے کوئی نہ آیا اور نہ کوئی جواب۔ میں نے اُس وقت کے ہائی کمشنر مسٹر مینن کو اپنے انداز میں شکایت کی کہ آپ کم از کم اپنے بھارتی اسکاؤٹس سے ہی ملنے آ جاتے۔ جواب دیا کہ میں مصروفیت کی وجہ سے نہ آ سکا۔ آپ نے ہمارے اسکاؤٹس کا خیال رکھا، بہت شکریہ۔ اب اگر آپ کو کوئی ویزا وغیرہ کی ضرورت ہو، تو ہم حاضر ہیں۔ لہٰذا جب ہم نے پندرہ سکاؤٹس کے لیے ویزا اپلائی کیا، تو ہمیں تین ہی دن میں ویزا جاری کر دیا گیا۔

سفر کی اجازت نہ ملی

ذکر ہو رہا تھا واہگہ اٹاری کا۔ دن کے بارہ بجے کے قریب ٹرین اٹاری کی طرف روانہ ہوئی۔ عجیب منظر تھا، ٹرین

انڈیا میں داخل ہو رہی تھی۔ خاردار بارڈر کی ڈبل لائن اور تاحدِ نگاہ واچ ٹاورز کی لائن۔ ٹرین کے ساتھ انڈین سپاہیوں کے دوڑتے ہوئے گھوڑے اور دُور تک پھیلے کھیتوں میں کھلے اور لمبے بالوں والے ٹریکٹر چلاتے سکھ جنہیں پہلی نظر میں دیکھ کر گمان ہوتا کہ شاید خواتین ہیں۔ مسجدوں کی جگہ مندروں اور گردواروں پر لہلہاتے گیروے نارنجی پرچم ہمیں بتا رہے تھے کہ اب ہم بھارت میں داخل ہو چکے۔ جلد ہی ہم اٹاری سٹیشن میں داخل ہو رہے تھے۔ اسکول کے بچوں کے بینڈ، اسکاؤٹس اور گرل گائیڈز ہمارے استقبال کے لیے ہار لیے موجود تھے۔ سکھ اسکاؤٹس لیڈر ہر طرح سے ہماری آؤ بھگت کر رہے تھے۔ کھانے کے پیکٹ تقسیم ہوئے۔ چنے اور آلو بھاجی کا بہت مزہ آیا۔

جموں نہیں جا سکتے

ایک صاحب نے نوید دی کہ جموں لے جانے کے لیے بس تیار ہے، لیکن اُس وقت سخت مایوسی ہوئی کہ بھارت سرکار کی طرف سے پہلا واریوں ہوا کہ ہمیں بس کے ذریعے پنجاب سے گزر کر جموں جانے کی اجازت نہیں۔ حیرت یہ کہ ہمارے سکھ لیڈروں کو بھی کوئی پیشگی اطلاع نہ دی گئی اور ہمارے لیے حکم یہ تھا کہ پہلے رات کی ریل سے دہلی جاؤ اور وہاں سے جموں۔ مرتے کیا نہ کرتے، رات تک انتظار کیا۔ انڈیا اسکاؤٹ اور گائیڈوں کی طرف سے بھیجے گئے دو ہندو گائیڈ ہمارے ساتھ تھے۔ اُن کو شاید پہلے سے علم تھا کہ ہمارے ساتھ کیا سلوک ہونے والا ہے۔ دوپہر کا وقت اور رات تک انتظار بہت مشکل تھا۔ سکھ اسکاؤٹ لیڈر بہت معذرت کر رہے تھے کہ ہم نے بس کا کرایہ بھی دیا، لیکن افسوس ہم آپ کی مدد نہ کر سکے۔ ایک سکھ نے خواہش ظاہر کی کہ ہمارے ساتھ گروپ فوٹو بنائیں، لیکن ایک اور سکھ سردار صاحب نے ڈانٹ پلائی کہ مہمانوں کو تنگ نہ کرو۔ ''جب یہ چلے جائیں گے، تو ہم گروپ فوٹو بنا لیں گے۔''

اللہ اللہ کر کے وقت گزرا۔ رات آئی۔ ریل گاڑی روانہ ہوئی۔ اُس وقت تک ہم پر تھکن اور نیند کا غلبہ ایسا تھا کہ جب آنکھ کھلی، تو ٹرین لدھیانہ سے گزر رہی تھی۔ آگ اور دھواں اُگلتی فیکٹریاں، ریلوے لائن کے دونوں طرف دور تک چلی گئیں تھیں۔ یہ وہ لدھیانہ نہیں تھا جو ہم تقسیمِ ہند کے وقت چھوڑ گئے تھے۔ پھر جو ہمیں ہمارے ہندو اسکاؤٹ لیڈر نے جگایا، تو معلوم ہوا کہ انبالہ آ گیا ہے۔ حکم ہوا کہ یہیں اُتر جائیں۔ ہم یہیں سے جموں کی ٹرین پکڑیں گے اور جلد ہی دوسری ٹرین ہمیں جموں لے جا رہی تھی۔ اب ہم پنجاب ہی سے گزر رہے تھے جسے بس کے ذریعے دیکھنا منع اور ٹرین کے ذریعے عبور کرنا جائز تھا۔ یہ کیا حکمتِ عملی تھی، ہماری سمجھ سے باہر تھا کہ ہم ٹرین کے ذریعے بھی پنجاب ہی سے گزر رہے تھے۔

مری کی یاد دلاتا ''پٹنی ٹاپ''

جموں ریلوے اسٹیشن پر بہت سے مرد و خواتین اسکاؤٹ لیڈروں نے ہمارا استقبال کیا اور اسکاؤٹ ہیڈ کوارٹرز لے گئے۔ کھانے کے بعد ہمیں سری نگر کے لیے روانہ کیا۔ ہمارا پہلا پڑاؤ ادھم پور تھا جہاں پہلے سے تیار چیمبر آف کامرس اور اسپورٹس بورڈ انتظامیہ کی طرف سے شام کی چائے اور تحائف کے ساتھ ہمیں روانہ کیا۔ رات بارہ بجے ہم ''پٹنی ٹاپ'' پہنچے۔ یہ مری کی طرح کا پہاڑی مقام تھا جہاں ایک ہوٹل میں ہمارے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔ ہوٹل کے مسلمان مالکان مرد و خواتین ہمارے انتظار میں تھے۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔

اُنھوں نے بتایا کہ ہمارے انتظار میں اُنھوں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ یہاں ہم گوشت اور چکن سے لطف اندوز ہوئے۔ مجھے علیحدہ کمرا دیا گیا۔ ڈنر کے دوران ہوٹل کے مالکان نے بتایا کہ اُن کا تعلق کراچی سے ہے اور وہ ہم سے کھانے اور رہائش کا کچھ بھی خرچہ نہیں لیں گے۔ ہمارے ساتھ آٹھ پولیس اہل کار، ایک مسلمان ڈی ایس پی اور ایک

سکھ گائیڈ بھی تھے۔ سکھ گائیڈ مسٹر گوربخش سنگھ اپنے بچوں سمیت سفر کررہے تھے۔ اُن کے جس بچے کو میں بچی سمجھتا رہا، وہ دراصل لڑکا تھا، لیکن لمبے بالوں کے جوڑے کی وجہ سے میں دھوکا کھا گیا۔ میں نے پوچھا سردار جی آپ کام کیا کرتے ہیں؟ بتایا کہ میں اقبالیات کا پروفیسر ہوں۔ دورانِ گفتگو یہ بھی بتایا کہ کشمیر کی وادیوں سے جب خانہ بدوش ''پالے'' اپنے ریوڑوں سمیت نکلتے ہیں، تو اُن کے بچوں کی تعلیم کے لیے حکومت کی طرف سے اساتذہ بھی ساتھ ہی سفر کرتے ہیں۔ پولیس اہلکاروں میں مسلمان سپاہی میرے کپڑے تک استری کرنے پر اصرار کرتے۔ وہ کشمیری مسلمان بھی تھے اور اِس طرح بلاشبہ مجھ سے زیادہ پاکستان کی محبت میں سرشار تھے۔

''پتنی ٹاپ'' کی سہانی صبح، سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی ہماری بس سری نگر کے لیے روانہ ہوئی۔ سفر لمبا تھا اور راستہ کٹھن۔ دیہاتی ماحول ویسا ہی تھا جیسے کہ مری کا علاقہ۔ فرق صرف یہ تھا کہ پورا علاقہ فوج کی آہنی گرفت میں تھا۔ سڑکوں میں ورلڈ وار ٹو کا منظر تھا۔ پرانے اور بوسیدہ ٹرک فوج کی نقل وحمل کے ساتھ خوفناک گڑگڑاہٹ پیدا کررہے تھے۔ ہر تھوڑے فاصلے پر فوجی کانوائے رواں دواں تھا جو ہمارے سفر کو اور بھی دشوار بنا رہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف قدم قدم پر فوجی اسلحے اور لاٹھیوں سمیت مسلسل چکر لگا رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے گھاس اور جھاڑیوں میں لاٹھی چلاتے کہ کہیں مجاہدین تو نہیں چھپے ہوئے۔ مختصر یہ کہ پورا علاقہ خوف اور دہشت کی علامت تھا۔ بل کھاتی اور مسلسل ڈھلان کی طرف سفر کرتی بس نے آخر دریائے چناب عبور کیا، تو پھر سے بلندی کا آغاز ہوا۔ بالآخر ہم نے بانہال ٹنل عبور کی، تو دور ڈھلانوں پر چاول کی فصل کی بھینی بھینی خوشبو نے ہم پر سحر سا طاری کر دیا۔

اسلام آباد کا ہمشکل ''اننت ناگ''

''اننت ناگ'' جسے اسلام آباد بھی کہا جاتا ہے، میں ہمیں ناشتہ کے لیے ٹھہرنا پڑا۔ صرف مَیں اسکاؤٹ یونیفارم میں تھا جس پر پاکستانی پاکٹ فلیگ نمایاں تھا۔ ہم اسکاؤٹس اور پولیس گارڈ سب ایک ہی ہوٹل میں داخل ہوئے۔ ناشتے کا آرڈر دیا اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے۔ اِتنے میں، مَیں نے محسوس کیا کہ ایک کشمیری نوجوان مجھے مسلسل دیکھے جا رہا ہے۔ پھر وہ میرے قریب آیا اور پوچھا:

''کیا آپ پاکستان سے آئے ہیں؟'' میں نے ہاں میں جواب دیا، تو اُس نے بے ساختہ کہا، ''یہ کیسے ممکن ہے''۔ پھر وہ تیزی سے ہوٹل کے باہر چلا گیا اور جلد ہی ایک جمِ غفیر ہمیں دیکھنے کے لیے ہوٹل میں داخل ہوا۔ خوشی کے جذبات کے ساتھ وہ ہم سے ہاتھ ملانے اور گلے ملنے کو کہہ رہے تھے۔ ہوٹل میں ہندی کے بجائے اُردو میں جگہ جگہ ''خوش آمدید'' کے الفاظ درج تھے۔ ہوٹل کا مالک نہال ہو رہا تھا۔ اُس نے ناشتے کا بل لینے سے انکار کر دیا۔

گلمرگ میں داخلہ

ہم کچھ دیر بازار میں گھومے۔ زعفران، اَخروٹ اور ڈرائی فروٹ کی دکانیں عام تھیں، لیکن ہم کچھ خریدے بغیر روانہ ہو گئے۔ سڑک کے دونوں طرف بہتے پانیوں کے جھرنے اور گھنے درختوں میں گھری کاٹیجوں کے آگے خالی جگہوں پر جگہ جگہ کرکٹ کے بلے اور وکٹیں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ یہ گھریلو صنعت یہاں بہت مقبول ہے۔ اب ہم سری نگر میں داخل ہو رہے تھے، لیکن معلوم ہوا کہ ہم بائی پاس کے ذریعے سیدھے گلمرگ جائیں گے۔ راستے میں دونوں طرف خوبصورت بنگلے اور دُکانیں ہمارے تصور کے برعکس ایک ترقی یافتہ شہر کا منظر پیش کر رہی تھیں اور پھر شہر پیچھے رہ گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے اسلام آباد سے مری کی چڑھائی شروع ہوتی ہے۔ بل کھاتی سڑک اور اَطراف میں چیڑ، دیودار، کرکس اور گریل کے جنگلات کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم آخر گلمرگ میں داخل ہوئے، لیکن حکم ہوا کہ ہم بس میں ہی بیٹھے

رہیں جب تک وزیرِ اعلیٰ جموں کشمیر جناب مفتی سعید صاحب ہمارے استقبال کے لیے تشریف نہ لے آئیں۔

یہ شام مغرب کا وقت تھا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں اور ہلکی پھوار بڑا دِلکش منظر تھا۔ اِتنے میں پولیس کی گاڑیوں کے درمیان سائرن کی آوازوں اور جلتی بجھتی روشنیوں کے درمیان چیف منسٹر بمعہ اپنے اہل وعیال اپنی گاڑی سے اُترے اور پھولوں کے ہار لیے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اب ہمیں اُترنے کی اجازت ملی۔ اُن کی اور اہلِ خانہ کی خوشی دیدنی تھی اور پھر سڑک کے دونوں طرف کھڑی اسکول کی بچیوں نے ہم پر پھول برسائے۔ بے شمار ٹی وی کیمرے تصاویر لے رہے تھے اور اگلے ہی لمحے یہ منظر ی این این کے ذریعے پوری دنیا میں وائرل ہو رہا تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ یہ منظر دیکھتے ہی ہمارے پاکستانی لیڈروں کی غیرت جاگ اُٹھی اور انھوں نے مشہور کر دیا کہ ''پندرہ اسکاؤٹس کا یہ وفد دراصل کنٹرول لائن پر انڈیا کی طرف سے باڑ لگانے کے لیے گیا ہے'' اور پاکستانی اسکاؤٹس کشمیری خواتین کے ساتھ ناچتے ہوئے رنگ رلیاں منا رہے ہیں اور اس سے کشمیر کاز کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا ہے۔

بات کا بتنگڑ

اب ہمیں معلوم ہوا کہ سیاسی لیڈر اخبارات میں کیسے زندہ رہتے ہیں؟ بات کا بتنگڑ کیسے بنتا ہے اور چائے کی پیالی میں طوفان کس طرح برپا کیا جاتا ہے۔ بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا، لیکن طرفہ تماشہ یہ کہ کسی دل جلے نے یہ سوال قومی اسمبلی میں اُٹھا دیا جس کا جواب محترمہ زبیدہ جلال نے یوں دیا کہ وفد کے لیڈر قاضی ظہور کو آنے دیا جائے۔ وہی جواب دیں گے۔ میں جونہی واپس پاکستان آیا، وزارتِ خارجہ کی طرف سے Assembly Question کے حوالے سے وضاحت طلب کر لی گئی جس کا جواب میں نے یہ دیا کہ ''ہم مقبوضہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ سمجھتے ہیں اور اس پر بھارتی تسلط کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس لحاظ سے ہم اپنے وطن میں گئے تھے جس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

یقین جانیے اس کے بعد کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ یہ شوشہ یقیناً اُن لوگوں نے چھوڑا جنھیں یہ بھی اِدراک نہیں کہ کشمیر کاز ہے کیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہر روز مسئلۂ کشمیر کو ''اُجاگر'' کرتے ہیں اور یہ سلسلہ 74 سال سے جاری ہے۔

بات ہو رہی تھی مفتی سعید صاحب (مرحوم) کی طرف سے استقبال کی۔ اُنھوں نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا اور رَوانہ ہو گئے۔ اسکاؤٹس کو خیموں میں جبکہ مجھے ٹورازم کی ایک خوبصورت کاٹیج میں ٹھہرایا گیا۔ کاٹیج کے سامنے وسیع گالف گراؤنڈ، اطراف میں بوائے اسکاؤٹس کے خیمے اور عقب میں گہرے جنگل۔ درختوں سے گرتے پانیوں کا ترنم اور دُور کہیں برف پوش چوٹیاں جن کے پار ہمارا وطن پاکستان تھا۔ ہمارے اسکاؤٹس نے خیمہ زن ہوتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ چھے بائی چار فٹ (4' x 6') کا ایک کشادہ پاکستانی پرچم ایک اونچے بانس پر لہرا دیا۔ مطالبہ یہ آیا کہ یہ جھنڈا اُوپر ڈنڈا چھوٹا کرو۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم پاکستان سے یہی لائے ہیں، یہ چھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اتفاق کہ باقی ملکوں کے جھنڈے چھوٹے تھے جن کے درمیان نمایاں یہ پاکستانی پرچم بھارتیوں کو کھٹک رہا تھا۔ یوں کہیے کہ ہم نے ''سری نگر پر پاکستانی پرچم لہرا دیا تھا'' جو چار دِن تک لہراتا رہا۔

پاکستانی پرچم سے کشمیریوں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک معمر شخص نے بتایا کہ دُور پہاڑ پر بیٹھے ہم صبح سے شام تک اسے تکتے رہتے ہیں۔ ایک دن میں اسکاؤٹ یونیفارم میں چھوٹا سا پاکستانی پرچم سینے پر سجائے کھڑا تھا کہ ایک کشمیری نوجوان نے درخواست کی کہ یہ پرچم مجھے دے دیں۔ میں نے انکار کر دیا۔ وہ بہت مایوس ہو کر جانے لگا، تو میں نے کہا کہ ٹھہرو۔ میں نے جیب سے کچھ پرچم نکالے اور ایک اُس کو دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوا اور دُوسرے ہی لمحے یہ خبر اُس نے شاید عام

کردی کہ ان صاحب کے پاس اور پرچم بھی ہیں۔ میں نے وہ بھی تقسیم کر دیے اور پھر چھینا جھپٹی شروع ہوگئی۔ ہر کوئی یہ پرچم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سب کو انتظار کرنے کو کہا اور اپنے کمرے میں جا کر پانچ سو جھنڈوں کے پلندے سے پرچم لا کر سب کو ایک ایک دے دیا۔ عالم یہ تھا کہ شاید وہ مجھے اُٹھا کر لے جائیں گے، لیکن جلد ہی پولیس نے سب کو کنٹرول کر لیا۔ اور پھر اگلے دو دن یہی معمول رہا کہ لوگ آتے رہے اور میں اُنھیں پاکستانی پرچم پیش کرتا رہا۔ اس کے علاوہ سب سے زیادہ ہجوم ہمارے پاکستانی اسکاؤٹس کے کیمپ میں رہتا۔ لوگ جوق در جوق اپنے بچوں کو ہم سے ملواتے اور دلچسپ بات یہ کہ ایک ہی خاندان دن میں کئی کئی بار ہم سے ملنے آتا۔ اکثر کی خواہش تھی کہ ہم اُن کی دعوت پر اُن کے گھر جائیں، لیکن ہم بوجوہ اُن کے ساتھ نہیں جا سکتے تھے۔

کچھ ہائی رینکنگ پولیس افسران میرے سامنے پیار حاصل کرنے کے لیے سر جھکا دیتے۔ میں نے محسوس کیا کہ پرچم حاصل کرنے والوں اور آشیرباد حاصل کرنے والوں کو قطعاً خوف نہیں کہ وہاں انڈین انٹیلی جنس بھی موجود ہے۔ میں نے احساس دلایا، تو جواب ملا کہ ہم کسی سے خوف زدہ نہیں۔ ملنے والوں میں وہ اسکاؤٹس بھی تھے جو اس سے پہلے اسلام آباد آ چکے تھے۔ ایک کشمیری نوجوان کہہ رہا تھا کہ ''سر ہمیں کسی طرح یہاں سے نکال دیں۔ ہمیں کسی بھی ملک بھجوا دیں، ہم شکر گزار ہوں گے''، لیکن یہ ہمارے اختیار میں نہ تھا۔

''سری نگر'' میں قیام

ایک بزرگ نے روتے ہوئے استدعا کی کہ پاکستان جاتے ہی فیصل مسجد میں میری طرف سے دو نفل ادا کرنا۔ اختتامی تقریب میں ہر دو طرف سے مفتی فیملی کو تحفے پیش کیے اور ہم نے بھی وصول کیے۔ کیمپ ختم ہوا، تو معلوم ہوا کہ اب ہمارا قیام ''سری نگر'' میں ہو گا۔ یہاں ہمیں ٹورازم ڈیپارٹمنٹ کے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرایا گیا جس کے انچارج مسٹر عزیز وانی تھے۔ مسز وانی ہماری خاطر مدارت میں پیش پیش تھیں۔ ہوٹل کیا تھا بس لکڑی کے کام کا عظیم شاہکار تھا۔ جناب عزیز وانی نے درخواست کی کہ پاکستان جا کر میں اُن کے لیے فوڈ فیسٹیول کا اہتمام کروں جس میں وہ کشمیری کھانے پیش کر سکیں، لیکن چونکہ یہ میرا شعبہ نہیں تھا لہٰذا میں کچھ نہ کر سکا۔

رات مجھے خیال آیا کہ پاکستان اپنے گھر فون کروں۔ معلوم ہوا کہ یہاں سے پاکستان رابطہ ناممکن ہے۔ ہاں البتہ ہم اور کسی بھی ملک میں فون کر سکتے ہیں۔ فون کرنے کے لیے ہوٹل سے باہر نکلا، تو دو پولیس والے بھی ساتھ ہو لیے۔ اُن کا کہنا تھا وہ ہماری حفاظت کے لیے ہیں، لیکن جب میں فون کر رہا تھا، تو وہ دونوں میری گفتگو سن رہے تھے۔ یہ کال میں نے اپنی بیٹی کو امریکا میں کی کہ وہ پاکستان میں بتا دے کہ ہم خیریت سے ہیں۔

ڈل جھیل کی سیر

سری نگر میں ہمارا دوسرا دن بڑا مصروف تھا۔ ہمیں مشہور مغل گارڈن لے جایا گیا جو شالیمار گارڈن کا چھوٹا نمونہ تھا۔ وہاں سے درگاہ حضرت بل شریف جہاں باہر نکلتے ہی ہمیں بہت سے ٹی وی کیمرا والوں نے روک لیا اور ہمارے خیالات جاننا چاہے جن کا ہم نے بہت محتاط انداز میں غیر سیاسی جواب دیا۔ یہاں سے ہمیں پہاڑ کے دامن میں واقع ایک ہوٹل میں کھانا دیا گیا اور پھر ڈل جھیل کی سیر کرائی گئی۔ ہماری کشتیوں کے ساتھ کشمیری لوگ مختلف تحائف اور پھولوں سے لدی کشتیاں بھی دوڑا رہے تھے۔ ہم نے بلاضرورت اُن سے خریداری بھی کی۔ شام ہونے کو تھی۔ ہمارا قافلہ کسی پولیس اکیڈمی میں لے جایا گیا۔ یہاں ایک وسیع میدان میں ایک براس بینڈ، ایک پائپ بینڈ اور ایک آرکیسٹرا کا بندوبست کیا گیا تھا۔ اسکول کے بچوں نے ایکل ڈسپلے پیش کیا۔ اس دوران وہاں کے آئی جی ہمیں بریف کرتے رہے۔ چاروں طرف

دور بیٹھی فیملیاں بھی اس فنکشن سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

صرف اور صرف پاکستانی اسکاؤٹ

رات ہونے کو تھی۔ ہمیں اب وزیر اعلیٰ ہاؤس پہنچا دیا گیا جہاں چیف منسٹر صاحب کی طرف سے ڈنر کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں مفتی سعید بمعہ بیگم صاحبہ اور اپنی بیٹی محبوبہ مفتی کے ساتھ تشریف لائے۔ میں نے پوچھا کہ یہاں تو سارک کے اور ممالک کے اسکاؤٹس بھی آئے ہوئے ہیں۔ کیا انھیں مدعو نہیں کیا گیا۔ مفتی صاحب نے جواب دیا کہ نہیں۔ ''پاکستان اور صرف پاکستانی اسکاؤٹس'' مجھے اور کسی سے کوئی غرض نہیں۔

کھانے کے دوران میں نے پانک کا سالن ڈالا، تو محبوبہ مفتی جو کہ بعد ازاں خود وزیر اعلیٰ رہیں، تشریف لائیں اور کوفتے یعنی گشتابہ کا سالن ڈالتے ہوئے کہا کہ قاضی صاحب یہ گھاس چھوڑیں، گوشت کھائیں۔ کشمیر سے باہر یہ بھی نہیں ملے گا۔ اتنے میں ایک اسکاؤٹ میرے پاس آیا اور سرگوشی کے انداز میں کہا کہ ''سر، پرسوں ہمیں واپس جانا ہے اور اٹاری بہت دور ہے۔ ویزا ختم ہو رہا ہے۔ سوچیں کیا کرنا ہے۔ ہم دہلی بھی نہ جا سکے۔ کچھ کریں۔''

مفتی صاحب نے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے؟ میں نے کہا کہ ہمارا ویزا ختم ہو رہا ہے اور ہم دہلی بھی نہیں جا سکے۔ فرمایا آپ نے کہیں نہیں جانا۔ تین دن اور ٹھہرنا ہوگا۔ میں نے کہا کہ سر ہمارا تو ویزا ختم ہو رہا ہے۔ بولے، ''آپ کا ویزا ایک ہفتہ بڑھا دیا گیا ہے۔''

''لیکن سر ویزا کون دے گا؟''

وہ بولے ''قاضی صاحب آپ جموں کشمیر کے وزیر اعلیٰ سے بات کر رہے ہیں۔ جب حکم دیا ہے، تو حکم کی تعمیل لازمی ہے۔ آپ دہلی پہنچیں گے، تو ویزا کی توسیع کا اندراج ہو جائے گا۔ اور ہاں آپ کو کل صبح پہلگام جانا ہے۔ میں نے آپ کے لیے وہاں ہوٹل کا بندوبست کر دیا ہے۔ آپ ایک رات وہیں ٹھہریں گے۔''

پہلگام کا سفر

اگلی صبح ہمیں پہلگام پہنچا دیا گیا۔ دریا کے کنارے ایک بہت اعلیٰ درجے کا ہوٹل اور بہترین کمرے ہمارے لیے تیار تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سوچا کہ باہر نکل کر پہلگام کی سیر کی جائے۔ ہم نے ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا کہ کچھ فنکار اور سازندے اپنے موسیقی کے آلات سمیت گاڑی سے اُتر رہے ہیں۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ہماری ہی تفریحِ طبع کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اور واقعی ڈنر کے بعد جو انھوں نے کشمیری گانے اور ڈرامے پیش کیے، تو آدھی رات گزر گئی۔

پہلگام بالکل مری کی طرح کا صحت افزا مقام ہے۔ وہاں ہم نے کچھ کشمیری شالیں اور کڑھائی والے سوٹ خریدے۔ دکانداروں نے خاص رعایت فرمائی۔ اگلے دن ہمیں جموں ریلوے سٹیشن پہنچا دیا گیا۔

ایک انوکھا واقعہ

ایک واقعہ یہ ہوا کہ ہماری بس کو یک طرفہ ٹریفک کی وجہ سے بانہال ٹنل پر رکنا پڑا۔ بس رکتے ہی ایک شخص بس میں داخل ہوا اور پوچھا کہ ''آپ لوگ کون ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟'' میں نے کہا کہ ''ہم پاکستانی ہیں''۔ یہ سنتے ہی وہ جیسے اچھل پڑا اور کہا کہ پاسپورٹ دکھائیں۔ میں نے کہا ٹھہرو اور ساتھ ہی میں ایک اسکاؤٹ کو بس کے آگے پروٹوکول جیپ سے ڈی ایس پی صاحب کو بلا بھیجا۔ جنھوں نے آتے ہی اُس شخص سے پوچھا کہ تم کون ہو۔ وہ شاید کوئی ادنیٰ ملازم تھا۔ ڈی ایس پی صاحب نے کہا کہ تمھیں جرأت کیسے ہوئی کہ تم نے مہمانوں کو تنگ کیا۔ نیچے اترو اور دفع ہو جاؤ۔

پہنچے ہوئے بزرگ سادھو

پہلگام سے روانگی کے وقت دیکھا کہ ہندو یاتریوں کا وفد جو لاہور سے سوار ہوا تھا، یہاں امرناتھ کی یاترا کے لیے پہلے سے پہنچا ہوا تھا۔ ہمارے ہاں کی طرح کچھ ''پہنچے ہوئے'' بزرگ سادھو بھی نظر آئے۔ کچھ کے بال ایسے کہ جیسے کبھی نہائے

ہی نہیں۔ ناخن اتنے لمبے کہ ان سے چھری کانٹے کا کام لیا جا سکتا تھا۔ کچھ سگ زدہ ایسے کہ اُن کی وجہ سے کتوں کو خارش لگ جائے۔ اور کچھ خود ہی لوہے کی زنجیروں میں قید عجیب حلیے میں تھے۔ خیر دوسری صبح پہلگام سے روانہ ہوئے۔ ٹرین میں فرسٹ کلاس کا ڈبہ مفتی صاحب کی طرف سے بُک تھا۔

ٹرین اگلی صبح دہلی پہنچی، تو ایک پولیس اہل کار چلتی ٹرین میں ہمارے کمپارٹمنٹ میں آ گیا اور پاسپورٹ طلب کیے۔ پہلے تو ہم پریشان ہوئے، لیکن معلوم ہوا کہ وہ حکم کے مطابق ویزوں کے لیے پاسپورٹ طلب کر رہا ہے۔ میں نے پاسپورٹ اکٹھے کیے اور کہا کہ وہ ہمارے ساتھ چلے۔ اسکاؤٹ ہیڈکوارٹرز سامان رکھ کر میں اُس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے سیدھا متعلقہ دفتر میں لے گیا۔ سکھ آفیسر بڑے خلوص سے پیش آیا۔ صرف بارہ روپے فی ویزا فیس چارج کی اور ایک ہفتہ مزید کی مہر لگا کر مجھے پاسپورٹ دے دیے۔

اندرون دہلی گرمجوشی مفقود

دہلی اسکاؤٹ ہیڈکوارٹرز پر میں نے وہاں کے سیکرٹری مسٹر سجون سنگھ کو شیلڈ پیش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہاں گرم جوشی والی کوئی بات نہیں تھی۔ کھانے میں دال بھاجی اور سبزی۔ کچھ وقت بازاروں میں گھوم پھر کر گزارا۔ گوربخش سنگھ کا ساتھ یہاں بھی اچھا رہا۔ وہ ہمیں گوردوارہ صاحب لے گیا جہاں ہم نے پورے تقدس اور انہماک کے ساتھ گرنتھ صاحب کا پاٹھ سنا۔ بھوگ کا تبرک یعنی حلوہ کھایا اور وہاں سے فارغ ہو کر ساتھ والی مسجد میں نماز کے لیے چلے گئے۔

وہاں نیشنل اسکاؤٹ ہیڈکوارٹرز پر ایک آفیسر شرما جی بھی تھے جو کہ دو دفعہ پاکستان آ چکے تھے۔ اس کے علاوہ جاپان میں بھی گہری دوستی جتاتے رہے۔ جاپان میں مجھ سے بیج (بِلّے) لے کر دوسرے اسکاؤٹس کو تحفہ میں دے کر تحفے بھی وصول کرتے رہے، لیکن اسکاؤٹ ہیڈکوارٹر پر انھیں نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ میں نے فون کیا، تو فرمایا کہ میرے کسی چچا کے بیٹے کی بیوی بیمار ہے، اس لیے چند دن کی چھٹی پر ہوں۔ تم بھی چھٹی کرو۔ ملنے کے لیے نہیں آ سکتا۔ باقی دنوں میں بھی سیکرٹری سجون سنگھ نظر نہ آئے۔ آخر پروٹوکول بھی کوئی چیز ہے اور پاکستانی مسلمانوں سے احتیاط لازم ہے۔ مختصر یہ کہ ہم مقبوضہ کشمیر کے مہمان تھے جبکہ اندرونِ بھارت ہماری کوئی عزت افزائی نہ ہوئی۔

فِٹ سے ''دُر فِٹ''

واپسی پر سمجھوتا ایکسپریس میں بہت کم مسافر تھے۔ ایک حسینہ ہر سُو تبسم بکھیرتی اٹاری سٹیشن پر آزادانہ گھوم رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ہی کمپارٹمنٹ کی مسافر ہے۔ واہگہ قریب آتے ہی مردانہ آواز میں مخاطب ہوئی اور پوچھنے لگی ''تُسی اُوتھوں کی لیائے او؟'' یعنی آپ وہاں سے کیا لائے ہیں۔ ہم نے جواب دیا۔ ناریل کا تیل اور انناس۔ فرمایا ''دُر فٹ، تُسی کدے دو کلو لاچیاں لے آندے تے تواڈا خرچہ نکل آندا۔'' (یعنی آپ دو کلو الائچیاں لے آتے، تو آپ کا خرچہ نکل آتا) ہمیں پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ہم ''فِٹ'' سے ''دُر فِٹ'' ہو گئے ہیں اور محترمہ خواجہ سرا ہیں۔

کشمیر بنے گا پاکستان

بھارتی قانون کے مطابق مقبوضہ کشمیر کا وزیرِ اعلیٰ ہمیشہ مسلمان ہوتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اگر وہ بھی مسلمان نہ ہو، تو پھر کیا ہو۔ ہم اُسے کٹھ پتلی کہتے ہیں، لیکن یقین جانیے کہ دل کے نہاں خانوں میں وہ بھی کشمیر کی آزادی کے خواہاں ہیں۔ مفتی سعید مرحوم اور محبوبہ مفتی اس کی اعلیٰ مثال ہیں۔ آج بھی کچھ عناصر یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ مقبوضہ کشمیر کے مسلمان پاکستان سے محبت نہیں کرتے، لیکن ہم نے محسوس کیا کہ ''کشمیر بنے گا پاکستان'' نعرہ نہیں حقیقت ہے۔

مفتی سعید صاحب کی وفات کے بعد محبوبہ مفتی وزیرِ اعلیٰ ہیں، لیکن شاید کسی اصولی موقف کی پاس داری میں زیرِ عتاب یعنی قید میں ہیں۔ اللہ رحم کرے۔ ◆◆◆

مشورہ حاضر ہے

ڈاکٹر فیاض احمد ہرل

☆ آج کل ہر شخص کی آنکھوں پر لالچ اور خودغرضی کی پٹی بندھی ہوئی ہے۔

☆ آج کل ہر شخص خودغرضی میں مبتلا نظر آتا ہے۔

☆ کوئی شخص ایسا نہیں جس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا جاسکے۔

☆ لوگ دوسرے انسانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جب اُن کی افادیت نہیں رہتی تو ٹشو پیپر کی طرح غیر ضروری سمجھ کر اُنھیں پھینک دیتے ہیں۔

اس طرح کے جملے ہمیں اکثر سننے کو ملتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا انسان واقعی اتنا نفس پرست اور خودغرض ہو چکا؟ یا ہم ہی دوسروں کے بارے میں فراخدلی سے اندازے لگا نہیں پاتے اور اُن کے رویے کو اپنے تعصّبات کی عینک سے دیکھ کر غلط فہمیوں کا شکار رہتے ہیں۔ ان بیان کردہ مفروضوں کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں باریک بینی اور ذاتی پسند ناپسند اور تعصّبات سے بالاتر ہونے کی ضرورت ہے۔

یقیناً ایسے بہت سے رویے ہم اپنے آس پاس دیکھتے بھی

منفی رویّوں کا زہر

اگر ہمارا معاشرہ انسانیت اور اخلاق کے جواہر سے اب بھی محروم رہا تو پھر صرف پچھتاوا ہی مقدر ہوگا

رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ منفی رویوں کے واقعات کو بہت اُچھالا جاتا اور اُنھیں بہت رغبت اور دلچسپی سے دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔ یوں اس تشہیر سے ہر شخص یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ منفی رویوں کی بہتات ہے اور ہر طرف بداخلاقی اور نفسانفسی کا دور دورہ ہے۔ بلند اخلاق پر مبنی واقعات اگر ہم خود دیکھیں یا ہمیں سننے کو ملیں تو ہم اکثر ان پر توجہ نہیں دیتے۔ یوں عام طور پر انسان کو محسوس ہوتا ہے کہ معاشرے میں شر اور بداخلاقی کا غلبہ ہے۔ ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منفی انسانی رویے کیسے جنم لیتے اور نشوونما پاتے ہیں؟

آیئے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے مختلف انسانی اور معاشرتی عوامل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے انھیں عمومی زندگی کی مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔

زندگی میں متاثر کن شخصیات کے اثرات (Modelling Effects)

ہم جانتے ہیں کہ ہر بچہ اپنے ابتدائی ماحول میں مرکزی اور کلیدی شخصیات (Key Personalities) سے اثر قبول کرتا ہے۔ اس میں والدین، بڑے بہن بھائی و قریبی رشتہ دار اور اساتذہ وغیرہ شامل ہیں۔

بچہ جب شعور کی آنکھ کھولتا ہے اور آس پاس کی زندگی دیکھتا ہے تو اُسے قریبی لوگ دیومالائی سی ہستیاں محسوس ہوتے ہیں اور وہ ان کے کردار کے اچھے اور برے ہر طرح کے اثرات کو جذب کرتا ہے۔ یہ اثرات غیرشعوری طور پر اُس کے کردار کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اکثر بلوغت کی عمر کے بعد بھی وہ ان اثرات کو خود بہت نوٹ نہیں کرتا جب تک دوسرے لوگ احساس نہ دلائیں۔

ایک بار میڈیسن (Medicine) کے ایک معروف پروفیسر صاحب مشورے کے لیے تشریف لائے۔ اُنھوں نے بتایا کہ اُن کے گھر والوں کو شکایت ہے کہ وہ غصے میں بہت نازیبا دشنام آمیز کلمات استعمال کرجاتے ہیں۔ ایک روز جب وہ اپنے صاحبزادے پر خفا ہوئے تو اُس نے بھی پلٹ کر گالی دے ڈالی۔ پروفیسر صاحب ہکا بکا رہ گئے اور جب شکایت کے انداز میں سرزنش کی تو بیٹے نے کہا: ''کہ ابا میں کیا کروں، میں نے یہ آپ سے ہی سیکھا ہے.....!''

جب پروفیسر صاحب سے تفصیلی گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ اُن کے والد محترم کو بھی جو ایک اعلیٰ سرکاری افسر تھے، گفتگو میں گالیاں دینے کی عادت تھی اور یوں یہ عادت نسل در نسل اپنا رنگ دکھا رہی تھی۔

اسی طرح قریبی رشتہ داروں اور اساتذہ کی بول چال، طرز تخاطب و کلام اور نشست و برخاست کا انداز بھی بچے کے کردار پر گہرے نقوش چھوڑ سکتا ہے۔ بچے کسی بھی شخصیت کو اپنا آئیڈیل (Ideal) تصور کر سکتے ہیں اور اُس کے انداز و اطوار اپنا سکتے ہیں۔

میرے ایک دوست ڈاکٹر صاحب جب کالج میں پڑھتے تھے تو اپنے کیمسٹری کے پروفیسر صاحب کے علم اور شخصیت سے بہت متاثر تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ جب پروفیسر صاحب کلاس سے باہر عمومی گفتگو کے دوران سگریٹ کے کش لگایا کرتے تھے تو مجھے اُن کا سگریٹ پینے کا انداز بہت پُرکشش لگتا اور میں اپنے تصورات میں ان کے انداز کی نقل کیا کرتا تھا۔

نفسیاتی اُلجھنیں

اوائل عمر کے تجربات بہت سی نفسیاتی اُلجھنوں کو بھی جنم دے سکتے ہیں جو اکثر اوقات بہت دیر تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ ایک مثال سنیے۔

ایک بار ایک صاحب نفسیاتی کلینک میں مشورے کے لیے تشریف لائے۔ تقریباً پچپن برس کی عمر، سانولی رنگت اور بھاری ڈیل ڈول کے حامل وہ صاحب پُروقار شخصیت کے مالک تھے۔ بہرروزگار بھی تھے اور بظاہر ہر حوالے سے

معقول زندگی گزار رہے تھے۔ تفصیل دریافت کرنے پر اُنھوں نے بتایا کہ وہ اپنے باقی بہن بھائیوں کی نسبت سانولی رنگت کے مالک تھے اور اُن کے ایک چچا پیار سے اُنھیں ''کالا کوا'' کہہ کر بلاتے تھے۔ اُنھیں برا تو بہت لگتا لیکن ادب کے مارے کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ گھر کے باقی سب افراد بھی اسے محبت کے اظہار کا ایک بے ضرر رویہ ہی سمجھتے تھے۔

وقت گزرتا رہا لیکن وہ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے اس اُلجھن سے نجات حاصل نہ کر سکے۔ اپنی جلد کی رنگت کے بارے میں حساسیت ہر وقت اُن کے دماغ پر حاوی رہتی۔ اپنی رہائش کے علاقے میں یا کام کی جگہ پر وہ لوگوں کو آپس میں بات کرتے دیکھتے تو یہی خیال گزرتا کہ اُن کے بارے میں بات ہو رہی ہے یا اُن کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔

ایک بظاہر معمولی ناشائستہ مذاق بعض اوقات زندگی بھر کا روگ بن سکتا ہے۔ کیا اس سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ہمیں اپنی روزمرہ زندگی میں اور گفتگو میں بہت محتاط رویے کی ضرورت ہے۔

ذرا دیکھیے کہ اس حوالے سے سورہ حجرات آیت (12-11) میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس طرح راہنمائی عطا فرمائی ہے۔ ارشاد ہے۔

''اے ایمان والو! مرد دوسرے مردوں کا مذاق نہ اُڑائیں۔ ممکن ہے کہ یہ اُن سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اُڑائیں ممکن ہے کہ یہ اُن سے بہتر ہوں اور آپس میں ایک دوسرے کو عیب نہ لگاؤ اور نہ کسی کو برے لقب دو۔ ایمان کے بعد فسق برا نام ہے اور جو توبہ نہ کریں وہی ظالم لوگ ہیں۔

اے ایمان والو! بہت بدگمانیوں سے بچو، یقین مانو کہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں اور بھید نہ ٹٹولا کرو اور نہ تم میں سے کوئی کسی کی غیبت کرے۔ کیا تم میں سے کوئی بھی اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرتا ہے؟ تم کو اس سے گھن آئے گی اور اللہ سے ڈرتے رہو، بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا ہے۔''

محتاط گفتگو

میرے ایک عزیز دوست جناب محسن سلیم صاحب بہت باشعور اور لفظ شناس انسان ہیں۔ اُنھوں نے ایک روز دورانِ گفتگو، اس موضوع پر ایک نئی جہت سے بات کی۔

اُن کا کہنا تھا کہ ''لفظ'' بھی ایک جاندار ''Entity'' ہے اور گفتگو..... ایک لحاظ سے الفاظ کی پیدائش کے عمل کا نام ہے۔ یوں اس عمل کو بھی اتنی ہی توجہ، تیاری اور احتیاط کی ضرورت ہے جتنی کسی بھی جاندار یا انسان کی پیدائش کے وقت ضروری سمجھی جاتی ہے۔ بے تکی گفتگو اور بلا سوچے سمجھے جو منہ میں آئے کہہ دینا..... پیدائش کے اس عمل کو ضائع کر دینے کے مترادف ہے۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اپنی نئی نسل کی اولین تربیت گاہ..... ہم خود ہیں اور ہم جس انداز سے اُن کے سامنے اپنے ماں باپ، بھائی بہنوں، عزیز رشتہ داروں، محلہ داروں اور میل جول والوں سے جھگڑوں کے دوران بدتمیزی، ناشائستہ گفتگو، الزامات و تہمتیں لگانا اور لالچ و مرض کا مظاہرہ جیسے مختلف رویے دکھاتے ہیں، ظاہر ہے وہ لاشعوری طور پر یہی رویے سیکھ رہے ہوتے ہیں۔ یوں اگر آنے والے کل میں وہ یہی رویے دوسروں کے علاوہ ہم سے بھی روا رکھیں گے..... تو پھر ہمیں شکایت ہوگی۔ (لیکن یہ شکایت بے جا ہوگی کیونکہ اس کا سبب ہم خود ہوں گے)۔

منفی خبروں اور رویے کا پراپیگنڈا

(Excessive Reporting of Negative Events)

ایک نفسیاتی ورکشاپ کے دوران ڈاکٹر حضرات سے منفی رویے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر حضرات کے سامنے ایک سوال رکھا: ''کہ آپ سب کے خیال میں دنیا میں خیر زیادہ غالب ہے یا شر؟''

اس سوال کے جواب میں اُن کی رائے منقسم تھی۔ چند

کا خیال تھا کہ دُنیا میں مجموعی طور پر شر غالب ہے۔ البتہ بیشتر لوگوں کی رائے تھی (جو بہت حوصلہ افزا بات تھی) کہ دنیا میں حقیقت میں خیر ہی غالب حیثیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے دنیا کا نظام چل رہا ہے۔

مجموعی طور پر جس رائے سے اتفاق کیا گیا، وہ یہ تھی کہ اگر چہ دُنیا میں خیر، شر کی نسبت زیادہ حاوی ہے لیکن شر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ زیادہ نظر آتا ہے۔ برائی کی خبروں کو اچھائی کی خبروں کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی سے سُنا اور پھیلایا جاتا ہے۔

میڈیا منفی کا ڈھنڈورا

مثال کے طور پر آپ اخبارات، ٹی وی، سوشل میڈیا وغیرہ دیکھیے۔ یہ سب عمومی طور پر منفی خبروں کو پُوری دنیا سے اکٹھا کرتے ہیں اور ایک منفی مرکب (Consentrated Negative) کے طور پر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ یہ منفی مرکب..... ایک بھاری بوجھ کی طرح ہمارے اعصاب پر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور ہماری سوچ منتشر، ہمارے خیالات شک زدہ اور ہمارا سکون برباد کرنے کا کام انجام دیتا ہے۔

یوں میڈیا اور پراپیگنڈے کی طاقت سے منفی خبریں اس تواتر اور تسلسل سے معاشرے میں پھیلائی جاتی ہیں کہ ہر شخص کو شر..... غالب حیثیت میں ہی محسوس ہونے لگتا ہے۔

ٹی وی چینلز۔ سنسنی خیزی کی دوڑ

آپ روزانہ اکثر ملکی ٹی وی چینلوں پر یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ منفی خبروں کو کس طرح اُچھالا جاتا ہے؟ زیب داستان کے ساتھ پیش کیا جاتا اور بمباری کے انداز میں ناظرین کی سماعت اور بصارت پر بار بار پھوڑا جاتا ہے۔ خبر گو (News Readers) اور پروگرام کے میزبان (Anchor) ہیجانی انداز میں بولتے اور اپنے لہجے، آواز اور حرکات وسکنات سے ایک سنسنی خیز ڈرامے کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ یہ سنسنی خیزی دیکھنے والوں کے اعصابی نظام میں ایک ہنگامی (Emergency) سی کیفیت کو جنم دے سکتی ہے اور ایسے کیمیائی مادے (Horumone) جو صرف ایمرجنسی کیفیات میں خارج ہوتے ہیں..... خون میں گردش کرنے لگتے ہیں۔ یوں خلیوں میں توڑ پھوڑ کا عمل جاری ہو جاتا ہے اور یہ شکست و ریخت (Wearand Tear) جسم کے دفاعی مدافعاتی نظام کو کمزور کر دیتی ہے۔

اگر یہی سارا عمل بار بار دہرایا جاتا رہے اور طویل عرصے تک جاری رہے (تسلسل سے اور ذوق وشوق سے نیوز چینل دیکھنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ) کو یہ کمزور دفاعی نظام (Weak Immune System) یقیناً ہر طرح کی بیماریوں کے لیے ایک دعوتِ عام کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔

ذرا سوچیں، اگر ہم میں سے ہر انسان کو ہر روز آٹھ دس چوری ڈاکے کی خبریں، چند تشدد اور زنا بالجبر کی کہانیاں، کئی حادثات اور قدرتی آفات کے واقعات، کرپشن اور بد دیانتی کے مہا اسکینڈل، جنگوں کی خبریں، بیماری، غربت اور خودکشی کے واقعات تواتر سے سُنائے جاتے رہیں تو ہمارا ذہنی توازن کیسے قائم رہ سکتا ہے اور ہمارا اپنے معاشرے اور مجموعی طور پر انسانی معاشرے پر اعتماد کیسے بحال رہ سکتا ہے؟

بی بی سی۔ قابل تقلید انداز

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بین الاقوامی نیوز چینل مثلاً بی بی سی وغیرہ پر خبریں کس قدر ٹھہرے اور پُرسکون انداز میں نشر کی جاتی ہیں۔ خبریں خواہ جنگ، تصادم اور تباہی پر ہی مبنی کیوں نہ ہوں، خبر گو انھیں نشر کرنے کے لیے ڈرامائی اور سنسنی خیز انداز اختیار نہیں کرتے۔ تشدد اور بربادی کے زیادہ وحشت انگیز مناظر دکھانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ اگر کسی جنگ زدہ خطے کا منظر دکھانا بھی ہو تو سرسری سے انداز میں دکھایا جاتا ہے۔ سوائے یہ کہ کسی موضوع پر کوئی خصوصی پروگرام یا ڈاکومینٹری (Documentery) ہو، کسی بھی خبر

یا منظر کی بار بار ''بریکنگ نیوز'' (Breaking News) کے نام سے بمباری نہیں کی جاتی۔

یہ طرزِ عمل ہمارے نیوز چینلز کے لیے قابلِ تقلید ہے اور ایسا کوڈ آف کنڈکٹ (Code of Conduct) بنائے جانے کی ضرورت ہے جس سے نیوز رپورٹنگ کے انداز کو کم ضرر رساں اور قابلِ قبول بنایا جاسکے۔

منفی خبر پر زیادہ توجہ

اس سارے ماحول کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں میں منفی خبر سننے کے لیے ایک خاص رجحان اور کشش پیدا ہوگئی ہے اور پھر فوراً ہمارے دل میں یہ بھی آتا ہے کہ ہم اسے آگے کسی کو سنا کر اُسے چونکا سکیں۔

مثال کے طور پر آپ فرض کیجیے کہ کسی اسکول، اسپتال، سرکاری دفتر یا کسی بھی دیگر ادارے میں کسی ایک ہفتے کے دوران بہت سے خیر کے واقعات رُونما ہوں یا بہت سے لوگوں کو نفع پہنچے جبکہ چند منفی واقعات بھی وقوع پزیر ہوئے ہوں تو غالب امکان یہی ہوگا کہ آپ کو اگلے چند دنوں میں وہاں فقط منفی واقعات کی بازگشت سنائی دے گی۔ بیشتر لوگ ان واقعات کی خبریں بہت دلچسپی سے سُنیں گے اور انھیں بڑھا چڑھا کر آگے بیان کریں گے۔ اچھائی اور خیر کے واقعات خواہ وہ کثیر تعداد میں بھی ہوں..... آگے بیان کم ہی کیے جاتے ہیں۔

برائی میں دلچسپی کیوں؟

یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بیشتر لوگ بہ نسبت اچھائی، برائی کی خبروں میں زیادہ دلچسپی کیوں لیتے ہیں؟

انسانوں کے اس رجحان کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں مثال کے طور پر نفس کی تسکین اور دوسروں کی برائی سے اپنی ''اچھائی'' کی تسلی حاصل کرنا وغیرہ۔ ایک اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ انسانی نفس میں ''کرید'' اور ''تجسس'' کا مادہ فطرتاً موجود ہے۔ اس تجسس کا رُخ مُثبت بھی ہوسکتا ہے اور منفی بھی۔ تجسس..... مُثبت رُخ اختیار کرے تو علم وفنون کی طرف راغب ہوسکتا اور نئی نئی دُنیاؤں کی تسخیر کا شوق پال سکتا ہے لیکن اگر کسی کا تجسس..... منفی رُخ اختیار کرجائے تو وہ تباہی و بربادی کی کہانیوں میں زیادہ دلچسپی لے گا۔ اُسے دوسرے لوگوں کی خامیاں، کوتاہیاں اور کجرویاں (Deviation) اپنی طرف زیادہ کھینچیں گی۔ خیر کی کہانی میں بوریت محسوس ہوگی اور شر کی داستان میں لطف ومزہ آئے گا۔

اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ اپنے تجسس کے گھوڑے کا رُخ کس منزل کی جانب موڑیں؟ مُثبت یا منفی۔ البتہ اگر عمومی معاشرتی ماحول منفی رُخ کو زیادہ تحریک دینے لگ جائے تو

یہی رجحان غالب ہونے کا امکان ہوگا۔

خیر کا اخبار

ممتاز ادیب اور ڈرامہ نگار اشفاق احمد صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک بار ایک اخبار کے مالک کے پاس گیا اور اُنھیں کہا کہ میرے ذہن میں ایک ایسے اخبار کا آئیڈیا ہے جو ''اخبارِ خیر'' ہو اور صرف خیر کی خبریں چھاپے۔

اس پر وہ ہنس پڑے اور بولے:

''اشفاق صاحب! ایسا اخبار پڑھے گا کون؟ ہم اخبار بیچنا بھی چاہتے ہیں۔ صرف گوداموں میں ذخیرہ تو نہیں کرنا چاہتے۔''

میں نے کہا:

''چلیں، پورا اخبار نہ سہی، ایک صفحہ ہی آپ خیر کی خبروں کے لیے مختص کر دیجیے۔'' وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوئے اور اس خیال کو ہنسی میں ٹال دیا۔

منفی خبروں کے رویوں پر اثرات

اہم سوال یہ ہے کہ اگر ہم ہر وقت منفی خبریں سنتے رہیں اور منفی خبریں دوسروں تک پہنچاتے رہیں تو اس کے ہمارے مزاج، طبیعت اور عادات پر کیا اثرات ہوں گے؟

پہلا نقصان یہ ہوگا، جس کا پہلے بھی ذکر کیا جا چکا کہ مجموعی طور پر اس گمان میں مبتلا ہو جائیں گے کہ تمام معاشرہ شر میں مبتلا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کا شکار اس وقت پاکستانی معاشرہ بھی ہے، حالانکہ ہمارے معاشرے میں ان گنت خیر کے عظیم کام ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے فلاحی منصوبے ہر روز لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھ رہے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں لوگ اچھائی کے کام روزانہ اس طرح انجام دیتے ہیں کہ دوسرے ہاتھ کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ سرکاری محکموں میں بھی ہزاروں لوگوں کی دادرسی ہو رہی ہے۔ اسپتالوں میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں روزانہ شفایاب ہو کر گھروں کو لوٹتے ہیں۔

البتہ جن کاموں میں رکاوٹ آجاتی ہے یا جو کام کسی کی بددیانتی یا نااہلی کی وجہ سے نہیں ہو پاتے، اُن کا خوب چرچا ہوتا ہے۔ اگر کوئی کیس میڈیا تک پہنچ جائے تو وہاں اس طرح ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے کہ لوگوں کا اپنے معاشرتی نظام پر اعتماد بری طرح ڈانواں ڈول ہو جاتا ہے۔

منفی خبروں کے نفسیاتی اثرات

اُوپر بیان کردہ نقصان سے منسلک دوسرا نقصان یہ ہے کہ بری خبریں تواتر سے اور مسلسل گردش میں رہنے سے لوگوں کا ایک دوسرے پر اعتماد ختم ہو جاتا ہے۔ ہر شخص دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دوسروں کی باتوں اور وعدوں پر بھروسا نہیں رہتا اور آپس کے میل جول میں نیک نیتی اور خلوص کی فضا قائم نہیں رہتی۔

یوں پورے معاشرے میں شک اور بے اعتمادی کی فضا سرایت کر جاتی ہے۔ یہ عوامل ایک صحت مند معاشرے کے قیام کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فوری تاثر قائم کرنے فوری لیبل لگانے کی عادت

آپ نے انگریزی کا ایک معروف مقولہ سُنا ہوگا کہ

First impression is the last impression.

اس مقولے میں انسانی فطرت کی ایک خاص کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ انسان اپنی بے صبری اور جلد بازی کی وجہ سے دوسروں کے بارے میں بھی بہت جلد رائے قائم کر لیتا ہے اور خاص طور پر منفی رائے بنانے میں خصوصی جلد بازی سے کام لیتا ہے۔

ہمیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اگر ہم پہلی بار کسی شخص کو ایک خاص انداز کا رویہ دکھاتے ہوئے دیکھیں تو ضروری نہیں کہ وہ اُس کی شخصیت کا نمائندہ رویہ (Representative) ہو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ شخص اُس وقت کسی خاص دباؤ کا شکار ہو یا اُس کے ساتھ کوئی تکلیف دہ

واقعہ تازہ تازہ گزرا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اُس کی شخصیت کے کسی ایک پہلو سے غلط طور پر کوئی عمومی نتیجہ نکال رہے ہوں جو اُس کی پوری شخصیت کی درست نمائندگی نہ کرتا ہو۔

ذاتی تجربہ

اس نکتے کا شعور مجھے ایک ذاتی تجربے سے بھی حاصل ہوا۔ میڈیکل کالج کا زمانہ تھا۔ تعلیم کے ابتدائی دن تھے۔ ایک کلاس فیلو ''الف'' سے ابھی رسمی سا تعارف تھا۔ ایک دن ''الف'' نے کلاس میں ایسی حرکت کی کہ میرے ذہن میں فوراً اُس کے بارے میں ایک منفی رائے قائم ہوگئی۔ کئی ماہ گزر گئے وہ رائے جوں کی توں قائم رہی حالانکہ اُس کی جانب سے مزید کوئی منفی رویہ بھی سرزد نہ ہوا۔

کافی عرصے بعد ایک روز ایک مشترک دوست کے ساتھ اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں چند گھنٹے گزارنے سے مجھ پر اُس کی شخصیت کے بہت سے نئے پہلو کھلے اور یہ سارے گوشے بہت خوشگوار اور پسندیدہ تھے۔ یہاں تک کہ مجھے اس کے بارے میں اپنی ابتدائی رائے سوچ کر ہی ندامت محسوس ہونے لگتی۔ تب مجھ پر اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ اس کے بارے میں میری ابتدائی رائے ''جلد بازی'' اور ''سطحی مشاہدے'' پر مبنی تھی۔

کمزور اور طاقتور لمحات

یہ بات ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر انسان بہت سی خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے ہر شخص عام روز مرہ زندگی میں بھی مختلف اوقات میں ایسے ''کمزور'' اور ''طاقتور'' لمحات سے گزرتا ہے۔ کمزور اور طاقتور لمحات سے مراد ہم اپنے اندر کا ''بُرا'' اور ''اچھا'' انسان بھی لے سکتے ہیں۔ ہمارے ''کمزور'' لمحات کا رویہ ذہنی دباؤ، پریشانی اور آزمائش کے اوقات میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے جبکہ پُرمسرت اور پُرسکون لمحات میں ''اچھا انسان'' زیادہ ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے عین ممکن ہے کہ جب ہمارا کسی شخصیت سے پہلی دفعہ واسطہ پڑے تو وہ اپنے ''کمزور لمحات'' سے گزر رہا ہو اور یوں ہمیں فقط اُس کی شخصیت کا بُرا پہلو دیکھنے کا موقع ملے اور اچھا پہلو ابھی ہماری نظروں سے اوجھل ہو۔

اُوپر بیان کردہ نکتے سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جلد بازی میں کسی کے بارے میں رائے قائم کرنا..... ہمیں کتنے غلط نتیجے تک پہنچا سکتا ہے اور اس سے تعلقات میں خرابی اور بگاڑ آنے کا امکان کتنا بڑھ سکتا ہے۔

مقابلہ بازی کا غیر صحت مندانہ رجحان

عادل گاڑی سے اُترتے ہی بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں رزلٹ کارڈ تھا اور چہرہ خوشی کے جذبات سے تمتما رہا تھا۔

آج اُس کا ششم (6th) گریڈ کا فائنل رزلٹ آیا تھا اور اُس نے آٹھ میں سے 5 مضامین میں +A گریڈ لیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ آج اُسے خوب شاباش ملے گی کیونکہ اُس کی کارکردگی پچھلے امتحان کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔

''ابو دیکھیے میرا رزلٹ!''

انھوں نے رزلٹ کارڈ کو ہاتھ میں لے کر اُس پر سرسری سی نگاہ دوڑائی، پھر چہرے پر ایک تیوری سی چڑھا کر پوچھا:

''تمہارے دوست عمر نے کتنے A پاس لیے ہیں؟''

اس سوال پر عادل جھینپ سا گیا۔

''اس کے سات A پاس ہیں۔''

والد کے چہرے پر غصے کا تاثر اُبھرا۔

''کتنی بری بات ہے۔ اُس سے ہار کر بھی تم اتنا خوش ہو رہے ہو۔ اُس سے آگے نکلو تو پھر بات ہے۔''

یہ سُن کر عادل کی ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی اور وہ روہانسا ہوگیا۔

مقابلہ بازی، منفی اور مثبت پہلو

اُوپر بیان کردہ مثال آج کے بیشتر والدین کی سوچ کو

ظاہر کرتی ہے خصوصاً خواتین بچوں کی تعلیمی کارکردگی کے حوالے سے اس رجحان میں زیادہ مبتلا نظر آتی ہیں۔ امتحانوں کے گریڈ اور نمبر ایک ''خبط'' بن چکا۔ پرائیویٹ اسکولوں کے اساتذہ کا تجربہ ہے کہ والدین بچوں کے گریڈز کے حوالے سے جس بحث وتکرار، جھگڑے اور بدمزگی کا ماحول پیدا کرتے ہیں، اُس سے نہ صرف اسکول کا ماحول خراب ہوتا بلکہ بچوں کی شخصیت پر بھی بہت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

یہ ہم سب کا عمومی تجربہ ہے کہ والدین فیس بک (Facebook) پر اپنے بچوں کے حوالے سے اکثر جس طرح کی پوسٹس (Posts) بھیجتے ہیں اُن میں سے بیشتر رسمی تعلیمی کارکردگی سے متعلق ہوتی ہیں اور تعلیمی ایوارڈ، میڈل، گریڈ یا ڈگری کے حصول سے متعلق ہوتی ہیں۔

آپ یاد کرنے کی کوشش کیجیے کہ آپ نے کتنی بار کوئی ایسی پوسٹ دیکھی ہے جس میں تعلیمی کارکردگی کے بجائے کسی اخلاقی عمل کی تعریف کی گئی ہو اور اس بات پر فخر کا اظہار کیا گیا ہو کہ بچے نے کسی کی مدد کی ہو یا اپنی غلطی کا اقرار کیا ہو خوف کی حالت میں بھی سچائی اور ایمانداری سے کام لیا ہو یا دینی تعلیم کے حوالے سے کوئی کارکردگی دکھائی ہو۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ ایسی پوسٹ کم ہی آپ کی نظر سے گزری ہوگی۔

کیا ہم اپنے بچوں کو صرف گریڈ، میڈل حاصل کرنے اور نوکری کرنے اور پیسے کمانے کی دوڑ میں ہی آگے دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ اخلاق اور تہذیب میں بھی نام پیدا کریں اور اپنی شرافت نیکی اور ایمانداری سے پہچانے جائیں؟ یاد رکھیے...... بچے اُسی شے کو اہم سمجھیں گے جس کا ہر وقت چرچا سُنیں اور جس شے کی وہ اپنے بڑوں کو قدر کرتا دیکھیں۔

آپ کے ذہن میں یہ سوچ آسکتی ہے کہ مقابلہ بازی یا Competition تو صحت مندانہ بھی ہوسکتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست بھی ہے، اگر مقابلہ بازی کا رویہ ایک خاص حد تک اور توازن کے ساتھ ہو لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشروں اور کارپوریٹ دنیا میں Competition کو معاشرے کی سب سے بڑی قدر بنا دیا گیا ہے۔ یعنی ہر جائز ناجائز حربے سے کام لے کر دوسروں کو نیچا دکھانا اور اپنی ذات کو، ہر حالت میں کامیاب دیکھنے کی کوشش کرنا۔

آپ خود سوچیے کہ اگر ہماری اس خاص سوچ کی وجہ سے ہمارے بچوں کے اعصاب پر مقابلہ بازی اس حد تک سوار ہو جائے کہ اُنھیں اپنا ہر ہم عمر ساتھی رقیب، مخالف یا دشمن ہی محسوس ہونے لگے تو کیا وہ اخلاص پر مبنی دوستانہ رویہ رکھنا سیکھیں گے؟ اُن کی طبیعت میں ہمدردی اور انسان دوستی کے جذبات کیسے پرورش پا سکیں گے اور اُنھیں خاندان یا معاشرے کے کسی دوسرے فرد کی خاطر ایثار سے کام لینا یا قربانی دینا کیسے آئے گا؟

یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ اگر ہمارے بچے انسانیت اور اخلاق کے جوہر سے محروم ہوں گے تو سب سے پہلے جن کی طرف اُن کا رویہ خراب ہوگا وہ ہم...... یعنی اُن کے بزرگ اور بڑے ہی ہوں گے اور پھر صرف پچھتاوا ہی ہمارا مقدر ہو گا۔

◆◆◆

تیل بدلی

اشفاق احمد نے برسوں پہلے انسانی رویے کو درست رکھنے کی نصیحت بہت واضح انداز میں کردی تھی۔ ذرا پڑھیں اور سوچیں کہ روحانی ایمان وصفائی کس قدر ناگزیر ہے

صفحہ نمبر 165 پر

مرنے کے بعد

مارک شوزر/مقبول جہانگیر

پُراسرار اور عجیب واقعات جس انداز میں شروع ہوئے، وہ بجائے خود ایک معما ہے۔ لوگوں میں ان واقعات کے بارے میں جس قدر غلط فہمیاں اور افواہیں مشہور ہیں، انھیں دیکھتے ہوئے میرے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ سلسلے وار ان تمام باتوں کو صحیح صحیح پیش کر دوں تاکہ اس کہانی کی اصل تصویر سامنے آسکے۔ سب سے پہلے میرے بارے میں چند باتیں سن لیجیے کہ آغاز سے انجام تک اس ڈرامائی اور آسیب زدہ کہانی کا تعلق مجھ ہی سے ہے۔

میں تیس سال کا ایک صحت مند اور مضبوط اعصاب رکھنے والا آدمی ہوں۔ جب میں سات سال کا تھا، پہلے میرے والد اس دنیا سے رخصت ہوئے اور اس سے اگلے برس والدہ نے رختِ سفر باندھا اور میں اپنی ایک خالہ کے پاس چلا گیا جنھوں نے بڑے لاڈ پیار سے مجھے پالا اور تعلیم دلوائی۔ میرے والد کا ایک چھوٹا بھائی بھی تھا جسے میں نے اپنی زندگی میں صرف دو مرتبہ دیکھا تھا، کیونکہ وہ خاندان سے الگ ہو کر عرصہ دراز سے ساک بیری کے ایک دور افتادہ قصبے میں مقیم تھا جو دریائے

برسوں بعد میں اپنے چچا سے ملنا چاہتا تھا مگر اچانک میری خالہ کے تنبیہی الفاظ دماغ میں گونج اُٹھے اور میں لرز کر رہ گیا

شکاریات، مہم جوئی، ناقابلِ فراموش اور پُراسرار کہانیوں کے بہترین تراجم کا سہرا ہمیشہ سے اُردو ڈائجسٹ کے سر پر سجا رہا ہے۔ مصنف مقبول جہانگیر، کا اندازِ بیاں آج بھی قارئین کے دلوں میں مقید ہے۔ بے پناہ فرمائشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ادارے نے ایک بار پھر سنہرے دور کی شاہکار کہانیوں کو منظرِ عام پر لانے اور نسلِ نو کو لازوال کہانیوں سے متعارف کروانے کا بیڑا اُٹھالیا ہے۔ اسی سلسلے میں ہم وقتاً فوقتاً کچھ ایسی کہانیاں قندِ مکرر کے طور پر سامنے لاتے رہیں گے جو اُردو ڈائجسٹ کے پلیٹ فارم سے شائع ہوکر امر ہوئیں اور جو آج بھی اُسی ذوق وشوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

زیرِ نظر کہانی بھی کچھ ایسے ہی دلچسپ، سنسنی خیز اور قدم بہ قدم سانس روکنے والے واقعات وحالات کا ایسا گٹھ جوڑ ہے کہ قاری کہانی کے کرداروں میں اپنی موجودگی محسوس بھی کرتا ہے اور گویا اسے لگتا ہے کہ کسی نہ کسی منظر کو اس نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ رونگٹے کھڑے ہوجانا، رات کی نیند میں انجانے خوف کا غلبہ طاری ہوجانا، اندھیری جگہوں پر جانے سے ڈرنا، یہ سب احساسات بلاشبہ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد قارئین نے محسوس کیے تھے۔ ایک بار پھر اُسی دور کا لطف اُٹھایئے اور مقبول جہانگیر کے ساتھ طلسم وجادو کی عجب نگری میں کود جایئے۔

وسکونسن کے کنارے واقع ہے۔ میرے اس چچا کا نام ایمس ولڈر تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب بھی میرے والدین یا دوسرے رشتے دار اس کا ذکر کرتے، تو ان کے چہرے ازحد سنجیدہ ہوجاتے اور نفرت کے جذبات اُبلنے لگے۔ وہ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں کرتے جو میری سمجھ سے بالاتر تھیں، تاہم اتنا میں جان گیا تھا کہ وہ میرے چچا کو منحوس جادوگر یا شیطان کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ میرے والد کی سخت ترین ہدایت تھی کہ خاندان کا کوئی فرد اس سے تعلقات نہ رکھے، کیونکہ ایسے بدکردار اور بدطینت شخص سے کسی وقت بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

چونکہ ابتدا ہی سے چچا کے بارے میں یہ باتیں میرے کان میں پڑتی رہی تھیں، اس لیے مجھے شعوری طور پر اس سے نفرت ہوگئی۔ کبھی کبھی میں سوچا کرتا کہ آخر یہ شخص کیسا ہوگا جس سے سبھی خوف زدہ اور ناراض ہیں۔ کاش میں اسے دیکھ سکتا! مجھے گھر کے ایک پرانے نوکر کی زبانی پتہ چلا کہ ایمس ولڈر کی ایک تصویر گھر کے کتب خانے میں موجود ہے، لیکن اس کے دروازے پر ہر وقت ایک موٹا سا زنگ آلود قفل پڑا رہتا تھا۔ میں نے ایک روز والد کے کوٹ کی جیب میں سے چابیوں کا گچھا چرایا، کتب خانے کا دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ بوسیدہ اور پرانی کتابوں کی بدبو کمرے میں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں پر ہمارے خاندان کے بزرگوں کی بڑی بڑی تصویریں آویزاں تھیں جن پر گرد کی موٹی تہ جم گئی تھی۔ ایک میز پر چڑھ کر میں نے ان تصویروں پر سے گرد جھاڑی اور سب کو غور سے دیکھنے لگا۔ ان میں میرے آنجہانی دادا، والدہ، خالہ اور دوسرے کئی افراد خاندان کی تصویروں کے نیچے نام تحریر تھے جن سے انھیں شناخت کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ ان تصویروں کو دیکھتا ہوا جب میں کمرے کی مشرقی دیوار کے قریب پہنچا، تو سیاہ رنگ کی لکڑی کے ایک نہایت خوبصورت فریم میں لگی ہوئی ایمس ولڈر کی تصویر دکھائی دی۔

مجھے ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نادیدہ قوت نے مجھے وہیں رک جانے پر مجبور کردیا ہے۔ اس تصویر کو دیکھتے ہی میرے دل میں دہشت اور خوف کے ساتھ ساتھ انتہائی نفرت وکراہت کے جذبات پیدا ہوئے۔ تصویر میں جو

شخص کرسی پر بیٹھا تھا، اس کی شکل وشباہت اور حلیے سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی بہت ہی چالاک اور مکار آدمی ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی خم دار ناک، تنگ پیشانی، بڑے بڑے کان جن پر بال اُگے ہوئے تھے، پتلے پتلے اور بھنچے ہوئے سرخ ہونٹ جن پر ایک مکروہ تبسم پھیلا ہوا تھا، ایمس ولڈر کی پُراسرار شخصیت کو اُجاگر کرنے کے لیے کافی تھے۔ میری عمر اس وقت چھے سال کی تھی اور مجھے خوب یاد ہے کہ اپنے چچا کی اس تصویر کے نقوش میرے دماغ پر اس طرح بیٹھ گئے کہ میں کئی دن تک خوف زدہ رہا اور جب والد کو پتا چلا کہ میں نے لائبریری میں جا کر چچا کی تصویر دیکھ لی ہے، تو بے حد ناراض ہوئے اور انھوں نے اسی وقت تصویر کو فریم سے نکالا اور آتش دان کے دہکتے ہوئے کوئلوں میں پھینک دیا۔

اس حادثے کے ایک سال بعد جنوری کی ایک سوگوار صبح کو میرے والد انتقال کر گئے اور جب ان کا جنازہ قبرستان میں لے جایا جا رہا تھا، تو ہمارے گھر کے بڑے دروازے پر ایک گھوڑا گاڑی آن کر رکی۔ کوچوان نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور سرتاپا سیاہ لباس پہنے ہوئے ایک منحنی سا طویل القامت شخص نہایت وقار کے ساتھ نیچے اُترا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی سبھی لوگ اپنی اپنی جگہ رُک گئے اور ایک عجیب سا سناٹا چھا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے چچا ایمس ولڈر کو دیکھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوب چمک رہی تھیں اور ہر فرد اس سے آنکھ ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ کسی سے کوئی لفظ کہے بغیر وہ والد کے تابوت کی جانب بڑھا، قریب کھڑے ہوئے پادری نے تابوت کا ڈھکنا اُٹھایا۔ چچا نے والد کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ پتلے ہونٹوں پر وہی مکروہ تبسم نمودار ہوا جو میں تصویر میں دیکھ چکا تھا۔ پھر وہ میری والدہ کی جانب مڑا اور دبے الفاظ میں اظہارِ تعزیت کیا۔ میں بوڑھے باورچی کے پیچھے سہما کھڑا تھا۔ اب اس نے مجھے دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھ میری جانب بڑھا دیے۔ میں دہشت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

یہ واقعہ مجھے ایک خواب کے مانند یاد ہے۔ اس کے بعد ایمس ولڈر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

دن گزرتے گئے۔ میں اپنی پڑھائی اور دوسرے مشغلوں میں ایسا گم ہوا کہ چچا ایمس کو بھول گیا۔ صرف ایک موقع پر اس کی یاد تازہ ہوئی جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایمس ولڈر نامی ایک شخص برّاعظم افریقہ کی طویل سیاحت کے بعد ساک پیری میں مقیم ہوا ہے اور اپنے ساتھ نوادرات کا بیش بہا ذخیرہ لایا ہے۔ یہ خبر پڑھتے ہی اپنے چچا کی بھولی بسری یاد میرے ذہن میں تازہ ہوگئی۔ میں نے اپنی خالہ سے ذکر کیا، تو انھوں نے کہا:

''بیٹا، تم اپنے چچا کو بالکل بھول جاؤ۔ تمہارا اس سے کیا واسطہ؟ اس نے تمہارے باپ کے مرنے کے بعد بھول کر بھی تمہاری خبر نہ لی۔ وہ نہایت ظالم اور خبیث آدمی ہے اور اس پر بدروحوں کا سایہ ہے۔''

بات ٹل گئی۔ کئی سال بعد میں سینٹ لوئیس کے بازار سے گزر رہا تھا کہ میں نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک شخص کو دیکھا۔ وہی سیاہ لباس، طوطے کی چونچ جیسی مُڑی ہوئی ناک، تنگ پیشانی اور جھریاں پڑا ہوا چہرہ..... جو پہلے سے کہیں زیادہ زرد تھا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کی شناخت کا سب سے بڑا ذریعہ کانوں کے گرد اُگے ہوئے وہ لمبے لمبے سیاہ بال تھے جنھوں نے اس کا چہرہ انتہائی بدنما اور مکروہ بنا دیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا ایک عمارت کے صدر دروازے میں داخل ہوگیا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اپنے چچا سے ملاقات کروں، لیکن پھر خالہ کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے:

''تمہارا اس سے کیا واسطہ؟ اس نے تمہارے باپ کے مرنے کے بعد بھول کر بھی تمہاری خبر نہ لی۔'' میں نے نفرت سے زمین پر تھوکا اور چچا سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

اس دوران میری خالہ بھی وفات پا گئیں۔ میں دربدر کی

ٹھوکریں کھاتا رہا۔ مجھے مضمون نگاری اور افسانہ نویسی کا شوق تھا۔ نام پیدا کرنے کی دھن میں دن رات محنت کرتا۔ سینٹ لوئیس میں، مَیں نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا تھا اور بڑی تنگی ترشی سے بسر اوقات کرتا تھا۔ آپ اس حیرت اور مسرت کا اندازہ نہیں کر سکتے جب ایک روز شام کی ڈاک سے ایک غیر مانوس تحریر میں لکھا ہوا ایک چھوٹا سا رقعہ لفافے میں سے برآمد ہوا جس میں لکھا تھا:

''میرے بیٹے، یہ خط ملتے ہی فوراً ساک پیری روانہ ہو جاؤ۔ زندگی اور موت کا معاملہ درپیش ہے اور اس میں مجھے تمہاری مدد کی اشد ضرورت ہے۔ قصبے میں پہنچ کر جس سے بھی میرا مکان معلوم کرو گے، تمہیں بتا دے گا۔ اُمید ہے تم اپنے بوڑھے چچا کو نہ بھولے ہو گے۔

ایمس ولڈر''

ایک لمحے کے اندر اندر بچپن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات میری نظروں کے سامنے سے گزر گئے اور ایمس ولڈر کی شکل حافظے کی لوح پر اُبھر آئی۔ میں دیر تک اس چند سطری خط کو دیکھتا رہا جس کے ٹیڑھے میڑھے اور شکستہ حروف ظاہر کرتے تھے کہ لکھنے والے کے ہاتھ میں رعشہ ہے یا اس نے اتنی گھبراہٹ اور بدحواسی میں لکھا ہے کہ الفاظ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئے ہیں۔

اس رات میں کوئی کام نہ کر سکا۔ بار بار سوچتا رہا کہ مجھے جانا چاہیے یا نہیں۔ اپنے چچا کی جو ہیبت میرے دل و دماغ پر بچپن ہی سے بیٹھی ہوئی تھی، وہ مجھے وہاں جانے سے روکتی تھی، لیکن نوجوانی کی حرارت اور کچھ کرنے کا جذبہ مجبور کرتا تھا کہ ضرور جانا چاہیے۔

☆☆

جب میں ساک پیری کے نواح میں پہنچا، شام کے دھندلکے آہستہ آہستہ بستی کو اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے اور دریائے وسکونسن کی طرف سے آنے والی سرد ہوا کے جھونکوں میں شدت پیدا ہو چکی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں بمشکل چند سو مکان تھے جن کی سرخ چھتیں دھند میں چھپی ہوئی تھیں۔ اکثر مکان ایک منزلہ تھے اور کوئی کوئی مکان دو منزلہ یا تین منزلہ نظر آتا تھا۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے چند آوارہ کتوں نے بھونکنا شروع کر دیا اور انھیں روکنے کے لیے ایک عمر رسیدہ آدمی ایک مکان کے دروازے میں سے نکلا۔ میں نے اس سے ولڈر ہاؤس کا پتہ پوچھا، تو ایک ثانیے کے لیے اس شخص کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے سر سے پیر تک میرا جائزہ لیا، پھر کہا:

''آہ! تم بڈھے ایمس سے ملنے آئے ہو؟ اس کا گھر آبادی کے آخری سرے پر ہے، بس سیدھے چلے جاؤ۔''

یہ کہہ کر بڈھے نے اپنے مکان میں داخل ہو کر دروازہ فوراً بند کر لیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ولڈر ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ وسیع و عریض مکان بالکل ویران جگہ پر تھا۔ اس کے اردگرد پرانی اور بوسیدہ عمارتوں کے کھنڈر پھیلے ہوئے تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ کسی وقت یہاں بھی آبادی تھی، لیکن امتدادِ زمانہ کے باعث مکان کھنڈر ہو گئے اور ان کے مکین کسی اور طرف جا بسے۔ اس کے مغربی جانب جنگل واقع تھا اور شمالی جانب دریائے وسکونسن کے پانی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ دریا زیادہ دور نہیں۔ مکان کا صدر دروازہ بند تھا اور کھڑکیوں پر سیاہ رنگ کے پردے پڑے تھے۔ روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔ جنگل میں پرندوں کے بولنے کی آوازیں اس ہولناک سناٹے کو چیرتی ہوئی میرے کانوں تک آ رہی تھیں۔

میں نے اپنے جسم میں خوف کی کپکپی دوڑتی محسوس کی۔ آن واحد میں صدہا پریشان کن خیالات میرے ذہن میں آئے اور گزر گئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے فوراً لوٹ جانا چاہیے، لیکن کسی اندرونی جذبے کے تحت میرے قدم رک

گئے۔ جانے سے پیشتر چچا ایمس کو ایک نظر دیکھ تو لوں۔ اب تو اس کی شکل وشباہت میں تعظیم تغیر رونما ہو چکا ہوگا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازے پر زور سے دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے بعد مکان کے اندر کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی جو آہستہ آہستہ دروازے کے قریب آ رہی تھی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ دروازے کی آہنی زنجیر کھلنے کی آواز سنائی دی اور پھر شاہ بلوط کی لکڑی کا بنا ہوا انتہائی مضبوط اور سیاہ رنگ کا دروازہ ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ ذرا سا سرکا اور مجھے ایک مدقوق صورت بڈھا کھڑا دکھائی دیا۔ اس کا جسم گردن سے لے کر ٹخنوں تک بغیر آستین کے سیاہ لبادے میں ڈھکا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ میں مٹی کے تیل سے جلنے والا چھوٹا سا لیمپ تھا جس کی لَو تیز ہوا کے جھونکوں سے پھڑک رہی تھی۔ زرد رنگ کی اس روشنی میں بڈھے ایمس کو پہچان لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے سامنے ایک لاش کھڑی ہے۔ میں دہشت سے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس کی شکل بغور دیکھنے لگا۔ یہ میرا وہی مکروہ صورت چچا تھا جسے میرے گھر کے لوگ نفرت کے باعث شیطان کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ اس نے لیمپ اونچا کیا، اب میں نے دیکھا کہ اس کا ہاتھ برف کے مانند سپید تھا اور لمبی باریک انگلیاں نہایت سختی سے لیمپ پکڑے ہوئے تھیں۔ اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ دروازے سے باہر آیا اور سیٹی کی مانند تیز آواز میں بولا:

''اگر میں غلطی نہیں کرتا، تو یہ میرا عزیز بھتیجا ایس ہے۔ خوش آمدید..... خوش آمدید۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ بڈھے نے لیمپ فرش پر رکھا، دروازے کی زنجیر چڑھائی اور لیمپ دوبارہ ہاتھ میں اُٹھا کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

''بیٹا ایلس، تم نے بہت اچھا کیا کہ آ گئے۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ تم تھک گئے ہو گے، اس لیے آرام کرو۔ کل صبح باتیں کریں گے۔''

ایک طویل راہداری، کئی برآمدوں اور زینوں کو عبور کر کے بڈھا مجھے تیسری منزل کے ایک کشادہ اور سجے سجائے کمرے میں لے گیا جہاں آتش دان کے اندر آگ کے نارنجی شعلے بھڑک رہے تھے۔ ایک جانب بڑی سی مسہری پر آرام دہ بستر بچھا ہوا تھا جس کے اُوپر بہت پرانی سی چھتری آویزاں تھی۔ قریب ہی رکھی ہوئی میز پر رات کا کھانا چنا ہوا تھا۔ میں حیرت سے یہ سامان دیکھ رہا تھا۔ بڈھا میری اس حیرت کو بھانپ کر مسکرایا اور بولا:

''مجھے یقین تھا کہ تم آج رات تک میرے پاس ضرور پہنچ جاؤ گے۔ میرا حساب کبھی غلط نہیں ہوتا۔ میں نے جیکب سے کہہ دیا تھا کہ کھانا تیار رکھے اور آتش دان میں آگ جلا دے۔ دریا قریب ہے، اس لیے یہاں سردی بہت ہوتی ہے۔ اچھا، شب بخیر!''

اس نے جلتا ہوا لیمپ ایک جانب رکھ دیا اور دروازے کی طرف دبے پاؤں جا کر غور سے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ چند سیکنڈ تک وہ دروازے سے کان لگائے سنتا رہا۔ اس کی اس حرکت پر میری حیرت دم بدم بڑھتی جاتی تھی۔ یکا یک اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ باہر تاریک برآمدے میں کوئی نہ تھا۔ ہوا ایک تیز جھونکا آیا اور لیمپ بجھ گیا۔ بڈھے کی آواز میرے کانوں میں آئی:

''طاقچے پر دیا سلائی موجود ہے، تم لیمپ جلا سکتے ہو۔''

میں نے اندھیرے میں ٹٹول کر دیا سلائی کی ڈبیا تلاش کی اور جب لیمپ روشن کر کے دروازے کی طرف گیا، تو وہ باہر سے بند تھا۔

☆☆

صبح جب میری آنکھ کھلی، تو باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور میرے سرہانے ایک اور منحوس صورت بڈھا کھڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ جیکب کنی ہے اور باورچی ہونے کے ساتھ

ساتھ عمارت کی چوکیداری بھی کرتا ہے۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور ناشتے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولا:

"غسل خانہ آپ کے بائیں ہاتھ ہے۔ کوئی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دیجیے گا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے لوہے کی بنی ہوئی ایک بڑی سی گھنٹی میز پر رکھ دی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گیا۔ حوائجِ ضروریہ سے فراغت کے بعد میں ناشتا کرنے لگا۔ اس دوران میں کمرے کا دروازہ پھر آہستہ سے کھلا اور چچا ایمس ولٹر اندر آیا۔ اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر موت کی سی زردی چھائی ہوئی تھی۔ اس کے سپید ہاتھوں اور ننگے پیروں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برص کا مرض اس کے تمام جسم پر پھیل چکا۔ کل کی طرح اس نے آج بھی گردن سے لے کر ٹخنوں تک لمبا سیاہ لبادہ پہن رکھا تھا اور سر پر پرانی وضع کا سیاہ کنٹوپ تھا۔ دبلا پتلا ہونے کے باعث وہ پہلی نظر میں لمبا آدمی معلوم ہوتا، لیکن حقیقتاً اس کا قد پانچ فٹ سے زائد نہ تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی، لیکن حلیے سے یوں لگتا تھا کہ وہ ستر سال سے زائد عرصہ اس دنیا میں بسر کر چکا ہے۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور کہنے لگا: "ناشتا تمھیں شاید پسند نہ آیا ہو۔ جیکب پرانا آدمی ہے، اسے نئی طرز کا ناشتا تیار کرنا نہیں آتا۔"

"نہیں چچا، ناشتا تو خوب ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

وہ چند لمحے میری جانب پلک جھپکائے بغیر تکتا رہا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ میرا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کی نظریں اتنی مقناطیسی تھیں کہ میں گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ کئی منٹ تک کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ میں جب میں ناشتے سے فارغ ہو چکا، تو ایمس نے گھنٹی بجائی اور ایک ثانیے بعد بڈھا جیکب کمرے میں داخل ہوا اور برتن اُٹھا کر چپکے سے باہر چلا گیا۔ جیکب کے جانے کے بعد ایمس اُٹھا اور اس نے پہلے کمرے کا دروازہ، پھر کھڑکیاں بند کیں، ان پر سیاہ پردے کھینچے اور پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد کہ آواز اب کمرے سے باہر نہیں جا سکتی، وہ بالکل میرے قریب آن کھڑا ہوا۔ خوف کی ایک ہلکی سی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ خدا معلوم یہ خبیث بڈھا اب مجھ سے کیا بات کہنا چاہتا ہے۔ میں نے رومال نکال کر پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھے۔ بڈھے نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

"بیٹا ایلس، میں نے بہت سوچ بچار کے بعد اس کام کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہے اور یقین ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کرو گے۔ بہت عرصہ گزرا، میں نے تمہیں اس وقت دیکھا تھا جب تم سات سال کے تھے اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں اپنی کُل جائداد کا وارث بناؤں گا۔"

میرا دل یکبارگی دھڑکا۔ بڈھا اپنی بات کا اثر دیکھنے کے لیے تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر اس نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا:

"لیکن اس سلسلے میں تمہیں چند شرائط پوری کرنا پڑیں گی اور مجھے یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔"

اب میں چونکا۔ "چچا ایمس، اگر آپ کی شرائط اس قابل ہوئیں جن کو میں پورا کر سکوں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

بڈھے کا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ اس نے اپنا استخوانی پنجہ میرے کندھے پر رکھا اور کہا:

"میری شرائط بہت آسان ہیں۔ اب غور سے سنو اور ان پر عمل کرنے کا وعدہ کرو۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تم مستقل طور پر میرے اس مکان میں رہو گے۔ مکان کے پچھواڑے ایک تہ خانہ ہے، جس میں مرنے کے بعد میری لاش رکھی جائے گی اور تہ خانے کا دروازہ سربمہر کیا جائے گا۔ اس تہ خانے کی نگرانی تمہارے ذمے ہوگی اور تم "کسی" کو بھی اس میں داخل نہ ہونے دو گے۔ اگر تم محسوس کرو کہ "کوئی" میرے

مقبرے کے دروازے کی مہر توڑ کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے، تو بلا تاخیر میری لائبریری میں جانا اور میز کے خانے میں سے کاغذات نکال کر دیکھنا۔ وہاں جو ہدایات درج ہوں، ان پر عمل کرنا۔ اس سے پہلے ان کاغذات کو دیکھنے کی کوشش نہ کرنا۔ بس میری یہی شرائط ہیں۔''

میرے دماغ میں ہل چل مچ گئی۔ میں حقیقتاً کچھ نہ سمجھ سکا کہ بڈھا ایمس کیا کہہ رہا ہے، تاہم میں نے اتنا اندازہ لگا لیا کہ کسی حادثے کے باعث اس کا دماغ خراب ہو چکا، اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ میں نے بحث کرنے کے بجائے اس سے کہا کہ ان تمام شرائط پر عمل کرنے میں مجھے کوئی انکار نہیں۔ ایمس ولڈر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ مکروہ تبسم اس کے پتلے ہونٹوں پر نمودار ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر پردے ہٹائے، ایک کھڑکی کھولی جو باغ کی جانب کھلتی تھی جہاں سوائے جھاڑ جھنکاڑ کے اور کچھ نہ تھا۔ کھڑکی کھلتے ہی بڈھا اپنی جگہ بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جھاڑیوں کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ یکا یک وہ یوں بُڑبُڑایا جیسے کسی سے باتیں کر رہا ہو:

''میں نے اب تک تمہیں قریب نہیں پھٹکنے دیا..... ایمس ولڈر تمہارے قابو میں آنے والا نہیں..... اینڈریو! کیا تم میری بات سنتے ہو؟''

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ دفعتاً وہ میری طرف مڑا اور کہنے لگا:

''ایلس، اب تم جا سکتے ہو۔ میں اب تمہیں دوبارہ نہ مل سکوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اُٹھاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں ابھی کچھ سوچنے سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ جیکب کنّی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ انتہائی بدحواس اور خوف زدہ تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور تقریباً گھسیٹتا ہوا کمرے سے باہر لے گیا۔ اِدھر اُدھر بغور احتیاط دیکھ کر اس نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا:

''ماسٹر ایمس آپ سے کیا کہتے تھے؟''

میں نے جیکب کی طرف گھور کر دیکھا اور ڈانٹ کر کہا:

''بے وقوف بڈھے، کیا تُو چھپ کر ہماری باتیں سن رہا تھا؟''

وہ خوف سے لرز گیا اور منہ پھیر کر مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ میں اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔ معاملہ لحہ بہ لحہ پُراسرار بنتا جا رہا تھا۔ ایمس ولڈر کے الفاظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے ذہن پر منوں بوجھ رکھ دیا گیا ہے۔ میں نے بستر پر لیٹ کر اس معمے کو غور و فکر کے ذریعے حل کرنا چاہا، لیکن واقعات اس قدر الجھے ہوئے اور بے ترتیب تھے کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ تاہم ایک بات یقینی تھی کہ اگر بڈھا ایمس پاگل نہیں، تو اسے کسی شخص..... اینڈریو سے خطرہ ضرور ہے اور پھر مقبرے والی بات..... میرا دماغ چکرانے لگا۔ آخر اس نے اس بات پر زور کیوں دیا کہ مقبرے کے اندر کوئی شخص داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔ حالانکہ بڈھا ایمس تو ابھی زندہ ہے۔ مجھے جیکب کا خیال آیا۔ آخر وہ کیوں پوچھتا تھا کہ ماسٹر ایمس نے مجھ سے کیا باتیں کیں۔ میں دماغ پر جتنا زور دیتا، معاملہ اتنا ہی پُراسرار اور تکلیف دہ بنتا چلا جاتا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے چند روز تک یہیں قیام کر کے اس گتھی کو سلجھانا ہو گا اور اپنے چچا کی گزشتہ زندگی کے حالات کرید کرید کر معلوم کرنا ہوں گے۔

دوپہر کو وہی بڈھا جیکب میرے لیے کھانا لے کر آیا اور کچھ کہے سنے بغیر واپس چلا گیا۔ میں نے بھی اسے منہ لگانا مناسب نہ سمجھا۔ کھانے سے نمٹ کر میں چہل قدمی کے ارادے سے باہر نکلا۔ چچا ایمس غالباً مکان میں نہ تھا، ورنہ میں اسے ضرور دیکھتا۔ پھر مجھے اس کے الفاظ یاد آئے کہ اب ہم نہ مل سکیں گے۔ میں سوچنے لگا کہ ان الفاظ کا کیا مقصد تھا؟ ساک پیری کے نواح میں سہ پہر تک گھومنے کے بعد

جب میں تازہ دم ہو کر ورلڈر ہاؤس پہنچا، تو نچلی منزل کے بڑے کمرے میں ایک تیسرے بڈھے کو کرسی پر بیٹھے پایا۔ میں نے دل میں کہا:

بُرے پھنسے..... یہ مکان تو بڈھوں کی آرام گاہ بنا ہوا ہے۔ خدا معلوم ابھی یہاں کتنے ایسے ہی زندہ درگور لوگ چھپے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بڈھا کرسی سے اُٹھا اور استفہامیہ نظروں سے تکتے ہوئے کہنے لگا:

''کیا آپ ہی کا نام ایلس ہے؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلائی، تب اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''مسٹر ایلس، میں نہایت رنج کے ساتھ یہ منحوس خبر آپ کو سنا رہا ہوں کہ تھوڑی دیر پہلے آپ کے چچا ایمس ولڈر اس دنیا سے چل بسے۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے یوں معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے پوری قوت سے آہنی ہتھوڑا میرے سر پر دے مارا ہو۔ میں گم صم ہو کر بے وقوفوں کی طرح اس اجنبی بڈھے کی صورت دیکھنے لگا۔ حیرت اور رنج کی ایسی کیفیت مجھ پر زندگی میں پھر کبھی طاری نہیں ہوئی جیسی اس روز ایمس ولڈر کے مر جانے کی یکا یک خبر سن کر ہوئی تھی۔

''کیا کہتے ہو؟'' میں نے بے قابو ہو کر تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''چچا ایمس چل بسے؟ کیسے؟ کب؟''

''ابھی آدھ گھنٹہ قبل۔'' بڈھے نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''جن حالات میں وہ موت سے دوچار ہوئے، ان سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے خودکشی کی ہے۔ میرا نام تھامس ویدربی ہے اور میں بہت عرصے سے آنجہانی کا مشیرِ قانون ہوں اور.....''

''ذرا ٹھہریئے۔'' میں نے قطع کلام کیا۔ ''میں تفصیل سے تمام واقعہ سننا چاہتا ہوں۔''

وکیل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور یوں تقریر کے لیے کھڑا ہوا جیسے کسی عدالت میں کھڑا ہے:

''صاحب، اصل قصہ یہ ہوا کہ اب سے کوئی آدھ گھنٹہ قبل حسبِ معمول چوکیدار جیکب اپنے آقا کو تلاش کرتا ہوا تیسری منزل کے آخری کمرے میں پہنچا، تو اس نے آنجہانی کو ایک میز پر اس عالم میں بیٹھے پایا جیسے وہ لکھتے لکھتے اونگھ گیا ہو، کیونکہ اس کے ساتھ چند کاغذ پڑے تھے اور ہاتھ میں قلم تھا۔ وہ کاغذ پر چند حروف، آپ کا نام یعنی مسٹر ایلس اور..... سینٹ لوئیس کا پتہ ہی لکھ پایا تھا۔ زہر نے اپنا کام کیا اور پھر وہ اس سے آگے نہ لکھ سکا۔ اوّل خیال ہوا کہ اس کی موت حرکتِ قلب بند ہو جانے سے واقع ہوئی ہے، لیکن جب ڈاکٹر نے معائنہ کیا، تو انکشاف ہوا کہ دانستہ یا غلطی سے افیون زیادہ کھا جانے کے باعث یہ مہلک حادثہ پیش آیا ہے۔ بہرحال یہ فیصلہ کرنا جیوری کا کام ہے جس کا اجلاس ابھی تھوڑی دیر بعد ہونے والا ہے اور اس اجلاس میں اصلی وصیت نامہ بھی کھولا جائے گا اور آپ کو میرے ہمراہ چلنا ہوگا۔

جیوری کے کل ارکان بارہ تھے جنھوں نے پانچ منٹ میں فیصلہ دے دیا کہ ایمس ولڈر کی موت ناگہانی طور پر افیون زیادہ استعمال کرنے سے ہوئی ہے اور یہ اقدام خودکشی کا نہیں ہے۔ جیوری کے اس فیصلے سے قصبے کے پادری کو، جو آنجہانی کے دفنانے کی آخری رسوم ادا کرنے والا تھا، قطعاً اتفاق نہ تھا۔ وہ بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ اس بڈھے نے خودکشی کی ہے اور میں ایسے شخص کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے بھی تیار نہیں۔ وصیت کو کھولا گیا، تو اس میں چوکیدار اور گھر کی دیکھ بھال کرنے والی خاتون کو معقول رقم عطا کرنے کے علاوہ ساری جائیداد میرے نام کر دی گئی تھی، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ میں جب تک زندہ رہوں ولڈر ہاؤس میں مقیم رہوں گا۔

یہ سارا واقعہ اس سرعت سے پیش آیا کہ غور کرنے اور سوچنے کی تمام قوتیں سلب ہو گئیں۔ جائیداد ملنے کی اگرچہ

مجھے دل ہی دل میں خوشی بھی تھی، لیکن جب چچا ایمس کی عجیب وغریب شرائط سامنے آتیں، تو ذہن مفلوج ہو جاتا۔ دراصل مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ایمس نے خودکشی کی ہے، تبھی وہ مجھ سے کہہ رہا تھا: ''اب ہم دوبارہ نہ مل سکیں گے۔''

سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے ایمس ولڈر کی لاش تابوت میں بند کر کے دفن کر دی گئی جس کی اس نے ایک روز پہلے ہدایت کی تھی۔ تہ خانے کا دروازہ میں نے اپنے سامنے سربمہر کرایا۔ ساک پیری کے وہ سب لوگ جو جنازے کی رسوم میں شریک ہوئے، تعزیت کر کے رخصت ہو چکے تھے اور میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور جیکب اندر آیا۔ اس کی آنکھیں ویران اور سرد تھیں، چہرے پر ایک عجیب قسم کی وحشت برس رہی تھی۔ وہ کہنے لگا:

''جناب عالی، میں صرف یہ اطلاع دینے آیا ہوں کہ میں اب ایک لمحے کے لیے بھی اس منحوس مکان میں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ میں آپ سے کسی تنخواہ اور کسی معاوضہ کا مطالبہ نہیں کرتا۔ مجھے فوراً رخصت کر دیجیے۔''

''کیوں؟ تمہیں یہاں کیا تکلیف ہے؟'' میں نے تعجب سے پوچھا۔

''جناب تکلیف تو کوئی نہیں۔'' جیکب رُک رُک کر بولا اور پھر کمرے میں چاروں طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا:

''صاحب، کیا عرض کروں۔ آنجہانی ماسٹر ایمس جب تک زندہ تھے، اس مکان میں بڑے بڑے پُراسرار اور ناقابل یقین تماشے میں نے دیکھے ہیں اور اب ان کے مرنے کے بعد بھی ایسی ہی باتیں ظہور میں آئیں گی۔ میں اب اس آسیب زدہ مکان میں نہیں رہ سکتا۔''

میں نے جیکب سے ان پُراسرار اور ناقابل یقین تماشوں کی تفصیلات پوچھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن اس کی حالت اتنی ابتر اور شکستہ تھی کہ وہ کچھ بتا نہ سکا اور جانے پر اصرار کرتا رہا۔ آخر میں نے اس سے کہا کہ چند دن مزید ٹھہرو، بعد میں چلے جانا۔ یہ سن کر اس نے مؤدبانہ انداز میں گردن جھکائی اور آنسو پونچھتا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے گھر کی دیکھ بھال کرنے والی خادمہ مسز سیلڈن کو طلب کیا اور جب اسے بتایا کہ جیکب فوراً رخصت ہونے کی اجازت مانگ رہا تھا، تو بڑھیا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کے مرجھائے ہوئے ہونٹ اور خشک ہو گئے اور وہ اپنی دھنسی ہوئی زرد آنکھوں سے مجھے تکنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ خوف سے اس کے دونوں ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے جلد ہی اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا اور کہنے لگی:

''سرکار، آپ اس بڈھے کو ہرگز نہ جانے دیجیے۔ وہ سٹھیا گیا ہے۔ غالباً اپنے آقا کی بے وقت موت کے صدمے سے اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ میں اسے سمجھا دوں گی۔''

اب میں نے مسز سیلڈن سے بھی اس مکان اور اس کے آنجہانی مکین ایمس ولڈر کی گزشتہ زندگی کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہا، تو اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا:

''سرکار، میں کچھ نہیں بتا سکتی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں تو ان کے کسی معاملے میں کبھی دخل نہیں دیتی تھی۔''

ایمس ولڈر کی موت کے تین روز بعد کا ذکر ہے۔ میں رات کا کھانا کھا کر دیر تک ایک افسانہ لکھتا رہا اور جب سونے کے لیے بستر پر لیٹا، تو ایک بج رہا تھا۔ مکان کے چاروں طرف ایک بھیانک سناٹا اور تاریکی مسلط تھی اور دُور جنگل میں کوئی اُلّو اپنی منحوس آواز میں چیخ رہا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی میں نیند کی آغوش میں پہنچ گیا۔ خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ چچا ایمس ولڈر میرے سامنے کھڑا ہے۔ اس نے وہی بغیر آستین کا سیاہ لبادہ پہن رکھا ہے اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے مجھے گھور رہا ہے۔ یکایک اس کے لب کھلے اور اس نے تحکمانہ انداز میں مجھ سے کہا:

''ایلس.....تم بلا تاخیر میری لائبریری میں جاؤ اور ساتویں الماری کے دوسرے خانے میں کتابیں رکھی ہیں، انھیں بغور دیکھو۔ ان کتابوں کے اندر جو ہدایات ملیں، ان پر عمل کرو۔''

یہ خواب دیکھتے ہی میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اپنا دل بے تابی سے دھڑکتے ہوئے پایا۔ بڈھے ایمس کی صورت میری آنکھوں کے آگے گھوم رہی تھی اور خواب میں کہے گئے الفاظ کانوں میں مسلسل گونج رہے تھے۔ میں پھر ساری رات نہ سو سکا اور سورج کی پہلی کرن جونہی نمودار ہوئی، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا سارا ڈر دُور ہو گیا ہو۔ پھر میں دیر تک ایک بچے کی نیند سوتا رہا۔ دوبارہ آنکھ کھلی، تو میں بالکل تازہ دم تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر حسب معمول مقبرے کی جانب گیا اور دروازے کی مہر کا معائنہ کیا۔ اسے کسی نے نہ چھیڑا تھا۔ میں مطمئن ہو گیا۔

رات کو پھر جونہی میں بستر پر لیٹا، بڈھا ایمس خواب میں دکھائی دیا۔ اس مرتبہ اس کی حالت پہلے سے بھی ابتر تھی اور چہرہ بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا۔ اس نے پھر وہی الفاظ دہرائے جو گزشتہ رات کہے تھے۔ میں پھر ساری رات مضطرب رہا۔ تیسری رات ایمس خواب میں میرے سامنے کھڑا تھا اور وہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ اس مرتبہ اس کی نگاہوں سے شعلے برس رہے تھے اور لہجے میں حد درجے کی تلخی اور تحکم تھا۔

آنکھ کھلی تو میں نے اپنا جسم پسینے سے تر پایا۔ ایسی ذہنی اذیت سے مجھے کبھی واسطہ نہ پڑا تھا۔ میں نے اسی وقت لیمپ ہاتھ میں لیا اور دبے پاؤں چلتا ہوا لائبریری کی طرف گیا۔ اس کا قفل کھولا اور ساتویں الماری کے قریب پہنچا جس کے اوپر سیاہ رنگ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس پردے کو چھوا، تو میرے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی جیسے میں نے کسی گندی شے کو ہاتھ لگا دیا ہو۔ لکڑی کی بنی ہوئی اس الماری کے چار خانے تھے جن میں صدیوں پرانی بوسیدہ کتابیں بھری تھیں۔ اس کے دوسرے خانے کی پہلی کتاب کو اُٹھا کر جونہی میں نے پہلا صفحہ اُلٹا، تو میرے ہاتھ کانپ گئے اور کتاب فرش پر گر پڑی۔ کہہ نہیں سکتا کہ مجھ پر کتنی ہیبت اس کتاب کو دیکھ کر طاری ہوئی اور اس کتاب پر کیا منحصر کہ اس خانے میں جتنی کتابیں رکھی تھیں، ان سب کا موضوع ہی ایسا تھا جو دل میں خوف و دہشت کے ساتھ نفرت کے جذبات پیدا کرنے والا تھا، یعنی کالا جادو یا علم سفلی ان کتابوں کا موضوع تھا اور یہ سب کی سب لاطینی زبان کی قلمی کتابیں تھیں۔ ان میں کہیں کہیں سرخ روشنائی سے مختلف عبارتوں کے نیچے نشان لگائے گئے تھے جن پر بڈھے ایمس کے دستخط اور تاریخ درج تھی۔ میں ان تمام نشان زدہ کتابوں کو اُٹھا کر اپنے کمرے میں لایا اور ان کی عبارتیں سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لاطینی زبان میں نے عرصہ پہلے ایک شخص سے پڑھی تھی، وہ اب کام آئی، لیکن جو اب اتنے پرانے اور شکستہ تھے کہ انھیں پڑھنا کارے دارد تھا۔

میں صبح تک ان عبارتوں میں سر کھپاتا رہا اور بالآخر ان میں سے ایک پیراگراف کا ترجمہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔'' جو کچھ یوں تھا:

''اس کائنات کی بے کراں وسعتوں میں لاکھوں بدروحیں، آسیب اور شیطانی قوتیں کارفرما ہیں جو دن رات کے ہر لمحے میں زمین کی طرف یلغار کرتی ہیں اور جس روح کو کمزور دیکھیں، اس پر قابو پانے کی کوشش کرتی ہیں۔ خصوصاً سورج غروب ہونے کے بعد اور صبح کاذب تک ان روحوں کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ جہاں چاہے جا سکتی ہیں۔ پس ان کو روکنے کے لیے مختلف تدابیر پر عمل کیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد جب کوئی روح جسم سے نکل جاتی ہے، تو بدروحیں اسے اپنے ساتھ ملانے کے لیے بے تاب ہوتی ہیں۔ اگر اس وقت مرنے والے کی قبر اور جسم کی حفاظت نہ کی جائے، تو وہ ہمیشہ کے لیے عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔''

اس عبارت کے آگے حاشیے میں ایمس ولڈر نے لکھا تھا:

''بیٹا ایمس، جب میں مرجاؤں اور تم میری ہدایت کے مطابق مقبرے میں مجھے دفن کر کے دروازہ سر بمہر کر دو، تو اس کے بعد میرے مقبرے کو بلاؤں سے محفوظ رکھنے کے لیے قبرستان میں جانا اور ایک پرانی کھوپڑی کو پیس کر اس کا سفوف بنا لینا۔ بعدازاں ایک کم سن بچے کے خون میں یہ سفوف حل کر کے چودھویں رات کوتہ خانے کے دروازے پر کھوپڑی کی تصویر بنا دینا۔ یہ عمل تین مرتبہ چاند کی ہر چودھویں رات کو کرنا ضروری ہے۔''

جب یہ عبارت میں نے پڑھی، تو دہشت سے میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ میں نے دیوانگی کے عالم میں کتابیں اُٹھا کر فرش پر پھینک دیں۔ خدا کی پناہ! اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ منحوس بڈھا مرنے کے بعد مجھ سے ایسے بے ہودہ اور ناپاک کام لینا چاہتا ہے، تو میں کبھی اس سے وعدہ نہ کرتا۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ کر رونے لگا اور دیر تک اپنی حالت پر روتا رہا۔ کاش! میں یہاں نہ آتا اور اپنے آپ کو اس عذاب میں مبتلا نہ کرتا۔

ان کتابوں سے ظاہر ہو گیا تھا کہ میرا چچا نہ صرف کالے جادو پر یقین رکھتا تھا، بلکہ اس پر عمل پیرا بھی تھا اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس نے اپنی طویل زندگی میں اس جادو کے زور سے کیا کیا کارنامے انجام دیے ہوں گے اور اب..... مرنے کے بعد بھی اسی مشغلے میں اُلجھا ہوا ہے۔

اس روز میری بھوک پیاس سب اُڑ گئی۔ بار بار میری نگاہ اس مقبرے کی طرف جاتی جہاں اس جادوگر کی لاش تابوت میں رکھی تھی۔ ایک بار میرے جی میں آیا کہ دروازے کی مہر توڑ ڈالوں اور لاش کو تابوت سے نکال کر نذرِ آتش کر دوں، لیکن ایسا کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ گاؤں بھر کے لوگ میرے اس فعل پر نفرین کرتے اور کہتے کہ چچا نے اپنی ساری جائداد بھتیجے کو بخش دی اور اس کا صلہ دیا گیا ہے۔ جیکب اور مسز سیلڈن کا رویہ بھی میرے ساتھ عجیب تھا۔ اوّل تو وہ میرے قریب ہی نہ پھٹکتے اور جب طوعاً و کرہاً آتے، تو سہمے سہمے سے رہتے۔

رات کو میں ٹہلنے کے لیے دریا کی طرف نکل گیا۔ شام کا وقت بڑا سہانا تھا۔ پرندوں کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں آسمان کے مشرقی کنارے سے چودھویں کے چاند نے جھانکا اور اپنی سنہری کرنیں دریا اور جنگل پر بکھیرتا ہوا آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھنے لگا۔ میں دُور تک ٹہلتا چلا گیا اور اس معمے کو حل کرنے میں ایسا محو ہوا کہ وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ جب میں واپس لوٹا، تو چاند پوری آب و تاب کے ساتھ آسمان کے عین درمیان میں روشن تھا اور ہر شے چاندنی میں نہا رہی تھی۔ تمام راستے مجھے کوئی آدمی نظر نہ آیا اور میں یہاں کے لوگوں کی بدذوقی اور فطرت کے حسن سے بے نیازی پر دل ہی دل میں کُڑھتا ہوا جب ولڈر ہاؤس کے اُجڑے ہوئے باغ میں پہنچا، تو ایک ثانیے کے لیے میری نگاہوں کے سامنے کچھ فاصلے پر کسی آدمی کا سایہ زمین پر پڑتا دکھائی دیا۔ میں نے غور سے دیکھا، تو یہ سایہ اس جانب بڑھ رہا تھا جدھر ولڈر ہاؤس کے مغربی گوشے میں لائبریری کا کمرا تھا۔

میں ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ بلاشبہ یہ کوئی آدمی تھا جو مکان کے اندر جانا چاہتا تھا۔ چند لمحے بعد وہ جھاڑیوں کے اندر سے نکلا اور کھلی جگہ میں آ گیا۔ اب میں نے اس کا چہرہ دیکھا جو دودھ کے مانند سپید تھا اور اس کے سر کے بال بھی چاندی کے تاروں کے مانند چمک رہے تھے۔ اس کا قد چھے فٹ سے نکلتا ہوا اور سر سے پیر تک سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا تھا۔ مجھ سے اس کا فاصلہ اندازاً تیس گز تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ مکان کی طرف دیکھتا رہا، پھر کچھ سوچ کر آہستہ آہستہ نپے تلے قدموں کے ساتھ مقبرے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ لنگڑا کر چلتا ہے اور اس کی کمر بھی جھکی ہوئی ہے۔ میں بھی اس کے تعاقب میں دبے پاؤں چل رہا تھا،

کیونکہ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مقبرے کے پاس جا کر کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

مقبرے کے گرد اُونچی گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کثرت سے تھا اور ناممکن تھا کہ کوئی شخص ادھر جائے اور اس کے پیر میں کانٹا نہ چبھے، لیکن یہ دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہونے لگا کہ یہ شخص جو ننگے پیر تھا، اس اطمینان اور بے پروائی سے اس جھنکاڑ کے اندر چل رہا تھا جیسے اس کے پیروں تلے مخملیں فرش بچھا ہوا ہو۔ یکا یک بادل کے ایک آوارہ ٹکڑے نے چاندنی کا راستہ روک لیا اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اس موقعے سے فائدہ اُٹھایا اور جلدی سے مقبرے کے قریب پہنچ گیا۔ میں چاہتا تھا کہ چپکے سے جا کر اس شخص کو پیچھے سے پکڑ لوں۔ اتنے میں چاند نے پھر بادل میں سے جھانکا اور میں نے دیکھا کہ یہ پُراسرار شخص گھٹنوں کے بل جھکا ہوا مقبرے کے دروازے کا معائنہ کر رہا ہے۔ غالباً وہ دیکھ رہا تھا کہ اسے کس طرح کھولا جا سکتا ہے۔ اتنے میں مغرب کی جانب سے ایک بہت بڑی چمگادڑ پرواز کرتی ہوئی آئی اور اس کے پیروں کا سایہ اس شخص پر پڑا۔ اس نے فوراً گردن اُٹھا کر اُوپر دیکھا اور مسکرایا۔ اس کے چمکتے ہوئے نوکیلے دانت دیکھ کر مجھے بڑی دہشت ہوئی۔

دوسرے ہی لمحے وہ دروازے کے قریب لیٹ گیا اور اس وقت میری آنکھوں نے جو دہشت انگیز منظر دیکھا، وہ میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔ وہ شخص آہستہ آہستہ سکڑنے لگا۔ پہلے مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ میں چند قدم آگے بڑھا اور میری آہٹ پا کر سکڑتے ہوئے اس شخص نے جو یقیناً کوئی بدروح تھی، میری جانب دیکھا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ خدا جانے اس وقت وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھے اس بدروح سے لپٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک ہی جست میں میں اس پر جا پڑا۔ اس کا دایاں پنجہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ عین اسی وقت کسی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی وزنی شے دے ماری اور میں اس چوٹ کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گیا۔

سنہرے الفاظ

درخت جتنا اُونچا ہوگا اس کا
سایہ اتنا ہی چھوٹا ہوگا اس لیے
"اونچا" بننے کی بجائے
"بڑا" بننے کی کوشش کرو

☆☆☆

زمین کے اُوپر عاجزی کے ساتھ
رہنا سیکھ لو، زمین کے نیچے سکون سے
رہ پاؤ گے۔

☆☆☆

غالباً ایک گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا، تو میں نے اپنے آپ کو مقبرے کے دروازے کے قریب پڑے پایا۔ میرا دماغ چکرا رہا تھا اور سر کے اس حصے میں جہاں نادیدہ دشمن نے ضرب لگائی تھی، شدید ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ یہ حادثہ ایک خواب کے مانند مجھے یاد تھا اور یقیناً میں اسے خواب ہی سمجھتا، اگر میرے بائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبا ہوا وہ انسانی پنجہ نہ ہوتا جو ایمس ولڈر کے مقبرے کا دروازہ کھولنا چاہتا تھا حواس بحال ہونے کے ساتھ ہی مجھے اس پنجے کی موجودگی کا احساس ہوا بلاشبہ وہ میرے ہاتھ میں تھا۔ لمبی، سپید پانچ انگلیوں کا انسانی پنجہ ۔۔۔۔۔ جس میں ہڈیاں تھیں اور ان پر صرف کھال منڈھی ہوئی تھی۔ چاند ایک مرتبہ پھر بادل کی اوٹ میں چھپ چکا تھا اور میرے چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی۔ میں پہلے اس پنجے کو کسی پودے سے اکھڑی ہوئی شاخ سمجھا تھا، لیکن جب اسے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھا، تو دہشت کی ایک نئی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی اور پچھلے پہر کی سردی کے باوجود میری پیشانی پسینے سے بھیگ گئی۔

(جاری ہے)

ایک حسرتِ تعمیر

رفیع الدین احمد

تجربہ سچائی ثابت کرنے کی تسلیم شدہ کسوٹی ہے اور اس مقولے پر یقین اس وقت آیا جب ہم خود تجربے کی کٹھن راہوں سے کسی نہ کسی طرح گزر گئے۔ بات یہ ہوئی کہ بیگم نے مکان بنانے کے لیے ہم پر اتنا دباؤ ڈالا جتنا مالٹے پر جوس نکالنے کے لیے ڈالا جاتا ہے۔ شروع شروع میں ہم نے سمجھا بیگم سٹھیا گئیں یا بلند فشارِ خون (بلڈ پریشر) کی مریضہ ہونے کی وجہ سے عقل گھاس چرنے چلی گئی ہے، لیکن جب اس فرمائش پر وہ مستقل مزاجی سے ڈٹی رہیں، تو ہمیں یقین ہوا دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ میرے دوستوں میں ایک دماغی امراض کا ڈاکٹر بھی ہے، کو گھر بلایا اور کہا:

''دیکھو، بیگم کا اس طرح معائنہ کرو، اسے گمان نہ ہو کہ دماغ کے خلل کا جائزہ لیا جا رہا ہے، ورنہ رشتۂ ازدواج ٹوٹ جانے کا خطرہ ہے۔''

کھانے کی میز پر وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور میں اس ڈرامے کا خاموش تماشائی بنا بیٹھا رہا۔ ہمارے دوست نے ان سے بے تکلفی میں کئی سوالات کر ڈالے مثلاً:

''سالن میں مرچیں کم ہیں، شاید آپ کم مرچیں کھ ہیں؟''

''دیسی گھی چھوڑے کتنا زمانہ گزر گیا بھابھی؟''

''آپ کا ڈائننگ روم ذرا چھوٹا معلوم ہوتا ہے، آ مکان بدل کیوں نہیں لیتیں؟''

''کل وزیرِاعظم کی تقریر سنی تھی آپ نے؟ ایک بار انھوں نے مکان دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

''ملک میں فقیر بہت ہو گئے ہیں۔''

میں سوالات و جوابات سے لطف اندوز ہو رہا تھ لیکن مزے کی بات یہ تھی، ہر سوال کا جواب مکان تعمیر کی ضرورت تک پہنچ کر ختم ہوتا۔ بعد میں میر

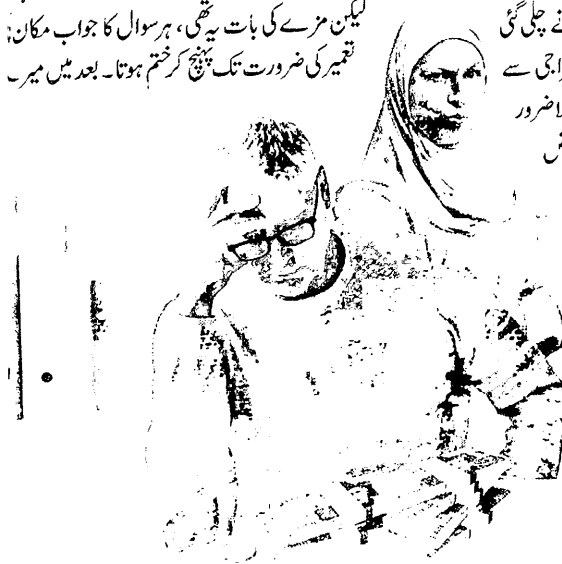

سناتے جاتے ہیں در پردہ گالیاں مجھ کو ❊ جو میں کہوں تو کہیں آپ سے کلام نہیں

پیش لفظ

ہم اپنی تہذیبی اقدار کو بہت عزیز رکھتے ہیں۔ مذہب، سیاست، سماج، سبھی کی ہماری نگاہ میں بڑی وقعت ہے۔ نوک لاج کا لحاظ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مگر ان سب کے شکنجے میں کبھی کبھی دم گھٹنے لگتا ہے اور صداقت خرافات میں گم ہوتی نظر آتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں کوئی کھوٹ ہے، مگر ہم اس کا اعتراف کرتے ہوئے شرماتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو کچھ ایسے جھمیلوں میں جکڑا ہوا پاتے ہیں جن سے نکلنا محال ہے۔ جو طور طریقے سکھی جیون بسر کرنے کے لیے اپنایا کرتے تھے اب وہی طریقے وبال جان محسوس ہونے لگتے ہیں۔ بے چینی ایسی کہ کسی کروٹ چین نہیں ملتا، اور پھر ضرورت پڑتی ہے کچھ مسکراہٹوں کی، گنگناہٹوں کی آہٹوں کی، جس میں کھو کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی، قاری زندگی کی کٹھنائیوں کو لطافتوں میں بدل دیتا ہے اور یوں ایک نئی خوبصورت جہت زندگی سے متعارف ہوتا ہے۔ گھر بنانا ہر جوڑے کا اوّلیں خواب رہا ہے مگر یہ خواب کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد بھی بسا اوقات نصیب نہیں ہوتا، میاں بیوی کی ایک خوبصورت نوک جھونک اس کا پتا دیتی ہے۔

دوست نے بتایا، مقاطعۂ ازدواج سے بچنا چاہتے ہو، تو مکان بنوانا ہی پڑے گا کیونکہ بیگم کی یہ خواہش تحت الشعور سے نکل کر اب شعور تک آ گئی ہے۔

میں نے ترکش کا آخری تیر چلایا اور ذاتی مکان بنانے کے عیوب اور نقائص پر بیگم کو دن رات شعوری طور پر لیکچر دینے لگا، کیونکہ جس طرح خلوص کا جواب خلوص سے دیا جاسکتا تھا۔ بیگم جب بھی مکان کا ذکر لے بیٹھتیں، میں اس کی مخالفت میں تقریر کرنے لگتا۔ مثلاً:

''سیلاب آنے سے اپنا مکان تباہ ہو جائے گا اور اس نقصان کی تلافی زندگی بھر نہ ہو سکے گی۔''

''جائیداد ٹیکس والے ناک میں دم کر دیں گے۔''

''رشتے دار حسد کریں گے۔''

''ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن والوں کی قسطیں کٹوانے سے تنخواہ اور کم ہو جائے گی۔''

''میٹریل بہت مہنگا ہے۔''

''مزدوروں کی مزدوری دگنی ہو گئی ہے۔''

''پھر بجلی اور پانی کا کنکشن لینا ایمان کی کمزوری پیدا کرتا ہے کیونکہ رشوت دیے بغیر ان کا حصول ناممکن ہے۔''

''اگر زلزلہ آ گیا تو.....؟''

مگر ان سارے خدشات کا ایک ہی جواب ملتا: ''آخر اور لوگ بھی تو ذاتی مکان میں رہتے ہیں، کیا ان کے ساتھ یہ مسئلہ نہیں؟ اور ہاں، گزشتہ ہفتے ہی زلزلہ آیا، کس کس کا مکان گرا؟ تمہیں تو بس بہانہ چاہیے!''

''بیگم، سمجھتیں کیوں نہیں؟ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہ جائیداد اور مکان کام نہ آئیں گے۔ اصل مکان کی فکر کرو، دوگز کا ہوتا ہے وہ اور بہت سے لوگوں کو وہ بھی کوئے یار میں نصیب نہیں ہوتا۔ کرائے کے اس مکان میں کیا تکلیف ہے؟ ہر چیز کی آسائش موجود ہے۔ اگر کوئی تکلیف ہوئی، تو جب چاہیں مکان بدل لیں۔ زیادہ سے زیادہ نئے مکان کی تلاش کے بعد ایک نیا جوتا خریدنا ہوگا، بس۔''

اس طرح کی بحث اکثر کھانے کی میز پر، مہمانوں کے سامنے یا رات کے تخلیے میں ہوتی۔ ان کی مستقل مزاجی کا یہ عالم تھا کہ مجھے قائل کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہیں اور میرے دلائل کسی کمیونسٹ کے ذہن کی طرح کمزور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ایسا وقت آیا جب میری قوت مدافعت معدوم ہو گئی، تاہم میں مکمل طور پر ہتھیار ڈال دینے کے حق میں نہ تھا، اس لیے سیاسی معاہدے جیسے مبہم اور پیچیدہ الفاظ کی زبان میں کہا:

''دیکھو بیگم، آپ کی بات میں رد نہیں کرتا، لیکن ایک شرط ہے۔''

''وہ کیا؟'' اس نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

''ایسی جگہ مکان بنوائیں گے جہاں کوئی ہم سخن ہو نہ ہو زباں اور اگر بیمار پڑ جائیں، تو کوئی تیماردار بھی نہ ہو.....''

''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ تمہارا دماغ تو.....''

''ایک اور شرط ہے۔'' میں نے ان کی بات کاٹی۔

''میرے خیال میں بے در و دیوار سا ایک گھر بنانا چاہیے۔''

''ہائیں!'' دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

اس واقعے کے بعد ایک ہفتے تک وہ سوچ میں ڈوبی رہیں اور سلسلۂ گفتگو تقریباً منقطع ہو گیا۔ کچھ پوچھتا بھی، تو ہاں ناں میں جواب دے کر ایک طرف ہو جاتیں۔ اس دوران چائے میں چینی مناسب ملی نہ سالن میں نمک۔ جوتے پر پالش کی چمک مدھم ہو گئی۔ کپڑے اچھی استری سے محروم ہوئے، فلم دیکھنے کی فرمائش بالکل ختم ہو گئی اور میرے دفتر جاتے وقت خدا حافظ کہنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔

یہ صورت حال ہر اس شوہر کے لیے تشویش ناک ہوتی ہے جس کی صرف ایک بیوی ہو۔ آثار بتا رہے تھے کہ اگر باہم کچھ مشورے نہ ہوئے، تو دلوں کی رنجشیں بڑھتی رہیں گی، لیکن مشورہ یا مذاکرہ کیونکر ہوتا جبکہ دونوں طرف برابر آگ لگی تھی۔

بہر حال میں نے باہمی روابط کے فروغ کی خاطر جنگ بندی قبول کر لی اور ہاؤس بلڈنگ کو پیشگی رقم کے لیے درخواست دے دی۔ یہ پیشگی کس طرح ملی، کس کس کی خوشامد کی اور کیسے کیسے سخت پاپڑ بیلنے پڑے، اس کا ذکر کروں، تو طوالت کے مارے نفس مضمون غائب ہو جائے گا۔

دو مہینے بعد پیشگی رقم ملی، تب اکر بیگم کے سامنے رکھ دی۔ وہ حیرانی سے کبھی میرا چہرہ دیکھتیں اور کبھی نوٹوں کی قطار۔ ان کا چہرہ چمکنے لگا، باچھیں کھل گئیں اور مسکراہٹ لبوں پر کھیل گئی۔ دو ماہ کی خاموشی کے بعد انھوں نے لب کھولے:

''یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں؟''

''یہ تمہارے غیر معقول خوابوں کی تعبیر کا پہلا مرحلہ ہے۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تو کیا پیشگی رقم مل گئی؟'' انھوں نے شوخی سے پوچھا۔

''ہائے! پہلے کیوں نہ بتایا؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اب مہربانی کر کے چائے اور سالن میں چینی اور نمک کا خیال رکھ لیا کیجیے۔''

رقم آ تو گئی، لیکن بحث کا نیا دروازہ کھل گیا اور خوب سے خوب تر کی تلاش شروع ہو گئی۔ اُٹھتے بیٹھتے یہی مشورہ ہوتا رہتا:

''کتنے کمروں کا گھر ہونا چاہیے؟''

''صدر دروازہ مشرق میں ہو یا مغرب میں؟''

''چھت پختہ ہو یا شہتیر بالے سے کام لیا جائے؟''

''باورچی خانے کے بغیر کام چل سکتا ہے یا نہیں؟''

''باورچی خانے اور غسل خانے میں کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟''

''فرش سنگ مرمر کا ہو یا سنگ کھرکھرا؟''

''بیت الخلا کتنا بڑا ہو؟''

تقریباً ایک ماہ تک یہ بحث بادِ نسیم کی طرح خراماں خراماں چلتی رہی۔ اس دوران اینٹوں کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ ریت نایاب، سیمنٹ کی قیمت میں دوگنا اضافہ، ملبہ سونے کے بھاؤ بکنے لگا۔ بیگم کا خیال تھا کہ کمرا استراحت، باورچی خانہ اور بیٹھک بنوالی جائے تو گزر ہو سکتی ہے، لیکن میں اس کے علاوہ دو اور کمرے بنوانا چاہتا تھا کیونکہ بچے وغیرہ ہو جانے کا بھی امکان قیس کے قریب تھا۔

ایک دن کھانے کی میز پر یہی بحث چل رہی تھی کہ ہمارے دوست ڈاکٹر نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہا:

''مکان ہی بنوانا ہے، تو عرش سے ادھر بنواؤ۔ یہاں تو زمین ملنی ہی مشکل ہے۔''

’’ہائیں!‘‘ میں حیران ہو کر اُچھل پڑا۔ میرے ساتھ ساتھ چمچے بھی اُچھلے۔ ’’بیگم، تم نے سنا؟ ہم جانتے ہیں یہ وبال اپنی جانِ ناتواں کے شایانِ شان نہیں۔ ہمیں مکان کی تعمیر کی فکر میں سر نہیں کھپانا چاہیے۔ اصل بات پر تو ہم نے غور ہی نہیں کیا۔ ارے بھئی زمین کے بغیر تو ریت کا مکان بھی بن نہیں سکتا۔‘‘

’’لاحول ولا‘‘...... بیگم سوچ میں ڈوب گئیں۔

کچھ دن زمین پر بحث ہوتی رہی۔ میں نے سمجھایا، زر، زن اور زمین تینوں فساد کی جڑ ہیں۔ زر میں نے تمہیں لا دیا، زن سے میرا مسلسل واسطہ ہے، اب اگر ایسے میں زمین بھی لے لوگی، تو ایسا نہ ہو تمہیں میری خونابہ فشانی دیکھنا اور میرے دل کے آبلوں پر حنا باندھنا پڑے۔ غالباً میری بات ان کی سمجھ میں نہ آئی اور زمین کی فروخت کے اشتہار دیکھنے لگیں۔

پیشگی رقم کی وجہ سے میری تنخواہ کی معقول رقم ہر ماہ کٹنے لگی۔ اس کا براہِ راست نقصان یہ ہوا کہ اخبارات بند کرنے پڑے اور ہمسائے کے اخبار پر تکیہ کیا۔ پہلے ان سے ہمارے تعلقات کشیدہ، پھر مردم گزیدہ اور آخر کار مثلِ شاخِ بریدہ ہو گئے۔

ہفتے میں ایک دن گوشت پکنے کی پابندی ہو گئی۔

ملازمہ کو چھٹی دے دی گئی۔

بجلی کا میٹر خاص ترکیب سے بند کرانا پڑا۔ میٹر ریڈر آتا، تو اسے چالو کر دیتے۔ کپڑے دھوبی کی دسترس سے محفوظ ہو گئے۔ سگریٹ پھونکنا ممنوع قرار پایا۔

اسکوٹر کباڑ خانے میں رکھ کر اس میں سے سائیکل نکالنی پڑی۔ فلم ایک مہینے میں دو کے بجائے دو مہینے میں ایک بار دیکھنے پر اتفاق ہوا۔ میں اپنے دوست گھر پر بلانے کا مجاز تھا نہ وہ اپنی سہیلیاں۔ بیمار ہونے کی صورت میں ایلوپیتھی ڈاکٹر کے بجائے ہومیوپیتھک ڈاکٹر کی خدمات حاصل کی جانے لگیں۔

یہ اور اس طرح کی بہت سی بندشیں باہمی سمجھوتے کے تحت نافذ ہوئیں۔ حد یہ کہ دفتر کی واحد تفریح یعنی اپنی ذاتی سیکرٹری سے دامنِ عشق کھینچ کر تنہائی میں غالب کا یہ شعر گنگنانا پڑا۔

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق
واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

تو جناب زمین کے مسئلے میں ہم ایسے اُلجھے جیسے کوئی اناڑی عاشق، زلفِ معشوق میں اُلجھتا ہے۔ شہر میں زمین لیتے، تو پیشگی کی ساری رقم اسی پر اُٹھ جاتی۔ آخر ہمیں اپنا خاندانی قبرستان تو تعمیر نہ کرنا تھا، لہٰذا طے پایا بیرونِ شہر زمین لے لی جائے، لیکن اس میں خدشہ یہ تھا کہ اگر دریا اس خاک پر اپنی جبیں گھسنے لگا، تو مکان ضرور بہ جائے گا، یا جنگ کی صورت میں معاملہ خراب ہو سکتا ہے۔

عجب مخمصے کا عالم تھا نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔ بہرحال دل کڑا کر کے بیرونِ شہر اور اندرونِ شہر کے بین بین ایک پلاٹ خرید ہی لیا۔ اب سوال یہ تھا ٹھیکے پر مکان بنوانا چاہیے یا دہاڑی پر؟ ٹھیکیدار نے جتنی رقم طلب کی، اس کا عشرِ عشیر بھی ہمارے پاس نہ تھا۔ دہاڑی کی صورت میں کم از کم دو ماہ کے اندر مکان تیار ہوتا اور اتنی رقم نہ تھی کہ ہم مزدوروں کی مزدوری ان کا پسینہ خشک ہونے کے بعد بھی ادا کر سکتے۔ کسی دوست یا رشتے دار سے قرض ملنے کی توقع گمانِ باطل تھی کہ ایک عرصے سے ان کی دعوتیں بند کر دی گئی تھیں۔

اب بیگم بھی سٹپٹائیں اور مجھے موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے انھیں آڑے ہاتھوں لیا اور ان کی اس غیر معقول خواہش پر کھری کھری سنائیں۔ بعد میں بیگم سے مشورہ کر کے اچھے بھاؤ زمین فروخت کر دی اور پیشگی کی رقم دفتر والوں کو واپس مل گئی۔ اس خرید و فروخت سے اتنا منافع ہوا کہ ہم نے ایک عدد ٹیلی ویژن سیٹ خرید کر محلے داروں، دوستوں اور رشتہ داروں پر اپنی امارت کا رعب جما دیا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ

ع...... وہ جو رہتے تھے اک حسرتِ تعمیر، سو ہے ●●

رُوداد

لیفٹیننٹ کمانڈر (ر) پاک نیوی، علی محمد بھٹی

ہجرت ہی مقدر

رات کے پہلے پہر کے خواب کی طرح مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میں والد صاحب کی ٹانگوں کے درمیان ڈرا اور سہا بیٹھا تھا۔ باہر گھپ اندھیری رات تھی۔ پٹڑ لو اور مار دو کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ ہم (میں اور والد صاحب) اس وقت بیری کے ایک بہت بڑے کٹے ہوئے درخت کے تنے پر پناہ لیے ہوئے تھے جس کی نئی شاخوں نے ٹوٹ کر اس تنے کی جڑ کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا اور یوں وہ کٹا ہوا تنا ایک آدمی کے کھڑا ہونے کے لیے جگہ بن گئی تھی۔ یہ اس رات کا واقعہ ہے جب ہمارے گاؤں پر ہندوؤں اور سکھوں نے حملہ کیا اور گاؤں کے مسلمان اپنے ہنستے بستے پُرسکون گھر چھوڑ اپنی جانیں بچانے گنے اور کپاس کی فصلوں میں جا چھپے۔ والد صاحب نے مجھے اُٹھایا۔ ایک کمبل لیا اور بھاگ کر قریبی گنے کے کھیت کنارے اس بیری کے درخت کے تنے پر مجھے اپنی ٹانگوں کے درمیان بٹھا کر خود کھڑے ہو گئے

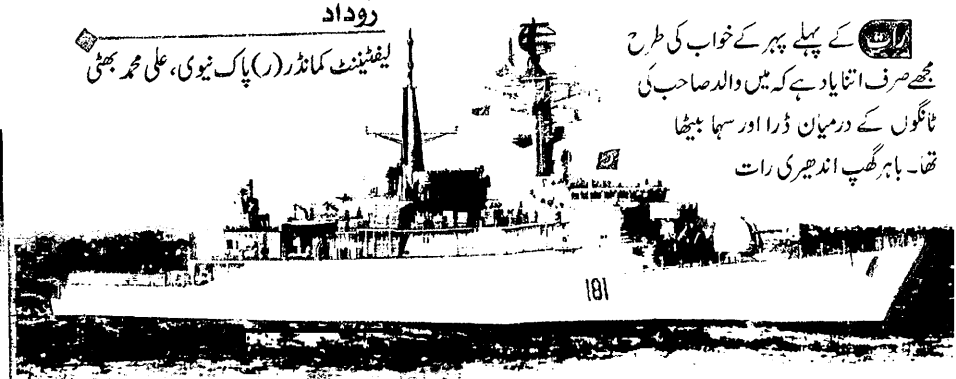

زندگی کی ناانصافیوں اور دشواریوں کے باوجود اپنی راہ پر ڈٹے رہنے والے راہی کی سبق آموز رُوداد

مصنف کا تعارف

لیفٹیننٹ کمانڈر (ر) پاک نیوی، علی محمد بھٹی غیر منقسم ہندوستان کی ریاست پٹیالہ کے ضلع میروز پور کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان دِنوں تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ شہروں کی نسبت گاؤں کافی پُرامن تھے مگر اُن کے والدین اور بڑے بھائی تمام صورتِ حال سے بہت حد تک باخبر تھے۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو ہجرت کے طویل بوجھل دکھوں کے ساتھ اس خاندان کو ضلع خوشاب کے ایک گاؤں میں ٹھکانہ ملا۔ پرائمری کی تعلیم انھوں نے گاؤں کے ایک چھوٹے سے دو کمروں پر مشتمل اسکول میں ٹاٹ پر بیٹھ کر حاصل کی۔ میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب سے کیا۔ ۱۹۶۲ء میں پاکستان نیوی میں بطور ملّاح بھرتی ہوئے اور تقریباً ساڑھے بتیس سال بھرپور بحری زندگی سے نبرد آزما ہونے کے بعد دسمبر ۱۹۹۴ء میں ریٹائیرمنٹ ملی۔ ان کی زندگی کا یہ پُرپیچ سفر آشکارا کرتا ہے کہ منزل پانے کی جستجو اور لگن ہو تو انسان پُرخار راستوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور صراطِ مستقیم اسے ایک نہ ایک دن کامیابی کا پتا دیتی ہے۔

کیونکہ دوسرے آدمی کے بیٹھنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ گاؤں کے بیشتر مسلمان ہمارے رشتہ دار تھے مگر وہ بچ نہ سکے۔ بلوائیوں نے انھیں ڈھونڈ کر فصلوں سے نکالا اور قتل کر دیا۔ ان کی چیخ و پکار ہم سن رہے تھے۔

اللہ کو ہماری زندگی منظور تھی اور ہم محفوظ رہے۔ اس قتل و غارت گری کے بعد بلوائی وہاں سے کسی اور شکار کی تلاش میں چلے گئے۔ ہم وہاں سے کیسے نکلے؟ کیسے گھر اجڑے؟ والدہ صاحبہ اس کی تفصیل گاہے گاہے سنایا کرتی تھیں۔ یہ ایک بہت ہی دردناک کہانی ہے۔

میں اُس وقت ساڑھے تین سال کا تھا۔ میرے شعور میں دوسرا محفوظ منظر یہ ہے کہ ٹین کی چادروں کو کھڑا کر کے سایہ کیا گیا تھا۔ جہاں میرے والد صاحب زمین پر لیٹے زندگی کی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ انھیں سب سے زیادہ صدمہ میرے بڑے بھائی کی شہادت سے پہنچا۔ میرے وہ بھائی والدین کی آنکھ کا تارہ اور والد صاحب کے انتہائی فرمانبردار اور لائق فرزند تھے۔ اور ان سے انھیں بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اس بیٹے کی شہادت سے ان کی کمر ہی ٹوٹ گئی اور وہ یہ صدمہ برداشت نہ کرتے ہوئے قصور کے مہاجر کیمپ میں جان کی بازی ہار گئے۔

والد کی وفات کے کچھ دن بعد مجھ سے چھوٹا بھائی بھوک کی وجہ سے فوت ہو گیا۔ اس ہجرت کی کہانی والدہ صاحبہ کبھی کبھی رو کر سنایا کرتیں اور اچھے وقتوں کو یاد کر کے آنسو بہایا کرتیں۔ جن لوگوں نے بھی ہجرت کی ان میں سوائے چند کے سبھی لوگوں کے دکھ اور درد ایک جیسے ہی تھے۔ اُن کا چند صفحات پر احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

ایک واقعہ والدہ صاحبہ نے سنایا کہ قصور کے مہاجر کیمپ میں ایک نیم پاگل عورت پھرتی رہتی۔ کسی نے کچھ کھلا دیا تو کھا لیا ورنہ جہاں رات آئی بھوکی پیاسی فرش و زمین پر لیٹ جایا کرتی۔ ایک دن والدہ صاحبہ نے کھانے کے لیے جو کچھ میسر تھا اسے بھی کھلایا اور پوچھ لیا کہ بہن تمھیں کیا دکھ ہے۔ ہمیں بھی بتاؤ تا کہ تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہو۔ تو اس بی بی نے روتے ہوئے بتایا کہ میں سب کچھ لٹا کر اپنے چار بیٹوں کے ساتھ چھپ چھپ کر قصور کیمپ کی طرف آ رہی تھی کہ ہندو اور سکھوں کے ایک جتھے نے ہمیں گھیر لیا۔ مار پیٹ کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ ہم تیرا پاکستان تو یہاں ہی بنا دیتے ہیں اور انھوں نے میرے چاروں بیٹوں کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا اور پھر آس پاس سے لکڑیاں اور جھاڑ جھنکار اکٹھا کر میرے بیٹوں کو آگ لگا دی۔ میرے بیٹے جب جلتے ہوئے

مجھے پکارتے تھے تو میں منہ دوسری طرف پھیر لیتی مگر وہ ظالم مجھے مارتے اور مجھے ان جلتے ہوئے معصوموں کو جلتے ہوئے دیکھنے پر مجبور کرتے اور کہتے دیکھ تیرا پاکستان بن رہا ہے۔ جب میرے بچے جل گئے تو انھوں نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا جا اب تیرا پاکستان بن گیا ہے۔

قصہ مختصر، مرتے کھپتے، اپنے بچ جانے والے کنبے کو تلاش کرتے ہم زندگی کی گاڑی رواں رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ ایک دن میرے بڑے بھائی صاحب جو انڈین آرمی میں حاضر سروس تھے اور پاکستان کے لیے عندیہ (Option) دے چکے تھے، ہمیں ڈھونڈتے ہوئے آگئے۔ وہ اس وقت مہاجرین کی پُرامن منتقلی کی ڈیوٹی پر تھے اور ساتھ ہی اپنے اہلِ خانہ کو بھی تلاش کرتے رہتے تھے۔ بھائی صاحب ایک بہت ہی نیک خصلت انسان تھے۔ پاکستان بننے کے آٹھ دس سال بعد ریٹائرڈ ہوئے۔ ان کو اس وقت کی حکومت نے ضلع سرگودھا میں دس ایکڑ زمین الاٹ کر دی تھی۔ وہ ہم سب کو لے کر وہاں آ گئے۔ بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانا بہت جان جوکھوں کا کام تھا۔ مجھ سے بڑے دو بھائی کام میں جُت گئے۔ زمینداری تو ہم ہر طرح سے جانتے تھے مگر مکمل آلات نہ تھے اور حالت یہ تھی کہ کبھی چند نوالے۔ تو کبھی فاقے سے ہی سارے گھر کو سونا پڑتا۔ بہرحال زمین دھرتی ماں ہے۔ اللہ نے اس میں اناج پیدا کرنا شروع کر دیا تو حالات بہتر ہو گئے۔ میں بھی دن بدن باشعور ہونے لگا۔

فوجی بھائیوں نے آباد ہونے والے گاؤں میں دو کمروں اور برآمدے پر مشتمل ایک پرائمری اسکول بنا دیا۔ والدہ نے مجھے وہاں داخل کروا دیا۔ اسکول کی وردی اور دوسرے جھمیلوں کا تو سوال ہی نہ تھا۔ ایک تختی، قاعدہ اور ایک سلیٹ ہی متاعِ طالب علم ہوتی تھی۔ کلمہ طیبہ، نماز، قرآن شریف کی آخری دس سورتوں کو زبانی یاد کرنے سے دن کا آغاز ہوتا اور اس کے بعد کتابی تدریس۔ دو سے لے کر دس تک پہاڑے بھی یاد کرائے جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھی یادداشت سے نوازا تھا۔ میں نے پرائمری اسکول کی ہر جماعت پورے اسکول میں اوّل پوزیشن لیتے ہوئے پاس کی۔ چھوٹے موٹے انعامات جیسے فاؤنٹین پین یا جیومیٹری باکس وغیرہ مل جاتے تو انتہائی اعزاز اور قیمتی تصور کیے جاتے۔ چھٹی جماعت پاس کی تو پتا چلا کہ دوسرے گاؤں میں ایک مڈل اسکول منظور ہو گیا ہے اور داخلے جاری ہیں۔ میں نے وہاں داخلہ لے لیا۔ یہ ایک انگلو وائیکلر مڈل اسکول تھا۔ میں نے وہاں سے ساتویں اور آٹھویں جماعت اپنے اسکول میں اوّل رہتے ہوئے پاس کیں۔ میٹرک کرنے کے لیے گورنمنٹ ہائی اسکول خوشاب تھا اور سنسان سڑکیں۔ ان دنوں تعلیم کا معیار کیا تھا؟ اساتذہ کیسے تھے۔ وہ اپنے پیشے کو مقدس سمجھتے ہوئے کیسے ہر طالب علم پر توجہ دیتے تھے اور ان کی صلاحیتوں کو نکھارتے تھے۔ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ ان دنوں ٹیوشن پڑھنے اور پڑھانے کی وبا تھی ہی نہیں۔ اسکول کے تدریسی وقت میں ہی اساتذہ کرام اتنی توجہ اور محنت سے پڑھاتے کہ اسباق ازبر ہو جاتے باقی کسر گھر پر کرنے کے لیے دیئے ہوئے کام سے پوری ہو جاتی۔

ان دنوں نویں اور دسویں جماعت کی اسکول فیس تین یا ساڑھے تین روپے ہوتی جو ایک عرضی دے کر آدھی معاف کرالی گئی تھی۔ اس کے باوجود بھی اس کی بروقت ادائیگی ایک مسئلہ ہوتی۔ میرے ایک بڑے بھائی دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر مارے گئے تھے۔ ان کی سولہ روپے کے لگ بھگ پنشن والدہ کے نام آیا کرتی۔ کچھ محنت مزدوری کر کے والدہ صاحبہ میری پڑھائی اور گھر کے اخراجات چلاتیں۔ ان حالات میں روزانہ جیب خرچ اور کسی سواری پر اسکول جانے کی عیاشی تو ناقابل تصور تھی ہی، بعض اوقات ضروری کاپیاں اور کتابیں لینے کے لیے بھی کئی دن سوچ بچار کرنا پڑتی۔

ان سب حالات کے باوجود میرا شمار کلاس کے ٹاپ کے

تین چار طالب علموں میں ہوتا تھا۔ ان دنوں دیہاتی ماحول میں میٹرک پاس کرنے کا مطلب تقریباً تعلیم مکمل ہونا تھا مگر میں اور پڑھنا چاہتا تھا۔ ارادہ یہ تھا کہ کم از کم ایف ایس سی کرنے کے بعد پاکستان آرمی میں کمیشن کے لیے جاؤں۔ میں نے گورنمنٹ کالج جوہر آباد میں داخلہ لینے کے لیے درخواست دی۔ پرنسپل نے میرے تعلیمی ریکارڈ اور حالات کو دیکھتے ہوئے فرمایا کہ میری دو سال کی فیس معاف کر دی جائے گی مگر مجھے داخلہ فیس اور دوسرے ناقابل معافی فنڈ جو کہ کل ایک سوتیس روپے بنتے تھے ادا کرنے ہوں گے۔ میں کوشش کے باوجود ایک سوتیس روپے کی رقم ادا نہ کر سکا۔ جس کا صدمہ ہے۔ آج تک بھلایا نہیں جا سکا۔ کالج میں داخلہ نہ لے سکنے پر والدہ یقیناً پریشان تھیں اور میں کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں آنسو بھی دیکھتا۔ زراعت ہی پیشہ تھا اور میں شروع عمر سے ہی اس میں طاق ہو گیا تھا لہٰذا اسی میں محنت مزدوری کرنے لگا تاکہ اخراجات میں والدہ کا کچھ ہاتھ بٹایا جا سکے۔ ان دنوں ایک مزدور کو دو سے تین روپے دہاڑی مل جاتی تھی جو کچھ نہ ہونے سے تو بہت بہتر تھی۔ اس طرح میٹرک پاس کیے تقریباً دو سال گزر گئے۔

ایک دن ایک ہمدرد نے بتایا کہ سرگودھا میں فوج کی بھرتی ہو رہی ہے۔ میں دوسرے دن سرگودھا ریکروٹنگ آفس پہنچ گیا۔ وہاں پتا چلا کہ بھرتی آرمی کی نہیں پاکستان نیوی کے لیے ہو رہی ہے۔ میں بھی لائن میں لگ گیا۔ تعلیمی ٹیسٹ وغیرہ سب بہت ٹھیک ہوئے۔ جسمانی لحاظ سے پوری طرح فٹ تھا۔ نتیجتاً مجھے ایک سیلر (Sailor) بھرتی کر لیا گیا۔ گم راہ اور بے منزل مسافر کو ایک راستہ اور منزل کا پتا مل گیا تھا۔ زندگی کا ایک لائحہ عمل طے ہونے کے بعد بھی میری اُمیدوں اور آرزوؤں کا محور و مرکز صرف والدہ تھیں۔ دل میں تہیہ کر لیا کہ میں انھیں کچھ بن کر دکھاؤں گا۔ ہندوستان میں والد صاحب کی معیت میں گزرے ان کے اچھے دن واپس لانے کی کوشش کروں گا۔

نیوی میرے لیے ایک بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ ویسے بھی انسان خشکی کا رہائشی ہے۔ سمندر کی زندگی اختیار کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمت دی اور ڈیڑھ سال کی زبردست ٹریننگ کے بعد ہمارا بیچ (Batch) پاس آؤٹ ہوا۔ میرا شمار چھے سوسیلرز میں سے تین بہترین لڑکوں میں ہوتا تھا۔ مجھے کانسی کا تمغہ انعام میں ملا۔ نیوی کی اصل زندگی کا پتا جہازوں کی ملازمت کے دوران ہی چلتا ہے۔ ویسے بھی فوجی زندگی میں ہر دن نیا ہی ہوتا ہے۔ نئے حالات، مشن اور نئے تجربات ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح آفیسرز اور جوان اپنے کام میں صیقل ہوتے رہتے ہیں۔ اس زندگی کے عادی ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے کام میں مہارت بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے جہازوں اور ٹریننگ سینٹروں میں تبادلے، مختلف امتحانات اور کورس وغیرہ بھی اس دوران چلتے رہتے ہیں۔

میری ملازمت تقریباً ساڑھے تین سال کے لگ بھگ تھی۔ نیوی کی ابھی پوری طرح شد بد بھی نہ جان پائے تھے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء میں انڈیا کے ساتھ جنگ کا بگل بج گیا۔ یہ پانچ ستمبر کی شام تھی۔ میں آٹھ بجے ڈیوٹی ختم کر کے بیرک میں پہنچا ہی تھا کہ اعلان ہوا، ''سب لوگ فوری طور پر گارڈ روم کے سامنے جمع ہو جائیں۔'' پتا چلا پاکستان نیوی کے لڑاکا بحری جہازوں پر عملے کی کمی کو فوراً پورا کرنے کے احکام مل چکے ہیں۔ ہمیں اپنی اپنی قابلیت اور ٹریڈ کے لحاظ سے علیحدہ کر کے فہرستیں تیار ہوئیں اور حکم ملا کہ واپس بیرک میں جائیں اور پندرہ منٹ کے اندر اپنا روزانہ کے استعمال کا ضروری سامان، سمندر میں پہننے والی ایک دو وردیاں اور ہلکا بستر وغیرہ لے کر واپس رپورٹ کریں۔ ڈیوٹی پر موجود میرے ڈویژن انچارج ہی تھے۔ مجھے کہنے لگے پتا ہے کہ کہاں جا رہے ہو۔ میں نے کہا کہ سرجنگ کا ماحول بنا ہوا ہے۔ لگتا ہے جہازوں پر جانا ہو گا۔ کہنے لگے اگر تم چاہو تو تمھیں روک لوں۔ میں نے کہا کہ نیوی میں اسی دن کے لیے تو آئے ہیں۔ آج وطن کو ضرورت

پڑی تو میں بیرک میں بیٹھ جاؤں۔ آپ مجھے جانے دیں۔ انھوں نے مجھے شاباش دی اور کہا جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ تمہارا جو بھی سامان یہاں رہ گیا ہے۔ اس کی حفاظت کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ تمہیں خیریت سے واپس لائے۔

ہم رات تقریباً دس بجے اپنے الاٹ کردہ جہازوں پر پہنچ گئے جہازوں پر سرگرمیاں زوروں پر تھیں۔ پورا اسلحہ، ایندھن، پانی، راشن لیا جا رہا تھا تاکہ لڑائی کی صورت میں زیادہ دن سمندر میں جہاز رہ سکیں اور بھرپور لڑائی لڑ سکیں۔

چھے ستمبر کی صبح آٹھ بجے جہازوں کو بندرگاہ چھوڑ دینے اور سمندر میں چلے جانے کے احکامات پہلے ہی مل چکے تھے مگر ایک فوری سگنل کے تحت ہم صبح چھے بجے ہی بندرگاہ چھوڑ چکے تھے۔ اس وقت کے صدر مملکت ایوب خان صاحب کی وہ ولولہ انگیز تقریر جس نے پوری قوم اور مسلح افواج کے انگ انگ میں شرارے بھر دیے تھے، ہم نے کھلے سمندر میں جنگ کے لیے تیاری کرتے ہوئے سُنی۔ بس پھر کیا تھا۔ پاکستان نیوی کا ہر افسر اور سیلر بزدل ہندوستان کی نیوی سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے بے تاب تھا اور اس کا موقع اللہ تعالیٰ نے دو دن بعد ہی پیدا کر دیا۔ پاکستان نیوی کے لڑاکا جہازوں کو ہندوستان کے ساحلی شہر دوارکا کے بحری اڈّے کو تباہ کرنے کے احکامات مل گئے۔ کمانڈنگ آفیسر نے جہاز کے عملے کو مشن کے متعلق احکامات دیے اور کہا کہ یہ ہندوستان کے ساتھ ہماری پہلی کھلی بحری جنگ ہے۔ اس میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہر آفیسر اور جوان اپنے فرائض پوری لگن اور قوت سے صحیح صحیح ادا کرے۔ انشاء اللہ ہم سرخرو ہوں گے۔ دوارکا کراچی سے جنوب مشرق کی طرف ہندوستان کا ایک بڑا بحری اڈّا تھا۔ جس کا پاور فل ریڈار اسٹیشن نہ صرف ہمارے ہوائی جہازوں کے حملہ کی پیشگی اطلاع دیتا بلکہ اپنے ہوائی جہازوں کو حملہ کے دوران ان کی راہنمائی بھی کرتا تھا۔ جس سے ان کے لیے کراچی اور ہمارے دوسرے جنوبی شہروں پر حملہ آسان ہو جاتا۔ دن بھر ہم پوری تیاری کے ساتھ ہندوستان کے سمندر میں سفر کرتے ہوئے اپنے ہدف کی طرف بڑھتے رہے اور رات کو تقریباً بارہ بجے حملہ کرنے کی پوزیشن میں آ گئے۔ پھر یکبارگی جہازوں کی توپیں آگ اگلنے لگیں۔ ہر ایک گن کے لیے بارہ سے پندرہ گولے فائر کرنے کا حکم تھا مگر ہم نے جوش میں اٹھارہ سے بیس تک گولے داغ دیے۔ اللہ کے فضل سے مشن کامیاب ہوا اور نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا پر پاک نیوی کی دھاک بیٹھ گئی۔ دراصل دشمن کے علاقے میں دو سو میل تک اندر جا کر حملہ کرنا اور پھر کامیاب اور بغیر نقصان کے واپس آ جانا ایسا مشن تھا کہ بحری جنگ کے ماہر بھی اس جرأت پر حیران تھے۔

۱۹۶۵ء کی جنگ دراصل جذبوں کی جنگ تھی جس میں ہماری مسلح افواج اور پاکستانی قوم سرخرو ٹھہری۔ جنگ میں غازی قرار پانے کے بعد جذبۂ شوق اور بڑھ گیا۔ میں مختلف قسم کے کورس اور امتحانات جو ترقی پانے کے لیے ضروری تھے پاس کرتا رہا۔ شاید ہی ایسا ہوا ہو کہ میں نے نمایاں پوزیشن نہ لی ہو۔

۱۹۶۵ء کی جنگ کے تقریباً چار سال بعد تک ملک میں حالات بہتر رہے، پھر ملک میں امن اور ترقی میں وہ تسلسل نہ رہا جو اس سے پہلے تھا۔ عہدوں کی بندر بانٹ، کوتاہ اندیش سیاسی قیادت، مفاد پرستی اور لالچ نے قوم کا شیرازہ بکھیر دیا۔ ہمارا ازلی دشمن جس کی نفسیات ہم ابھی بھی سمجھنے میں غلطی پر ہیں، کو پلٹ کر وار کرنے کا موقع مل گیا اور اس نے اس سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ ۱۹۷۱ء میں اس نے ہمارا مشرقی بازو ہم سے کاٹ دیا۔ اگرچہ اس میں غیر ملکی عناصر کی سازشوں نے بھی اپنا اپنا حصہ ادا کیا مگر زیادہ تر قصور ہمارا ہی ہے کہ ہم نے معاملات کی نوعیت کو نہ سمجھتے ہوئے اپنے دیدہ اور نادیدہ دشمنوں کو یہ موقع فراہم کیا۔ ہم اپنے ابتدائے وجود سے اپنے دشمنوں اور دوستوں کو سمجھ نہ سکے اور ایک قومی سوچ اپنانے میں ناکام رہے۔ ہمارے پالیسی ساز اداروں میں اکثریت اپنی

ذمہ داریوں سے لاعلم رہی ہے اور ایسے ذمہ دار افراد کے لیے جو ایک ہم گیر علم اور باخبری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا ان میں فقدان رہا ہے۔

۱۹۷۱ء کی جنگ ایک ایسا گہرا زخم ہے جو شاید ہی مندمل ہو سکے۔ میں اس جنگ میں بھی فرنٹ لائن پر تھا اور بہت سی غلطیوں اور بلنڈرز کا شاہد بھی مگر فوجی ڈسپلن ہی تو ہے کہ آپ کو بے چوں و چرا ہر حکم بجالانا ہے۔ چاہے وہ آپ کو اچھا لگے یا برا۔ جنگ کے دنوں کا تجربہ کیسا رہا؟ اس میں کیا خوبیاں تھی اور خامیاں کتنی تھیں؟ اس پر بہت کچھ لکھا جا چکا اور مزید بھی لکھا جا سکتا ہے۔

یہ جنگ ۱۹۶۵ء جنگ سے بہت مختلف تھی۔ دشمن سامنے بھی تھا اور پیٹھ پیچھے بھی۔ عدو کی صفوں میں اس کی نمائندگی تھی اور دوسری طرف وہ کھانے کی میز پر آپ کے ساتھ موجود تھا اور پھر اپنے ناقابل تسخیر ہونے کا زعم بھی ہمارے خلاف گیا۔ نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ میری سروس نو دس سال ہو چکی تھی۔ کئی دفعہ مشرقی پاکستان جا چکا تھا۔ کچھ بنگالی بڑے گہرے دوست بھی تھے۔ جنہیں ملنے کو ابھی بھی دل چاہتا ہے۔ مگر بقول فیض احمد فیض:۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی کتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد

۱۹۷۱ء کی جنگ کے نتیجے میں جو دل و دماغ پر بوجھ تھا۔ اسے اپنی بھرپور محنت اور ایک اچھا پروفیشنل سیلر بننے کے ذریعے سے زائل کرنے لگا۔ اس دوران میں ایک ذمہ دار عہدہ پر ترقی بھی پا چکا تھا۔ پھر میں نے ۷۸-۱۹۷۷ء میں پاکستان نیوی میں کمیشن حاصل کرنے کے لیے امتحان بھی پاس کر لیا۔ کمیشن آفیسر کے طور پر منتخب ہونے کے بعد کورسوں اور امتحانات کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور والدہ کی دعاؤں کے طفیل بخیر و خوبی مکمل ہوا۔ اس کے بعد مجھے اپنے ٹریڈ میں ایک پروفیشنل آفیسر کے طور پر کمیشن مل گیا اور میں فروری ۱۹۷۹ء میں سب لیفٹیننٹ بنا دیا گیا۔

آفیسر بننے پر والدہ نے خوش ہو کر ڈھیروں دعائیں دیں۔ دراصل ان کی دعائیں ہی میرے لیے اس منزل تک پہنچنے کا ذریعہ تھیں۔ اس منزل تک پہنچنے میں کیا کیا دشواریاں اور رکاوٹیں پیش آئیں اور ان پر کیسے عبور حاصل کیا۔ یہ خود ستائشی کے زمرے میں نہ آجائے اس لیے میں اس سے احتراز ہی کروں گا۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ:۔

ہم نے چنے ہیں ہاتھ سے زمانے کے راہ سنگ
ہم وہ نہیں کہ جنہیں زمانہ بنا گیا

کمیشن آفیسر ہونے کے بعد ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں۔ شادی بھی ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد سے نوازا۔ ان کی پرورش، تعلیم و تربیت کی ذمہ داری بھی شامل ہو گئی اور زندگی کو ایک نیا رخ مل گیا۔ تقریباً تین سال ملازمت کے بعد امتحانات کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے چونکہ ایک پروفیشنل آفیسر کے طور پر کمیشن حاصل کیا تھا اور اپنے پروفیشنل میں صرف اپنے ٹریڈ تک ہی محدود تھا مگر اس میں آگے جنرل لائن آفیسر بننے کے مواقع موجود تھے۔ میں نے اس کے لیے کوشش شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے محنت کا صلہ کامیابی کی صورت میں دیا۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں سارے امتحانات اور ٹیسٹ پاس کرنے کے بعد میں ایک جنرل لائن آفیسر ہو گیا۔ ترقی پانے کے بعد لیفٹیننٹ کا رینک بھی مل گیا۔ ایک پروفیشنل آفیسر ہونے کے ناطے سے میں ٹریننگ کے اداروں میں ڈیوٹی سرانجام دے سکتا تھا مگر اب میرے لیے میدان کھلا تھا اور میں جہازوں پر سمندر میں بھی فرائض بجا لا سکتا تھا۔

سمندر اللہ تعالیٰ کی بے پناہ قوت و طاقت کے مظاہر میں سے ایک بہت بڑی علامت ہے۔ جب آپ جہاز کے عرشہ پر کھڑے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں اور بے پناہ وسعتوں کو چیر رہے ہوتے ہیں تو ایک عجیب طرح کا فخر محسوس ہوتا ہے اور جب کبھی یہی سمندر بپھر جائے تو سوائے اس خالق و مالک کے کوئی سہارا بھی نظر نہیں آتا۔ سمندر کی زندگی خشکی کی زندگی

سے مختلف ہے اور بعض دفعہ ایسے مشکل حالات اور چیلنج سے واسطہ پڑتا ہے کہ سوائے اس مالکِ ارض وسما کو پکارنے کے کوئی چارہ نہیں ہوتا۔

سمندر میں مختلف مشن اور دیگر ڈیوٹیاں سرانجام دیتے ہوئے بہت سے مشکل مقام بھی آئے۔ جہاں اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور والدہ کی دعاؤں کے طفیل مَیں سُرخرو ٹھہرا۔ اس طرح تقریباً نو سال جہازوں میں سروس بجالاتے گزر گئے۔

میری سروس ختم ہونے میں تقریباً دو ڈھائی سال باقی تھے کہ مجھے ایک تربیتی ادارے میں تعینات کر دیا گیا۔ اب جبکہ ریٹائرمنٹ نزدیک آ رہی تھی وہ سارے اندیشے جو ایک ریٹائرڈ آفیسر کو پیش آسکتے ہیں مجھے بھی لاحق تھے۔ گورنمنٹ ملازم خاص کر فوج کے ملازم کو ریٹائر ہونے کے بعد پیش آنے والے مسائل میں سے تین گمبھیر ہیں۔

پہلے نمبر پر گھر کا مسئلہ ہے۔ دورانِ ملازمت سرکاری گھر ملتا ہے جو ریٹائرمنٹ کے وقت خالی کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ماہانہ تنخواہ تو ختم ہوجاتی ہے۔ گھر کے اخراجات بچوں کے تعلیمی اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے؟ تیسرا یہ کہ اولاد کی شادی سر پر ہوتی ہے۔ ان سب میں سرِ فہرست گھر کا مسئلہ ہے۔ اگر یہ حل ہوجائے باقی سے نمٹنا ممکن ہوجاتا ہے۔

میری ملازمت کا تقریباً ایک سال باقی تھا کہ صدر نے پاکستان نیوی سے ریٹائر ہونے والے آفیسروں کے لیے ایک ہاؤسنگ اسکیم کی منظوری دے دی۔ اس سے پہلے پاکستان آرمی اور ائیر فورس اپنے افسروں کو ریٹائرمنٹ پر ایک معقول معاوضے کے عوض گھر بنا کے دے رہی تھی۔ چنانچہ نیوی نے بھی اپنے افسروں سے درخواستیں طلب کرلیں۔ میں نے بھی درخواست دے دی۔ جب مجاز اتھارٹی کے سامنے درخواستوں کی چھان بین ہوئی تو میری درخواست کو رد کر دیا گیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ گھروں کی الاٹمنٹ کے لیے جو قاعدہ کلیہ وضع کیا گیا ہے اس کے مطابق میری ریٹائرمنٹ کے وقت سروس میں پینتالیس (۴۵) دن کم ہونے کی وجہ سے میرے مطلوبہ نمبروں میں آدھے نمبر کی کمی رہ جاتی ہے۔ جو ایک صریحاً ناانصافی ہی تھی۔ طرفہ تماشہ یہ کہ جس کلیے کے تحت مجھے محروم کیا گیا، وہ میرے پوائنٹ شمار کرنے کے لیے لاگو ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرے کمیشن کیڈر کے مطابق اگر پوائنٹ شمار کیے جائیں تو وہ مطلوبہ معیار سے بھی زیادہ بنتے تھے۔ میں نے نظرِ ثانی کے لیے درخواست دی۔ الاٹمنٹ بورڈ کے چیئرمین اور بعد میں کرپشن کنگ کے طور پر مشہور ہونے والے نے بڑی حقارت سے میری درخواست ٹھکرا دی کہ اس کو گھر نہیں مل سکتا۔ اس ناانصافی پر مبنی نادر شاہی حکم نے میرے بال بچوں کے ساتھ ظلم کیا اور پھر اپنے آپ کو فرعونِ وقت سمجھنے والے کے لیے اللہ کی پکڑ آئی۔ اس کو ریٹائرمنٹ کے بعد ملے ہوئے گھر اور دوسرے مفادات سے محروم ہی نہ ہونا پڑا بلکہ اپنے رینک اور دوسرے مفادات سے بھی ہاتھ دھونا پڑے اور بے وطنی میں موت بھی آئی (فاعتبروا یا اولوالابصار)۔

کسی بھی سرکاری بلکہ فوجی افسر کے لیے ریٹائرمنٹ کے بعد سول زندگی میں ایڈجسٹ ہونا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ ملٹری آفیسر کا طرزِ زندگی دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ بعض دفعہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی توقع کے برعکس سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ کاروبار کرنا چاہیں تو آپ کو جھوٹ، وعدہ خلافی، منافقت جیسے حربوں سے واسطہ پڑتا ہے جو زیادہ تر لوگوں کے لیے کاروباری گُر (Business Tactics) کا درجہ رکھتے ہیں۔ ناک کی سیدھ میں چلنے والے لوگوں کے لیے ایسے حالات کا مقابلہ کرنا ایک اذیت ناک عمل ہے۔ میرے لیے سرکاری رہائش گاہ خالی کر کے کرائے کے گھر میں منتقل ہونا ہجرت کی طرح ہی مشکل عمل تھا۔ مالک مکان کے نخرے، بات بے بات مکان خالی کرانے کی دھمکی، مختلف حیلوں بہانوں سے طے کردہ کرائے کے علاوہ زیادہ سے

زیادہ پیسے بٹورنا ایک عام سی بات ہے۔ بچے اچھے ماحول کے عادی تھے۔ انھیں یہ باتیں قبول نہ تھیں۔ ان کے اسکول کے اوقات بھی مختلف ہو گئے۔ پہلے تقریباً دو سال تک تو سمجھ ہی نہ آئی کہ انھیں اس تبدیلی کا یقین کیسے دلائیں؟ بڑی بیٹی اس وقت نویں جماعت میں تھی۔ باقی بچے اس سے چھوٹے تھے۔ غم روزگار اور دوسرے عوامل سب کی صحت پر کافی اثر انداز ہوئے۔ سب سے زیادہ اثر میری بیگم نے لیا اور وہ بیمار رہنے لگی۔ نیوی کے اسپتال کی سہولت موجود تھی مگر ان کی دیکھ بھال، بچوں کی نگہداشت اور باقی حالات نے مجھے چکرا کے رکھ دیا۔ کوئی نزدیکی رشتہ دار کراچی میں تھا ہی نہیں جو ہاتھ بٹاتا۔ بیگم صاحبہ کو یہی غم سب سے زیادہ تھا کہ بچیاں اور بچے جوان ہو رہے ہیں۔ میں کب تک ان کو لوگوں کے گھروں میں رکھوں گی۔ وہ ان تبدیل شدہ حالات میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہ کر سکیں۔ اگر ریٹائرمنٹ پر گھر مل گیا ہوتا تو بہت سے مسائل تو ویسے ہی حل ہو چکے ہوتے۔ نتیجتاً ریٹائرمنٹ کے تقریباً ڈھائی سال بعد بیگم اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اس طرح ایک اور کڑا امتحان میرے سامنے موجود تھا۔

بچوں کو اس صدمہ سے نکال کر دوبارہ معمولاتِ زندگی پر لانا ایک بڑا مرحلہ تھا۔ صبح ان کے لیے ناشتہ تیار کرنا، اسکول چھوڑنا، ان کے دوپہر کے کھانے کا بندوبست اور پھر اسکول سے انھیں لانا، ان کی دیکھ بھال اور حوصلہ افزائی ایسے کام تھے جو کہ ہمہ وقت مصروفیت چاہتے تھے۔ اتنے وسائل تھے نہیں کہ کوئی نوکر یا ڈرائیور وغیرہ رکھ لیا جاتا۔ بہرحال زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے اور بچوں کی خاطر طرح طرح کے جتن کیے۔ نوکری کی، کاروبار کے لیے دفتر بنایا، دسمبر کی سرد راتوں میں جاتا، فٹ پاتھوں پر رات گزاری مگر بقول ساحر لدھیانوی:۔

زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹی
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں

ان سب حالات کے ساتھ میں اپنی گزشتہ سروس کے کار پردازوں سے انصاف بھی طلب کرتا رہا مگر وہاں وہی ڈھاک کے تین پات۔ اس کے لیے میں نے کس کس کا دروازہ کھٹکھٹایا؟ کیا جواب ملے؟ ان سب کو یہاں بیان کرنا ''اپنے گندے کپڑے چوک میں دھونے'' والی بات ہو جائے گی۔ صرف اتنا عرض ہے کہ بقول میر:۔

میر کیا سادہ ہیں کہ بیمار ہوئے جس کے سبب
اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

کسی بھی بااختیار شخصیت نے اتنی جرأت یا فرصت نہیں دکھائی کہ ایک متکبّر اور رعونت مزاج آفیسر کے سراسر ناانصافی پر مبنی فیصلے کو تبدیل کروا کے انصاف دلا سکے۔ میں ریٹائرمنٹ کے بعد سے اب تک کرائے کے گھر میں رہائش پزیر ہوں اور ہر سال دو سال بعد نئے محلے یا دوسری بستی کے کسی گھر کی طرف ہجرت میرا مقدر ہے۔

اس ناانصافی اور متعصبانہ سلوک کا یہ نتیجہ ہوا کہ میرا گھرانہ تباہ ہو گیا، بچوں کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ اپنا سماجی تشخص برقرار رکھنا ہی کارِ دارد ٹھہرا۔ ان حالات میں بچوں اور بچیوں کے لیے رشتے آتے تو کیسے آتے اور کیوں؟ اس سب کے باوجود اپنے اس پاک وطن کی حفاظت اور اس کے پرچم کو سربلند رکھنے کے لیے آج بھی دل و جان سے حاضر ہوں۔ اس میں میرے اس خوبصورت ملک کا تو کوئی قصور نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے ''بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا'' والا معاملہ ہو گیا اور وہ انگلی کٹائے بغیر ہی شہیدوں میں شامل ہو گئے اور ملک کے وسائل پر قابض ہو گئے۔ اس بارے میں بہت کچھ حقیقتیں بیان کی جا سکتی ہیں مگر ان اشعار پر ہی عرضِ حال ختم کرتا ہوں:۔

اس راہ میں کیوں کوئی مدینہ نہیں آیا
شاید کہ ہمیں ہجرت کا قرینہ نہیں آیا
یہ کہہ کے وہ مجھ کو میری اُجرت نہیں دیتا
کیوں تجھ کو مشقت میں پسینہ نہیں آیا ◆◆

رضیہ کی رضائی

منصور احمد ملک

احمد فیضان بہت بھلے آدمی تھے۔ اتنے کہ سب ماتحت دل سے یہ چاہتے، وہی ان کے سربراہ رہیں۔ اس کے باوجود ان کا تبادلہ ہوگیا۔ یہ تبادلہ اس جگہ ہوا جہاں جانا اٹل اور وہاں سے پلٹ آنے کی روایت نہیں۔

تین روز قبل وہ بھلے چنگے دفتر پہنچے۔ وہیں بیٹھے دل کی تکلیف ہوئی۔ انھیں فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں ہنگامی حالت سی نافذ ہوگئی۔ مریض کے عہدے کا تقاضا بھی یہی تھا۔ دورانِ علاج ان کی کیفیت اُتار چڑھاؤ کا شکار رہی۔ کبھی ڈاکٹروں کی گفتگو سے لواحقین کے چہرے کھل اُٹھتے اور کبھی معالجین کا یہ کہنا: ''دعا کریں!'' انھیں وسوسوں کے حوالے کر دیتا۔ تیسری شام کے بعد انھیں دل کا ایک اور دورہ پڑا۔ اس کے نتیجے میں ان کا جانا ٹھہر گیا۔

رفتہ رفتہ اسپتال کے عملے کی چال ڈھال پکار پکار کر یہ کہنے لگی کہ وہ محض اشک شوئی کا سامان کیے ہوئے ہیں۔ تاکہ کبھی یہ خیال پیدا نہ ہو، کسی مرحلے پر کوتاہی کا مرتکب ہوا۔ انھی جذبوں کے زیرِ اثر مصنوعی تنفس کے آلات اُتارنے میں حد درجہ مروت برتی گئی۔ یہ مرحلہ رات بارہ بجے کے بعد طے ہوسکا۔ یوں ان کی موت کا اندراج اگلی تاریخ میں ہوا۔

احمد فیضان اپنے پیروں پر چل کر گھر سے روانہ ہوئے تھے۔ اب ان کا جسدِ خاکی، میت گاڑی والے ''کاشانۂ فیضان'' میں ڈال گئے۔ عمر 53 برس، پسماندگان میں ایک بیوہ رضیہ بانو، بیٹی ملیحہ، دو بیٹے احمد جواد اور احمد حماد۔ سوگواروں میں سے اکثر آنسو بہا کر اور کچھ آنسو چھپا کر صدمے سے نبرد آزما تھے۔ جبکہ چیخ پکار، آہ و بکا وغیرہ مفقود۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ کہ مریض کی حالت کے باعث سب کی ذہن سازی ہوتی چلی گئی تھی۔

ابدی نیند سوئے شوہر کے سرہانے بیٹھیں رضیہ بانو کسی ضرورت سے اُٹھیں۔ وہاں سے پلٹ کر جیسے ہی ان کی نظر میت پر ٹھہری، وہ ایک

اُن کی زبان پر ایک ہی دعا تھی کہ بیٹی کسی طرح سُسرال میں بس جائے

او۔سی۔ڈی بیماری کے بارے میں آپ نے سُنا ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کچھ عادات یا حرکات بار بار کرتے رہتے ہیں، حالانکہ دوسروں کو ان کے اس رویے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ عام طور سے یہ عادت مسئلہ نہیں بنتی اور کچھ کاموں میں یہ مددگار بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ مگر، کسی کام کو بار بار کرنے کا یا کسی سوچ کو بار بار دماغ میں لانے کا تقاضا زندگی پہ تکلیف دہ حد تک حاوی بھی ہوسکتا ہے۔ آپ کے ذہن میں تکلیف دہ خیالات بار بار آتے ہیں، حالانکہ آپ کوشش کرتے ہیں کہ یہ خیالات آپ کے دماغ میں نہ آئیں۔ آپ کے دل میں بار بار تقاضا ہوتا ہے کہ آپ کسی چیز کو بار بار چھوئیں، چیزوں کو بار بار گنتے رہیں، یا کسی کام کو بار بار کریں مثلاً ہاتھ بہت بار دھوئیں۔ رضیہ کو بھی کم وبیش اسی صورتحال کا سامنا تھا مگر ایسے کسی انسان کے ساتھ زندگی گزارنا کیسا تجربہ ہوتا ہے؟ اس موضوع کو مصنف نے انتہائی دلچسپ اور ہلکے پھلکے انداز میں بیاں کیا ہے۔

زوردار چیخ مارتے ہوئے جھٹکے کے انداز میں میت والی چارپائی پر آرہیں۔ وہ اپنا سر پیٹتے ہوئے بس یہی کہے جارہی تھی: ''ہائے میں لٹ گئی! میں برباد ہوگئی!'' اس کے بعد ان کی حالت یہ ہوئی، پہلے مُٹھیاں بھینچیں اُوپر نیچے کے دانت ایک دوسرے پر سختی سے جمے اور پھر بے ہوش۔ کوئی پانی لینے دوڑا اور کسی نے ہاتھ پیر کی مالش شروع کردی۔ انھیں بمشکل ہوش میں لانے کے بعد زبردستی وہاں سے ہٹالیا گیا۔

اب وہ آغوشِ مادر میں سر ڈالے ہچکیاں لے رہی تھیں۔ رضیہ کی والدہ کو اڑھائی سال پہلے خود بیوہ ہونے کے بعد ایک اور بیوگی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ اس وقت ان کے ذہن میں اسی بیٹی کی وداعی کے لمحات اُمڈ آئے تھے۔ چھبیس برس قبل اسے رخصت کرنے کے بعد اُنھوں نے اُس رات کا بیشتر حصہ مصلے پر گزارا تھا۔ اُس گھڑی ان کی زبان پر ایک ہی دعا تھی کہ اس کا سسرال میں بخوبی گزارا ہوجائے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھیں، پہلوٹی کی یہ لاڈلی ٹوٹ تو سکتی ہے مگر جھکنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ ان کی اس بے قراری کا سبب بیٹی کی ''عادات فاخرہ'' تھیں۔

تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ رضیہ ایسا سرمایۂ حیات رکھتی تھی جو اس کے لیے سرمایۂ افتخار بھی تھا۔ دوسری جانب قدرتاً شناس اسے ولیم، ذہنی عارضے وغیرہ کا نام دیے ہوئے تھے۔

اس ''چمن'' کی بنیادیں کب، کیوں اور کیسے رکھی گئیں، اس سے ہر کوئی لاعلم تھا۔ یہاں تک کہ اس کی بلاشرکت مالکہ و قابضہ رضیہ بانو بھی۔ ''ماہرین'' کے قیاسات کی رُو سے اس کا آغاز بار بار ہاتھ دھونے سے ہوا۔ بعد میں اس نے ممدوحہ کو پوری طرح اپنے سایہ میں لے لیا۔ رضیہ کی یہ ''دنیا'' اسکول کی عمر ہی میں وجود پا چکی تھی۔ چونکہ کسی دھماکے (Big Bang) کے بغیر ظہور پزیر ہوئی لہٰذا یہ تغیر وتبدیل اس وقت نمایاں نہ ہو سکا۔ اس ''عالم رنگ وبو'' کے چیدہ چیدہ محاسن کچھ یوں تھے:

''ہاتھ منہ دھونے سے پہلے واش بیسن اور اس کی ٹونٹیوں کی دُھلائی ہوتی۔ خاتمہ بالخیر کے لیے اوک بھر پانی محفوظ کر لیا جاتا جو نل بند کرنے والے ہاتھ پر اُنڈیلنے کے کام آتا تاکہ نادیدہ نجاستوں کو قرار واقعی انجام تک پہنچایا جاسکے۔ غسل کے لیے پیش بندی میں حمام کا ملازمہ کی نظر سے عمیق جائزہ ہوا کرتا، جیسا کسی سربراہ مملکت کے لیے۔ بالخصوص وہ دیوار جس پر کپڑے لٹکانے کی کھونٹی نصب تھی، یوں نوازی جاتی کہ برہمن کا چولہا چوکا بھی کیا سرفراز ہوتا ہوگا۔ گھریلو استعمال کے آلات بنانے والے ادارے ایسی مشین بنانے سے قاصر رہے جسے شہزادی کے کپڑے دھونے کی سعادت حاصل ہو سکتی۔ نتیجتاً ان کے ملبوسات مخصوص برتن میں انھی کے ہاتھوں

شرف بہ دھلائی ہوتے۔ نشست گاہ میں ان کے لیے کرسی مختص تھی۔ بیٹھنے سے قبل اس پر ایک گدی بھی جمائی جاتی جسے اُٹھتے ہوئے فوراً حفاظتی تحویل میں لے لیا جاتا۔ جس طرح ایک زمانے میں پان دان اور اس کے نازنخرے اُٹھائے جاتے یا آج کل جیسے موبائل فون اور اے۔ ٹی۔ ایم کارڈ وغیرہ۔ یہاں مزید تفصیلات سے سے قصداً اجتناب برتا جاتا ہے کیونکہ یہ خدشہ سر اُٹھائے کھڑا ہے، رضیہ کے ''بھائی بندوں'' کو ثقہ تحریری مواد فراہم ہو جائے گا اور اس سے شہ پا کر کُھل کھیلنے کا جواز بھی!

موصوفہ نے اس شاہراہ پر کتنے سنگ میل عبور اور کتنی ہی منزلیں طے کر رکھی تھیں۔ قابل ذکر امر یہ کہ اس سلسلے میں ان کے اپنے مکتبِ فکر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ایسا تو قطعاً نہ تھا کہ کسی کی دیکھا دیکھی کوئی عادت اپنا لی گئی ہو یعنی تمام تر عاداتِ فاخرہ خانہ ساز اور خود ساختہ تھیں۔ لہٰذا نقالی یا چربے کا گمان بھی ان کے تخلیقی جذبوں اور کاوشوں کی ہتک کا باعث ہوگا۔ یاد رہے یہاں خود ساختگی سے تکسیر مقصود ہے تحقیر نہیں۔

قصہ مختصر منکوحہ اور دیگر تحائف کے علاوہ یہ ''جہیز'' بھی سسرال یعنی احمد فیضان کے گھر منتقل ہو گیا۔ یہاں مشترکہ خاندانی نظام کی ''برکتیں'' دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھیں۔ ان میں نمایاں تر جا بجا مختسب کا وجود تھا۔ دُلہن پر جلد ہی واضح ہو گیا کہ من موج کا زمانہ خواب ہوا۔ اب تو پھونک پھونک کر قدم رکھنے کا مقام ہے۔

تمام تر احتیاطوں کے باوجود کچھ معاملات اپنی ذات میں مشک تھے یعنی چھپائے نہ چھپتے۔ جیسے چھت پر موجود پانی کا ذخیرہ نہانے کے الزام تے زمین برد ہو جاتا۔ اس کے علاوہ بیت الخلا کو بخشی گئیں رفاقت کی طویل گھڑیاں! اوروں کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکتی تھی لیکن رفیقِ حیات سے یہ سب کیونکر چھپ رہتا؟ کوئی اور ہوتا تو یقیناً آسمان سر پر اُٹھا لیتا، بھلا ہو احمد فیضان کا کہ انھوں نے اس سر پڑے کی کسی کو بھنک تک نہ پڑنے دی۔ وہ یہ ایقان و عمل رکھتے تھے: ''شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہوتے ہیں۔'' اس طرح دلہن کو ایک ڈھال سی میسر آ گئی۔ اسی پر بس نہیں، سرتاج نے اصلاح احوال کے لیے مقدور بھر ترغیب و تلقین کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ دراصل گھر کا بھیدی فیضان اس راہ کی کٹھنائیوں سے آشنائی رکھتا تھا۔ رضیہ بانو کے اس ''دیوان'' کے مقابل اُدھر بھی ایک چھوٹی سی ''بیاض'' پائی جاتی تھی۔ اس میں شامل ایک بڑی ہی منفرد ''غزل'' جس کا کل سرمایہ یہ مطلع تھا: ''احمد فیضان نے اس رشتے کے لیے ہاں سسرال کا رہن سہن خصوصاً بیت الخلا تاک کر کی۔''

زندگی کی گاڑی سمجھوتوں کے سائے میں اس ڈگر پر گھسٹنے لگی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ دو سے چار اور پھر پانچ ہو گئے۔ کنبے کے علاوہ فیضان صاحب کا عہدہ بھی بڑھتا گیا۔ ایک وقت آیا، وہ علیحدہ مکان میں اُٹھ آئے۔ اب خیر سے پورے کا پورا مکان رضیہ بانو کی قلم رُو میں تھا تاہم غسل خانے کو بلاشرکت غیرے ''پائے تخت'' کا درجہ حاصل رہا۔ دوسری جانب اہل خانہ اس ''ریاست ہائے! ہائے!'' کو قسمت کا لکھا سمجھ کر راضی ہو رہے۔ یہاں اس امر کا اعتراف لازم آتا ہے، اتنے جنجال پالنے کے باوجود رضیہ اپنے تمام تر فرائض اور ذمہ داریاں بہ طریق احسن سرانجام دیتی رہیں۔

وہ جو کہتے ہیں کہ ہر رات کے بعد صبح طلوع ہو کر رہتی ہے۔ یہ سویرا بالآخر اس گھر میں بھی ہوا۔ تاہم اسے نمودار ہوتے ہوتے دو عشرے لگ گئے۔ ایسا قطعاً نہ تھا کہ رضیہ کا سرمایۂ حیات یکلخت غائب ہو گیا۔ یہ سرمایۂ افتخار بیس برسوں تک نصف النہار پر چمکنے کے بعد دو سے اڑھائی برس کے عرصے میں بتدریج رخصت ہوا۔

وائے حسرت! دو دھائیوں کے متاثرین یعنی گھر کے افراد ابھی بغلیں شادیانے وغیرہ بجانے کا سوچ رہے تھے کہ ایک اور سیاہ رات اُتر آئی۔ وہ سردیوں کی ایک چمکتی دوپہر تھی اور چھٹی کا روز۔ جہیز کے متروک سامان کا جائزہ لیتے ہوئے ایک نفیس

لحاف برآمد ہوا۔ اسے دیکھ کر احمد فیضان بے ساختہ بول اُٹھے۔

''بہت خوب! کیا شاندار کپڑا ہے اور کمال کی کاری گری۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کا ایک ایک بخیہ ناپ تول کر لگایا گیا ہو۔'' یہ سن کر رضیہ کی آنکھیں چمک اُٹھیں اور جواب میں کہا:

''جی ہاں واقعی ایسا ہی ہے۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے، دادی جان نے اسے اپنی نگرانی میں تیار کروایا تھا۔''

بظاہر بات آئی گئی ہوئی لیکن مذکورہ لحاف چپکے سے محترمہ کے دل میں گھر کر گیا۔ ایسا کہ اب یہ بے زبان اوڑھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا جبکہ دیگر اہل خانہ کے لیے بچھو! اسے ایسی حرمت نصیب ہوئی کہ کسی ''نامحرم'' کا چھوٹا تو درکنار قریب پھٹکنا بھی حرام قرار پایا۔ الغرض اس نادر کی حفاظت قریب قریب اسی طرح کی جاتی جیسے جوہری تنصیبات کی ہوا کرتی ہے!

بچوں کے لیے یہ نیا سلسلہ کسی آسیب سے کم نہ تھا۔ جس نے ان کی امی جان کو جکڑ لیا تھا اور امی نے ان کی جانوں کو۔ وہ تینوں پھٹی پھٹی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے۔ اُنھیں گزرے برسوں کی وہ صعوبتیں اور ابتلائیں اس نئی اُفتاد کے سامنے غنیمت محسوس ہوتیں۔ دوسری جانب احمد فیضان نے اس قضیے کا ذمہ دار خود کو ٹھہرا دیا۔ وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے یوں خود کلام ہوتے:

''کاش! میں نے اس وقت لحاف کی تعریف نہ کی ہوتی۔''

کمان سے نکلا تیر بھلا کب واپس آیا؟ قصہ مختصر ان کے وہ تازہ خواب بھی بکھر گئے جو اُنھوں نے گزشتہ انقلاب یعنی اہلیہ میں مثبت تبدیلیوں کے بعد دیکھنے شروع کر دیے تھے۔

بڑے بیٹے جواد نے مقابلے کے امتحان کے بعد منگنی پر آمادگی ظاہر کر رکھی تھی۔ اس نے نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے باوجود شادی ہی سے انکار کر دیا۔ چھوٹا بیٹا حماد کامیاں نکلا، اس نے اعلیٰ تعلیم کی آڑ میں شمالی امریکا کو اُڑان بھر لی۔ یوں وہ اس گھرانے کا واحد فرد تھا جو لحاف گزیدہ ماحول سے نکلنے میں کامیاب ہوا۔ ملیحہ ابھی کالج کے پہلے سال میں تھی لہٰذا اس کی گلو خلاصی میں چار سے پانچ سال حائل تھے۔ باقی رہے احمد فیضان، انھوں نے اپنے بکھرے خواب کے ساتھ ساتھ خود کو بھی مطالعے کے کمرے میں سمیٹ لیا۔ اب یہی ان کی خواب گاہ تھی اور یہی طعام گاہ۔ غرض وہ رضیہ کی رضا میں یوں راضی ہوئے کہ اپنا من ہی مار لیا۔ بالآخر یہ دن بھی آیا کہ وہ باقی ماندہ ناطے بھی توڑتے ہوئے ملکِ عدم کو روانہ ہو گئے۔

کہاں رضیہ صبر و رضا کا پیکر بنی خاموشی سے شوہر کی لاش کے پاس ٹکی ہوئی تھیں۔ کہاں یہ انتہا کی گریہ زاری اور ماتم۔ اس میں کلام نہیں، ان پر واقعی غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ غرض بیوہ کی یہ حالت دیکھی نہ جاتی تھی۔ اس صورت حال سے ماحول مزید غم ناک ہو گیا۔ مائل برقرار دل اور صبر کے پیمانے چھلک پڑے۔

☆☆☆

ہوش میں لائے جانے کے بعد رضیہ بانو اب ماں کے گھٹنوں سے لگی سسکیاں بھر رہی تھیں۔ اچانک انھوں نے اپنا سر زور سے دائیں بائیں ہلانا شروع کر دیا اور ''نہیں! نہیں'' کہتے ہوئے میت کی طرف اُٹھ دوڑیں۔ باوجود یہ کہ تین چار خواتین نے انھیں قابو کر رکھا تھا وہ اسی جانب لپک لپک جاتی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر ہر آنکھ پھر سے اشک بار ہو گئی۔ البتہ ماں باپ کی لاڈلی ملیحہ اس پکڑ دھکڑ سے لاتعلق خاموش تماشائی بنی رہی۔ بلکتی ماں کے پاس کھڑی بیٹی کا چہرہ پُرسکون نظر آ رہا تھا۔ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔

احمد فیضان نے اس نئی ابتلا میں بہانگ دُہل کہا تھا: ''بچو! یاد رکھنا جس روز تمہاری ماں کی رضائی کو کچھ ہو گیا وہ زندہ نہ رہے گی۔'' اس فرمان کے برعکس موصوفہ نہ صرف بقید حیات رہیں بلکہ زور آزمائی کے جوہر بھی دکھائے جا رہی تھیں۔ بس ملیحہ کا اطمینان اپنے بابا کی اس پیش گوئی کے پورے نہ ہونے پر تھا۔

یہ رضیہ کی وہی رضائی تھی جو کسی نادان دوست نے ان کی غیر موجودگی میں میت کو اوڑھا دی تھی!

◆◆◆

اشفاق احمد

پرسوں میرے ساتھ پھر وہی ہوا جو ایک برس اور تین ماہ پہلے ہوا تھا۔ یعنی میں اپنی گاڑی کا فلنگ اسٹیشن پر تیل بدلی کروانے گیا تو وہاں لڑکوں نے چیخ مار کر کہا کہ سر آپ وقت پر تیل نہیں بدلواتے۔ گاڑی تو اسی طرح چلتی رہتی ہے لیکن اس کا نقصان بہت ہوتا ہے لیکن آپ اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ میں نے کہا بھئی اس میں اکیلے میرا ہی قصور نہیں ہے۔ میرے ملک میں تیل کی بدلی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ہم پٹرول ڈالتے ہیں، گاڑی چلتی رہتی ہے اور ہم ایسے ہی اس سے کام لیتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک خیال آتا ہے تو تیل بدلی کرواتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گاڑی کا سارا تیل اتنا خراب ہو چکا کہ اسے باہر نکالنا مشکل ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ یار چلتی تو رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آپ تو سر پڑھے لکھے آدمی ہیں اور گاڑی کا وقت پر تیل بدلوانا بہت ضروری ہے۔ پچھلے سال بھی انھوں نے مجھ سے یہی بات کہی تھی اور مجھ سے بدستور یہ کوتاہی سرزد ہوتی رہی۔ جب وہ لڑکے تیل تبدیل کر رہے تھے تو میں سوچنے لگا کہ میں باقی سارے کام وقت پر کرتا ہوں۔ بینک بیلنس چیک کرتا ہوں، یوٹیلیٹی بلز وقت پر ادا کرتا ہوں اور یہ ساری چیزیں میری زندگی اور وجود کے ساتھ لگی ہیں لیکن میں نے کبھی اپنے اندر کا تیل بدلی نہیں کیا۔ میری روح کو بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں بھی تبدیلی پیدا کی جائے لیکن اس بابت میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں یہ بات سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ کیا مجھ پر ایسا وقت آ سکتا ہے کہ میں دنیا داری کے اور سارے کام کرتا ہوا اور خوش اسلوبی سے ان کو نبھاتا ہوا اپنی روح کی طرف بھی متوجہ ہو کر اس کی صفائی اور پاکیزگی کا بندوبست کروں۔ میں نے گزشتہ سارے سالوں کا حساب لگایا لیکن میں ایسا نہ کر سکا۔

میری نیت تو شاید نیک تھی اور میں اچھا آدمی بھی تھا لیکن یہ کوتاہی میری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی آ رہی تھی اور میرا کوئی بس نہیں چلتا تھا۔ میرے ساتھ ایسی بے اختیاری وابستہ تھی کہ میں اس کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتا تھا۔ میرے خیال میں اپنی روح کے تیل کو تبدیل کرنے کی اپنے بدن کی صفائی سے

کچھ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو انسانیت کے گروہ میں زیادہ خوبصورت بن کر اُبھرتے ہیں

بھی زیادہ ضروری ہے۔ جس کی طرف آدمی کسی وجہ سے توجہ نہیں دے سکتا، وہاں بھی ہمارا مزاج اپنی گاڑیوں سے سلوک جیسا ہی ہے۔ ہم اپنی گاڑیوں میں پٹرول ڈال کے تو چلتے رہتے ہیں لیکن پٹرول سے مفید تر تیل بدلی کا کام ہم نہیں کرتے تاکہ گاڑی کا انجن محفوظ رہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔

وہاں سوچتے سوچتے اور بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کچھ لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی توجہ اپنی تیل بدلی کی طرف زیادہ ہوتی ہے اور وہ انسانیت کے گروہ میں زیادہ خوبصورت بن کر اُبھرتے اور لوگوں کے کچھ کہے بولے بغیر بہت سارے کام کر دیتے ہیں۔ اللہ نے پتا نہیں ان کو کس طرح ایسا ملکہ دیا ہوتا ہے۔

بڑے سالوں کی بات ہے جب 53-1952ء میں بہت بڑا سیلاب آیا تھا اس وقت ابھی لاہور کو سیلاب سے بچانے والی فصیل بھی نہیں بنی تھی جسے آپ بند کہتے ہیں۔ اس وقت لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر ایسی ایسی جگہوں پر جا بیٹھے تھے جہاں زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے طور پر یہ سوچ کر وہاں گئے کہ شاید وہاں ہمارا جانا مفید ہو یا پھر تجسس میں بطور صحافی ہم کچھ دوست گئے۔ وہاں ایک بوڑھی مائی دو تین ٹین کے ڈبے رکھ کر بیٹھی تھی اس کے پاس ایک دیگچی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اس نے کل شام وہاں چولہا بھی جلایا ہے اور کچھ پکایا بھی ہے۔ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہاں ان خیموں میں لوگ دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔

ہمارے ساتھ آئے ہوئے ممتاز مفتی نے اسے دیکھ کر کہا کہ یار اس کی حالت تو بہت ناگفتہ اور خراب ہے۔ میں نے کہا کہ ظاہر ہے اور بھی بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ اس خراب حالت میں اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا اطمینان و سکون تھا۔ وہ بڑی تشفی کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ ممتاز مفتی نے اس سے کہا:

''بی بی اگر تم کو دو سو روپے مل جائیں (دو سو کا سن کر اس کی آنکھیں روشن ہوئیں) تو پھر تُو ان کا کیا کرے گی؟''

کہنے لگی، ''بھا جی! لوگ بڑے غریب نیں۔ میں اوہناں وچ ونڈ دیاں گی۔'' (بھائی! لوگ بہت غریب ہیں۔ میں ان میں بانٹ دوں گی)

اب اتنے برس کے بعد مجھے اس مائی کا چہرہ بھی یاد آ گیا اور میں نے سوچا کہ اس نے اپنی روح کی تیل بدلی بڑے وقت پر کی تھی اور اس کی شخصیت و فردیت اور برتری وہاں گئے ہوئے ہم سارے دانشوروں، لکھاریوں اور صحافیوں سے زیادہ اور بڑے درجے پر تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ پچھلے سال اور اس سال کے درمیان مجھ میں ایک صلاحیت البتہ پیدا ہو گئی ہے اور وہ بھی کچھ اچھی صلاحیت نہیں ہے۔ اس میں تھوڑی سی کمینگی کا عنصر شامل ہے۔

وہ یہ ہے کہ میں اپنے مدِ مقابل جب کسی نئے آدمی کو دیکھتا ہوں تو مجھے اتنا ضرور پتا چل جاتا ہے کہ باوصف اس کے یہ شخص بڑی مضبوطی اور تیز رفتاری کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر کر رہا ہے لیکن اس کا تیل اندر سے بہت گندا ہے۔

کچھ لوگ زندگی میں ایسے بھی ملتے ہیں اور وہ ہر روز ملتے ہیں جنہوں نے کسی وجہ سے سارے کام کرتے ہوئے اس طرف بھی توجہ مرکوز رکھی کہ روح کے اندر اور کارکردگی کے اندر کسی قسم کی آلائش نہ آنے پائے۔ جب میں روم میں تھا تو وہاں کے ایک بڑے اخبار کے مالک جس کے وہ مینجنگ ایڈیٹر بھی تھے، نے اپنے صحافیوں کو دعوت دی۔ انھوں نے مجھے بھی مدعو کیا۔ گو میں کوئی بڑے کام کا رائٹر بھی نہیں تھا۔

وہ بڑی عظیم الشان دعوت تھی۔ وہاں بڑا پُرتکلف اہتمام کیا گیا تھا۔ جب ہم کھانا وانا کھا چکے تو کچھ صحافیوں نے اس اخبار کے مالک سے فرمائش کی کہ آپ اپنا گھر ہمیں دکھائیں۔ کیونکہ ہم نے سنا ہے کہ آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔ ہم اسے اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ

ضرور دیکھیں اور آئیے۔ ہم نے ٹکڑیوں کی شکل میں اس کے گھر کا اندر سے نظارہ کیا۔ بڑا خوبصورت تھا۔ اس گھر کے بڑے بڑے ڈیکوریشن والے اور مجسموں سے بھرے کمرے تھے اور ان میں خوبصورت پینٹنگز بھی لگی ہوئی تھیں۔ ایک بڑے خوبصورت کمرے کے بارے میں ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ کس کا کمرا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ میرے ڈرائیور کا کمرا ہے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔ ہم نے دوسرے کمرے کے بارے پوچھا جو پہلے سے بھی اچھا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ باورچی کا کمرا ہے۔ اس طرح ایک سے ایک اعلیٰ اور بڑھ کر کمرے دیکھے جو سارے گھر کے ملازموں کے تھے۔ پھر ہم نے وہاں ایک چھوٹا سا کمرا دیکھا جس میں ٹیلیفون، ایک میز جو کوئی پانچ آٹھ فٹ کا ہوگا، ایک بستر جو فولڈ بھی ہو جاتا ہے۔ ہمارے پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ یہ میرا کمرا ہے۔

ہم نے کہا کہ سر آپ نے نوکروں کے لیے تو اعلیٰ درجے کے کمرے بنائے ہیں اور اپنے لیے یہ ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟

وہ کہنے لگے کہ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ میری ماں روم کے ایک بہت بڑے لارڈ کے گھر میں باورچن تھی اور انھیں جو کمرا ملا ہوا تھا وہ بڑا تنگ تھا۔ اس کمرے میں ہم اپنی ماں کے ساتھ تین بہن بھائی بھی رہتے تھے۔ جب میں نے گھر بنایا تو سوچا کہ ملازموں کے کمرے بڑے خوبصورت اور سجے سجائے ہونے چاہئیں اور میں تو ہوں ہی ایک بڑا آدمی اس لیے مجھے کسی بڑے کمرے کی کیا ضرورت؟ ہم اس کو دیکھ اور اس کی بات سن کر ششدر رہ گئے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

اس کے ملازم بڑے نخریلے اور مزے کرنے والے تھے۔ میں اس اخبار کے مالک کی خوبی اب محسوس کرتا ہوں کہ انھوں نے بھی اپنی ساری توجہ اپنی زندگی کو چلانے کے لیے پٹرول پر نہیں بلکہ اس تیل پر دی تھی جو تبدیل کر کے انسانی زندگی کو سہولت کے ساتھ آگے لے جاتا ہے۔ ہم سے یہ کوتاہی عموماً ہوتی رہتی ہے۔ ہم بھی اپنی زندگیوں کو کم از کم ایک دفعہ تو اس انداز سے چلائیں جس طرح سے سائنس کہتی ہے یا میکینکل کو سمجھنے والے کہتے ہیں کہ آپ کے انجن اور مشین کو اتنے گھنٹوں یا دنوں کے بعد تیل بدلی کی ضرورت ہے اور وہ پٹرول سے بھی زیادہ اہم ہے، ہم اپنے وجود کو اس طور سے چلائیں۔

کچھ لوگ جن سے میری فطرت بھی ملتی ہے اور میں ان کو آسانی سے پہچانتا ہوں کہ ان کی طبیعت کے اندر تیل بدلی والی خاصیت شاید ہوتی تو ہے لیکن کم ہوتی ہے۔ آپ کو زندگی میں بڑے بڑے امیر لوگ ملیں گے۔ چاہے آپ کل سے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ وہ زندگی میں بڑے کامیاب ہوں گے اور بڑے اونچے عہدوں پر فائز ہوں گے لیکن زندگی کے میدان میں اور جو انسانیت کے کھیل کا میدان ہے اس میں وہ کمزور ہوں گے۔ کہیں نہ کہیں آ کر ان کا انسانی رشتہ گھٹن کا شکار ہوتا ہے۔ جیسے گاڑی کے اندر فریش آئل نہ ڈالا جائے تو وہ گھٹن کے ساتھ چلتی ہے اور ایک ماہر ڈرائیور بیٹھتے ہی بتا دیتا ہے کہ اس کے تیل کی تبدیلی نہیں ہوئی حالانکہ وہ دوڑ رہی ہوتی ہے لیکن جونہی اس کے تیل کی تبدیلی ہوتی ہے تو وہی ماہر ڈرائیور کہتا ہے کہ سر اب یہ زیادہ رواں چل رہی ہے۔ لگتا ہے پرسوں ہی تیل تبدیل کیا ہے۔ زندگی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح سے ہی ہے۔ میں اپنے بچوں اور پوتوں پر یہ توجہ دے رہا ہوں کہ میں ان کو ایم کام کرا دوں یا فلاں ڈگری دلوا دوں اور لائق بنا کر کہیں فٹ کرا دوں۔ یہ زندگی کی کامیابی نہیں ہے۔ زندگی میں کامیاب ہونے کا سارا تعلق ہم نے اکنامکس سے وابستہ کر لیا ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں۔ اچھے آدمی ہیں لیکن طبیعت کے ذرا سخت ہیں۔ وہ ایک شام اخبار پڑھ رہے تھے تو تھانے سے ٹیلیفون آیا اور کسی نے کہا کہ سر ہم نے آپ سے استفسار

کرنا ہے۔ کہنے لگے ہاں جی فرمایئے۔ اس نے کہا کہ آپ کی بیگم صاحبہ گاڑی لے کر جا رہی تھیں۔ انھوں نے گاڑی کی کسی اور گاڑی کے ساتھ ٹکر مار دی ہے۔ کوئی خاص نقصان نہیں ہوا اور انھوں (بیگم صاحبہ) نے اس امر کا اعتراف کر لیا ہے کہ یہ ٹکر میری غلطی سے ہوئی تھی۔

اس شخص کی فون پر بات سن کر میرا دوست بولا کہ اگر اس خاتون نے اعتراف کر لیا ہے تو وہ میری بیوی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس نے آج تک اپنی کسی غلطی کا اعتراف نہیں کیا اور وہ یہ کہہ کر دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس فون کرنے والے نے کہا کہ جی وہ اپنا نام شائستہ بتاتی ہیں تو صاحب نے کہا کہ اس نام کی کئی خواتین ہیں۔ وہ میری بیوی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ تیل بدلی والی بات ان پر بھی صادق آتی ہے اور یہ ایک سخت تر مثال ہے۔

جب میں ایک پسماندہ سے گاؤں کے ایک اسکول میں کچی جماعت میں داخل کرایا گیا تو وہاں ایک بابا دال چپاتی ہوا کرتے تھے۔ اس کے پاس سرخ گاڑی تھی۔ وہ لمبا سا جبہ پہن کے رکھتے تھے اور یو۔پی کے کسی علاقے سے آئے تھے۔ جب بھی ہم گلی میں باہر نکلتے اور ان کی پہنچ میں آتے تو وہ بابا دال چپاتی آگے بڑھ کر ہم کو پکڑ لیتا۔ ہم چھوٹے ہوتے تھے اور ڈر سے چیخیں مارنے لگتے اور روتے لیکن وہ بابا ایک ہی بات کہتے تھے کہ ''جا تو آگے اور دیکھ تماشا۔ ابھی اللہ کا فضل تجھے پکڑ لے گا اور دال چپاتی تیرے پیٹ میں ہے۔''

ہمیں لگتا تھا کہ اللہ کا فضل بڑا خوف ناک ہوتا ہے لیکن وہ ہمیں ہمیشہ یہی کہتے۔ جب میری ماں مجھے قاعدہ دے کر اسکول بھیجتی تو میں کہتا: ''وہاں باہر بابا دال چپاتی ہو گا۔ وہ مجھے پکڑ کر اللہ کے فضل کے حوالے کر دے گا۔''

جب میں بڑا ہوا تو عید کا ایک دن تھا۔ ہم جب نماز پڑھ کے مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو میرے والد صاحب جو قصبے میں بڑے معزز تھے انھوں نے بابا دال چپاتی کی جوتیاں اٹھا کر پہننے کے لیے سیدھی کیں۔ وہ کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ رہنے دیں۔ میں ایسے ہی پہن لوں گا۔ میرے ابا جی کہنے لگے کہ مجھے یہ سعادت حاصل ہونے دیں کہ میں آپ کی جوتیاں سیدھی کروں۔ بابا کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا کہ ابا جی ایک معمولی سے آدمی کو اتنا بڑا امان سمان دے رہے ہیں۔ آخر کیوں؟

میرے ابا جی کہنے لگے کہ آپ ہم سب مسلمانوں کے لیے فخر کا باعث ہیں۔

وہ بابا دال چپاتی کہنے لگے کہ میں ایک اچھا انسان تو ضرور ہو سکتا ہوں لیکن اچھا مسلمان ہونے کا فاصلہ ابھی بہت طویل ہے۔ اچھا مسلمان ہونا بہت مشکل ہے۔

خواتین و حضرات! آپ کو کچھ لوگ ایسے بھی ملیں گے جو اتنے زیادہ سخت طبیعت کے تو نہیں ہوں گے لیکن ان میں کچھ عجیب سا توازن ہو گا۔ ہمیں اپنے دل کے اندر کوئی خباثت یا غلاظت نہیں پالنی چاہیے۔

شدید بارش میں ہم جمعہ پڑھنے گئے تو وہاں ایک نوجوان سے مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ دیکھیں کیا اللہ کی رحمت ہے اور اس کی کیا مہربانی ہے اور کیسی خوبصورت اور دلفریب موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور ہم اندر بیٹھے ہوئے اللہ کے لطف و کرم سے فیض اُٹھا رہے ہیں اور جو لوگ گاڑیوں پر جمعہ پڑھنے آتے ہیں ان کی گاڑیاں مفت میں دھل رہی ہیں۔

یہ بڑی باریک سی بات تھی اور اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی ایک ماہ کے اندر اندر مولوی صاحب کو اپنی تیل بدلی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ہم ان کو ابھی پوری کی پوری داد نہیں دے سکتے۔ میں آپ سے جاتے جاتے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ آپ اپنی موٹر کی تیل بدلی بھی وقت پر کروائیں اور اپنی روح اور ذات کی تیل بدلی بھی وقت پر کریں ورنہ وقت بہت کم رہ جائے گا۔

اُردو کی آخری کتاب

ابن انشاء

کبوتر بڑے کام کا جانور ہے۔ یہ آبادیوں میں جنگلوں میں، مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی کتاب میں غرض یہ کہ ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ کبوتر کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ نیلے کبوتر۔ سفید کبوتر، نیلے کبوتر کی بڑی پہچان یہ ہے کہ وہ نیلے رنگ کا ہوتا ہے سفید کبوتر بالعموم سفید ہی ہوتا ہے۔ کبوتروں نے تاریخ میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ شہزادہ سلیم نے مسماۃ مہرالنساء کو جب کہ وہ ابھی بے بی نور جہان تھیں کبوتر ہی تو پکڑایا تھا جو اس نے اڑا دیا اور پھر ہندوستان کی ملکہ بن گئی۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس سارے قصے میں زیادہ فائدے میں کون رہا؟ شہزادہ سلیم؟ نور جہاں؟ یا وہ کبوتر؟ رعایا کا فائدہ ان دنوں کبھی معرض بحث میں نہ آتا تھا۔ پرانے زمانے کے لوگ عاشقانہ خط و کتابت کے لیے کبوتر ہی استعمال کرتے تھے۔ اس میں بڑی مصلحتیں تھیں۔ بعد میں آدمیوں کو قاصد بنا کر بھیجنے کا رواج ہوا تو بعض اوقات یہ نتیجہ نکلا کہ مکتوب الیہ یعنی محبوب قاصد ہی سے شادی کر کے بقیہ عمر ہنسی خوشی بسر کر دیتا تھا۔ چند سال ہوئے ہمارے ملک کی حزب مخالف نے ایک صاحب کو الٹی میٹم دے کر روانی ملک کے پاس بھیجا تھا۔ الٹی میٹم تو راستے میں کہیں رہ گیا۔ دوسرے روز ان صاحب کے وزیر بننے کی خبر اخباروں میں آ گئی۔ طوطے کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا جاتا تو یہ صورت حال پیش نہ آتی۔

پیاسا کوا

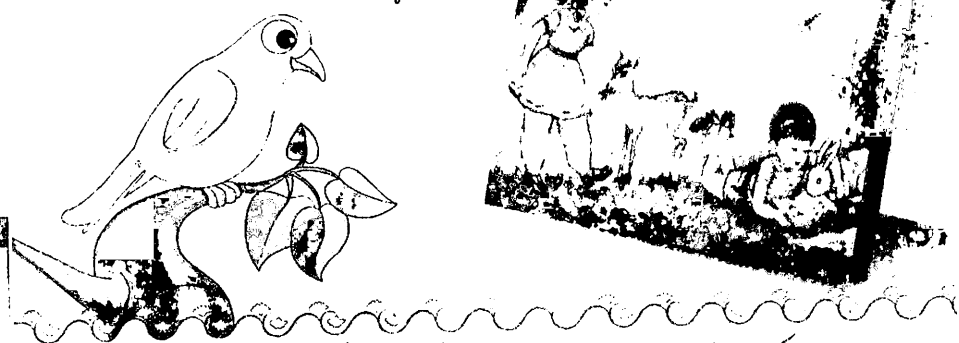

''اردو کی آخری کتاب'' محمد حسین آزاد کی ''اُردو کی پہلی کتاب'' کی دلچسپ پیروڈی ہے۔ اس مضمون کی سب سے اہم خصوصیت اس کا طنزیہ انداز بیان ہے۔ انشا کا طنز تلخ حقائق پر مبنی ہے لیکن اس میں تلخی نہیں۔ زبان کی شیرینی نے اس کی تلخی کو چھپالیا ہے لہٰذا اس طنز کو آسانی سے گوارا کیا جاسکتا ہے۔ خلائی دور پر طنز، صنعتی دور پر طنز، پتھر کے دور پر طنز، اخبار پر طنز، کراچی کارپوریشن پر طنز، ابن انشاء کی طنز کے چند جھروکے ہیں۔ ابن انشاء نے عظمت خیال اور حساس تخیل کے ذریعے طنز و مزاح کو نیا انداز دیا ہے اور زندگی کے ہر پہلو سے انصاف کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔ ہمارے نثری ادب میں عمدہ مزاح نگاروں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے اور ابن انشاء جیسی چلبلی نثر تو بالکل نایاب ہے ان کی شاندار پیروڈی ''اردو کی آخری کتاب'' میں ہماری ساری خود فریبیاں، قول و فعل میں تضاد، معاشرتی بے حسی، نمود و نمائش کی خواہش غرض زندگی کے ہر شعبے کی ناہمواریاں موجود ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایسا خوش دل ہنسنے ہنسانے والا شخص خود رنجیدہ نہیں۔ اُن کا دل بھی معاشرتی ناہمواریوں پر کڑھتا ہے اور ان کی روح الم زدہ ہے۔ یہ الگ بات کہ انھوں نے زندگی کو الگ زاویہ نظر سے دیکھا، پرکھا اور بیان کیا۔ اردگرد بکھری ہوئی ناہمواریوں کا گہرا سنجیدہ وشعور ابن انشاء کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔

ایک پیاسے کوے کو ایک جگہ پانی کا مٹکا پڑا نظر آیا۔ بہت خوش ہوا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ پانی بہت نیچے فقط مٹکے کی تہہ میں تھوڑا سا ہے۔ سوال یہ تھا کہ پانی کو کیسے اوپر لائے اور اپنی چونچ تر کرے۔

اتفاق سے اس نے حکایات لقمان پڑھ رکھی تھی پاس ہی بہت سے کنکر پڑے تھے اس نے اٹھا کر ایک ایک کنکر اس میں ڈالنا شروع کیا۔ کنکر ڈالتے ڈالتے صبح سے شام ہوگئی۔ پیاسا تو تھا ہی نڈھال بھی ہوگیا۔ مٹکے کے اندر نظر ڈالی تو کیا دیکھتا ہے کہ کنکر ہی کنکر ہیں۔ سارا پانی کنکروں نے پی لیا ہے۔ بے اختیار اس کی زبان سے نکلا ہت ترے لقمان کی۔ پھر بے سدھ ہوکر زمین پر گر گیا اور مر گیا۔ اگر وہ کوا کہیں سے ایک نلکی لے آتا تو مٹکے کے منہ پر بیٹھا بیٹھا پانی کو چوس لیتا۔ اپنے دل کی مراد پاتا۔ ہرگز جان سے نہ جاتا۔

اکبر

آپ نے حضرت ملا دو پیازہ اور بیربل کے ملفوظات میں اس بادشاہ کا حال پڑھا ہوگا، راجپوت مصوری کے شاہکاروں میں اس کی تصویر بھی دیکھی ہوگی، ان تحریروں اور تصویروں سے یہ گمان ہوتا ہے، کہ بادشاہ سارا وقت ڈاڑھی گھٹوائے، مونچھیں تراشوائے، اکڑوں بیٹھا پھول سونگھتا رہتا تھا یا لطیفے سنتا رہتا تھا، یہ بات نہیں اور کام بھی کرتا تھا۔

اکبر قسمت کا دھنی تھا، چھوٹا سا تھا کہ باپ بادشاہ ستارے دیکھنے کے شوق میں کوٹھے سے گر کر جاں بحق ہوگیا، اور تاج و تخت اسے مل گیا، ایڈورڈ ہفتم کی طرح چونسٹھ برس ولی عہدی میں نہیں گزارنے پڑے، ویسے اس زمانے میں اتنی لمبی ولی عہدی کا رواج بھی نہ تھا، ولی عہد لوگ جونہی باپ کی عمر کو معقول حد سے تجاوز کرتا دیکھتے تھے اسے قتل کرکے، یا زیادہ رحم دل ہوتے تو قید کرکے، تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوجایا کرتے تھے، تاکہ زیادہ سے زیادہ دن رعایا کی خدمت کا حق ادا کرسکیں۔

بابر

بابر شاہ سمرقند سے ہندوستان آیا تھا، تاکہ یہاں خاندان مغلیہ کی بنیاد ڈال سکے، یہ کام تو وہ بحسن وخوبی اپنے وطن میں بھی کرسکتا تھا، البتہ پانی پت کی پہلی لڑائی میں اس کی موجودگی ضروری تھی، یہ نہ ہوتا تو وہ لڑائی ایک طرفہ ہوتی، ایک طرف ابراہیم لودھی ہوتا دوسری طرف کوئی بھی نہ ہوتا، لوگ اس لڑائی کا حال پڑھ پڑھ کر ہنسا کرتے۔

یہ بادشاہ تزک لکھتا تھا، ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہتا تھا، پیشنگوئیاں بھی کرتا تھا، کہ عالم دوبارہ نیست، اور دو دو آدمیوں کو بغل میں داب کر دوڑ بھی لگایا کرتا تھا، ظاہر ہے اتنی

مصروفیتوں میں امورِ مملکت کیلئے کتنا وقت نکل سکتا تھا، شراب بھی پیتا تھا، یاد ہے، اس زمانے کے لوگوں کو مذہبی احکام کو ایسا پاس نہ تھا، جیسا ہمیں ہے، کہ محرم کے عشرہ کے دوران میں شراب کی دوکانیں بند رہتی ہیں، کسی کو پینی ہو تو گھر میں بیٹھ کر پیئے، کابل کو بہت یاد کرتا تھا، وہیں دفن ہوا، اس زمانے میں کابل شہر اتنا گندہ نہیں ہوتا تھا جتنا آجکل ہے۔

سوالات:

1۔ بابر نے خاندان مغلیہ کی بنیاد کیوں رکھی، خاندان تغلق یا خاندان موریا کی کیوں نہیں؟

2۔ اگر پانی پت کی پہلی لڑائی میں بابر کے علاوہ ابراہیم لودھی بھی شریک نہ ہوتا تو اس کا کیا نتیجہ ہوتا؟

بھارت

یہ بھارت ہے، گاندھی جی یہی پیدا ہوئے تھے، لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے، ان کو مہاتما کہتے تھے، چنانچہ مار کر ان کو یہیں دفن کر دیا اور سمادھی بنادی، دوسرے ملکوں کے بڑے لوگ آتے ہیں تو اس پر پھول چڑھاتے ہیں، اگر گاندھی جی نہ مرتے یعنی نہ مارے جاتے تو پورے ہندوستان میں عقیدت مندوں کے لیے پھول چڑھانے کی کوئی جگہ نہ تھی، یہی مسئلہ ہمارے یعنی پاکستان والوں کے لیے بھی تھا، ہمیں قائدِ اعظم کا ممنون ہونا چاہیئے کہ خود ہی مر گئے اور سفارتی نمائندوں کے پھول چڑھانے کی ایک جگہ پیدا کر دی ورنہ شاید ہمیں بھی ان کو مارنا ہی پڑتا۔

بھارت بڑا امن پسند ملک ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ اکثر ہمسایہ ملکوں کے ساتھ اس کے سیز فائر کے معاہدے ہو چکے ہیں، ۱۹۶۰ میں ہمارے ساتھ ہوا اس سے پہلے چین کے ساتھ ہوا۔

بھارت کا مقدس جانور گائے ہے، بھارتی اس کا دودھ پیتے ہیں، اسی کے گوبر سے چوکا لیپتے ہیں، اور اس کو قصائی کے ہاتھ بیچتے ہیں، اس لیے کیونکہ وہ خود گائے کو مارنا یا کھانا پاپ سمجھتے ہیں۔

آدمی کو بھارت میں مقدس جانور نہیں گنا جاتا۔

بھارت کے بادشاہوں میں راجہ اشوک اور راجہ نہرو مشہور گزرے ہیں۔ اشوک سے ان کی لاٹ اور دہلی کا شوکا ہوٹل یادگار ہیں، اور نہرو جی کی یادگار مسئلہ کشمیر ہے جو اشوک کی تمام یادگاروں سے زیادہ مظبوط اور پائیدار معلوم ہوتا ہے۔

راجہ نہرو بڑے دھرماتما آدمی تھے، صبح سویرے اٹھ کر شیر شک آسن کرتے تھے، یعنی سر نیچے اور پیر اوپر کر کے کھڑے ہوتے تھے، رفتہ رفتہ ان کو ہر معاملے کو الٹا دیکھنے کی عادت ہوگئی تھی، حیدر آباد کے مسئلہ کو انہوں نے رعایا کے نقطہ نظر سے دیکھا۔ یوگ میں طرح طرح کے آسن ہوتے ہیں، ناواقف لوگ ان کو قلابازیاں سمجھتے ہیں، نہرو جی نفاست پسند بھی تھے دن میں دو بار اپنے کپڑے اور قول بدلا کرتے تھے۔

پاکستان

حدود اربعہ پاکستان کے مشرق میں سیٹو ہے، مغرب میں سنٹو، شمال میں تاشقند اور جنوب میں پانی یعنی جائے مفر کسی طرف نہیں۔

پاکستان کے دو حصے ہیں، مشرق پاکستان اور مغربی پاکستان۔ یہ ایک دوسرے سے بڑے فاصلے پر ہیں، اس کا اندازہ اب ہو رہا ہے۔

دونوں کا اپنا اپنا حدود اربعہ بھی ہے۔

مغربی پاکستان کے شمال میں پنجاب، جنوب میں سندھ، مشرق میں ہندوستان اور مغرب میں سرحد اور بلوچستان ہیں، یہاں پاکستان خود کہاں واقع ہے اور واقع ہے بھی نہیں اس پر آج کل ریسرچ ہو رہی ہے۔ مشرقی پاکستان کے چاروں طرف آج کل مشرقی پاکستان ہی ہے۔

دینِ الٰہی

دینیات کی طرف اکبر کے شغف کو دیکھتے ہوئے وزیر با تدبیر ابوالفضل نے اس کے ذاتی استعمال کیلئے دین الٰہی ایجاد

کر دیا تھا، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے پہلے خلیفہ کی ذمہ داریاں خود سنبھال لی تھیں، چڑھتے سورج کی پوجا کرنا اس مذہب کا بنیادی اصول تھا، مرید اکبر کے گرد جمع ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ اے ظل الٰہی تو ایسا دانا و فرزانہ ہے کہ تجھ کو تاحیات سربراہ مملکت یعنی بادشاہ وغیرہ رہنا چاہیئے، اس کے نام کا وظیفہ پڑھتے تھے، اور اس کی تعریف میں وقت بے وقت بیانات جاری کرتے رہتے، پرستش کی ایسی رسمیں آج کل بھی رائج ہیں، لیکن ان کو دین الٰہی نہیں کہتے۔

پانی پت

پانی پت میں اس وقت تک صرف ایک لڑائی ہوئی تھی پانی پت والوں کا اصرار تھا ایک اور ہونی چاہیے، چنانچہ اکبر نے پہلی فرصت میں بہیرو بنگاہ کے ساتھ ادھر کا رخ کیا، ادھر سے ہیموں بقال لشکر جرار لے کر آیا، اس کے ساتھ توپیں بھی تھیں اور ہاتھی بھی تھے، ایک سے ایک سفید گھوڑا، گھمسان کا رن پڑا، ہیموں کی جمعیت زیادہ تھی، لیکن الکبری لشکر نے تابڑ توڑ حملے کر کے کھلبلی مچادی، بعض ہمدردوں نے اس کے جدی وطن سے پیغام بھجوایا کہ تم اور ہیموں دونوں یہاں تاشقند آؤ، صلح کرائے دیتے ہیں، لیکن اکبر نہ مانا، ہیموں ایک ہاتھی کے ہودے میں بیٹھا روپے آنے پائی کا حساب لکھ رہا تھا کہ اس لڑائی کا مال غنیمت فروخت کر کے کس کاروبار میں پیسہ لگایا جائے، ناگہاں ایک تیر قضا کا پیغام لے کر اس کی آنکھ میں آن لگا اور وہ بے سدھ ہو کر گر گیا، بقال کو ہم تاریخ کا پہلا موشے دایان کہہ سکتے ہیں۔

ادب کی سرپرستی وغیرہ

انارکلی ایک کنیز تھی جس کی وجہ سے شہزادہ سلیم کا اخلاق خراب ہونے کا اندیشہ تھا، اکبر نے اسے دیوار میں چنوا دیا، ایک مصلحت اس میں یہ تھی کہ سید امتیاز علی تاج اپنا معرکہ آرا ڈرامہ لکھ سکیں اور اردو ادب کے ذخیرے میں ایک قیمتی اضافہ ہو سکے، درباری شاعر نظیری نیشاپوری نے ایک بار کہا کہ میں نے لاکھ روپے کا ڈھیر بھی نہیں دیکھا، بادشاہ نے ایک لاکھ خزانے سے نکلوا کر ڈھیر لگا دیا، جب نظیر اچھی طرح دیکھ چکا تو روپے واپس خزانے میں بھجوا دیئے، نظیری دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا، اصل میں نظیری یہ حرکت خانخاناں کے ساتھ پہلے بھی کر چکا تھا، خانخاناں نے شاعر کی نیت کو بھانپ کر کہہ دیا تھا کہ اچھا اب یہ ڈھیر تم اپنے گھر لے جاؤ، لیکن اکبر ایسا کچا آدمی نہ تھا۔

اکبر کی حکمت عملی

اکبر میں تعصب بالکل نہ تھا خصوصاً شادیوں کے معاملہ میں کچھ ریاستیں فوجوں سے فتح کیں، باقی راجاؤں کی بیٹیوں کو اپنے حرم میں اور ان کے علاقوں کو اپنے سلطنت میں شامل کر لیا، آج کل کے سیٹھ اور مل مالک جو ایسا کرتے ہیں، تو یہ کوئی نئی بات نہیں۔

برکات حکومت غیر انگلشیہ

عزیزو بہت دن پہلے اس ملک میں انگریزوں کی حکومت ہوتی تھی اور درسی کتابوں میں ایک مضمون برکات حکومت انگلشیہ کے عنوان سے شامل رہتا تھا، اب ہم آزاد ہیں، اس زمانے کے مصنف حکومت کی تعریف کیا کرتے تھے، کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم اپنے عہد کی آزادی اور قومی حکومتوں کی تعریف کریں گے، اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔

عزیزو انگریزوں نے کچھ اچھے کام بھی کیے ہیں، لیکن ان کے زمانے میں خرابیاں بہت تھیں، کوئی حکومت کے خلاف بولتا تھا یا لکھتا تھا تو اس کو جیل بھیج دیتے تھے، اب نہیں بھیجتے، رشوت ستانی عام تھی، آج کل نہیں ہے، دکاندار چیزیں مہنگی بیچتے اور ملاوٹ بھی کرتے تھے، آج کل کوئی مہنگی چیزیں نہیں بیچتا، ملاوٹ بھی نہیں کرتا، انگریزوں کے زمانے میں امیر اور جاگیردار عیش کرتے تھے، غریبوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا اب پوچھتے ہیں تو وہ تنگ آجاتے ہیں، خصوصاً حق رائے دہندگی بالغاں کے بعد سے۔

تعلیم اور صنعت و حرفت کو لیجیے، ربع صدی کے مختصر

عرصے میں ہماری شرح خواندگی اٹھارہ فی صد ہوگئی، غیر ملکی حکومت کے زمانے میں ایسا ہوسکتا تھا؟

انگریز شروع شروع میں ہمارے دستکاروں کے انگوٹھے کاٹ دیتے تھے، اب کارخانوں کے مالک ہمارے اپنے لوگ ہیں، دستکاروں کے انگوٹھے نہیں کاٹتے ہاں کبھی کبھی پورے دستکار کو کاٹ دیتے ہیں، آزادی سے پہلے ہندو بنیے اور سرمایہ دار ہمیں لوٹا کرتے تھے، ہماری خواہش تھی، کہ یہ سلسلہ ختم ہو اور ہمیں مسلمان بنیے اور سیٹھ لوٹیں، الحمدللہ کہ یہ آرزو پوری ہوئی۔ جب سے حکومت ہمارے ہاتھ میں آئی ہے ہم نے خاصی ترقی کی ہے۔ خاص برآمدات دو ہیں، فوڈ اور زرمبادلہ، درآمدات ہم گھٹاتے جارہے ہیں، ایک زمانہ میں تو خارجہ پالیسی تک باہر سے درآمد کرتے تھے، اب یہاں بننے لگی ہے۔

خانخاناں

خانخاناں کا خطاب ذوالفقار الدولہ کا تھا، اکبر کا سب سے کم عمر وزیر تھا، ذہین اور خوش تقریر، اکبر اسے بہت عزیز رکھنے لگا اور باہر کی ولایتوں سے ہر طرح کے معاملت اس کے سپرد کر رکھی تھی، ٹوڈرمل کو یہ بات پسند نہ آئی کیونکہ خانخاناں کا میلان مہاراجہ سام گڑھ کے بجائے فغفور چین کی طرف زیادہ تھا، آخر نورتنوں کے حلقے سے نکلوا کر دم لیا، کہتے ہیں کہ پانی پت کی دوسری لڑائی کے سلسلے میں بھی بادشاہ سے خانخاناں کے اختلافات ہو گئے تھے، اکبر ہمیوں بقال سے صلح پر آمادہ تھا، خانخاناں اس کا مخالف تھا، خانخاناں کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ امراء بڑی بڑی جاگیروں پر قابض ہوں، یا علما جائدادیں بنائیں، اس لیے دربار کے علما بھی اس سے ناراض ہو گئے تھے، اور اس کے عقائد میں نقص نکالنے لگے تھے۔

خانخاناں نے بددل ہو کر پرچم بغاوت بلند کیا تو لاکھوں لوگ اس سے آملے لیکن ان میں روساء اور خاندانی امیر بہت کم تھے، زیادہ تر عام طبقے کے آدمی تھے، خانخاناں اپنا دربار پیپل کے ایک درخت کے نیچے لگاتا تھا، اس لیے اس کے حامی بھی پیپل والے مشہور ہوئے۔

رامائن

رامائن رامچندر جی کی کہانی ہے، یہ راجہ دسرتھ کے پرنس آف ویلز تھے، لیکن ان کی سوتیلی ماں کیکی اپنے بیٹے بھرت کو راجا بنانا چاہتی تھی اس کے بہکانے پر راجا دسرتھ نے رامچندر جی کو چودہ برس کے لیے گھر سے نکال دیا، ان کی رانی سیتا کو بھی ان کے بھائی لچھمن بھی ساتھ ہو لیے بن باس کے لیے نکلتے وقت رامچندر جی کے پاس کچھ نہ تھا، بس ایک کھڑاواں تھی، وہ بھی بھرت نے رکھوائی کہ آپ کی نشانی ہمارے پاس رہنی چاہیئے، اس کھڑاواں کو بھرت تخت کے پاس بلکہ اوپر رکھتا تھا تاکہ رامچندر جی کا کوئی آدمی چرا کے نہ لے جائے۔

جنگل میں رہنے کی وجہ سے ان کو گزارے میں چنداں تکلیف نہ ہوتی تھی رام جی تو آخر رام جی تھے، زیادہ کام ان کا لکشمن یعنی برادر خود کیا کرتے تھے۔

یہ لوگ گن گن کر دن گزار رہے تھے، کہ کب بارہ برس پورے ہوں اور کب یہ واپس جا کر راج پاٹ سنبھالیں اور رعایا کی بے لوث خدمت کریں، ایک روز جب کہ رام اور لکشمن دونوں شکار کو گئے ہوئے تھے لنکا کا راجا آیا اور سیتا جی کو اٹھا کر لے گیا، اس پر رامچندر جی اور راون میں لڑائی ہوئی، گھمسان کا رن پڑا جیسا کہ دسہرے کے تہوار میں پڑتا آپ نے دیکھا ہوگا۔

ہنومان جی اور ان کے بندروں نے رامچندر جی کا ساتھ دیا اور وہ راون اور اس کے راکشسوں کو مار کر جیت گئے اور پرانے خیال کے ہندو اسی لیے بندروں کی اتنی عزت کرتے ہیں، ان کو انسانوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

فعل دیگر

فعل کی بنیادی قسمیں دو ہیں، جائز فعل، ناجائز فعل، ہم صرف جائز فعل کے افعال سے بحث کریں گے، کیونکہ قسم دوئم پر پنڈت کوآنجہانی اور جناب جوش ملیح آبادی مبسوط کتابیں

فرمودات ابنِ انشا

☆ کولمبس نے جان بوجھ کر یہ حرکت کی یعنی امریکا دریافت کیا۔ بہرحال اگر یہ غلطی بھی تھی تو بہت سنگین غلطی تھی۔ کولمبس تو مر گیا اس کا خمیازہ ہم لوگ بھگت رہے ہیں۔

☆ جب عین لڑائی میں وقت نماز آتا محمود و آیاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے۔ باقی فوج لڑتی رہتی تھی۔

☆ گرمیاں آتی ہیں تو کراچی کا محکمہ واٹر سپلائی پانی کے نلکوں میں گیس سپلائی کرنے لگتا ہے۔ اس لیے غسل خانوں میں روٹی پکاتے اور باورچی خانوں میں (پسینہ میں) نہاتے دیکھے جاتے ہیں۔

☆ کوئی شخص حکومت کی کرسی پر بیٹھ جائے تو اُس کے لیے اُٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ زبردستی اُٹھاتے ہیں۔ یہ بھی کششِ ثقل کے باعث ہے۔

لکھ چکے ہیں۔

فعل کی دو قسمیں فعل لازم اور فعل متعدی بھی ہیں، فعل لازم وہ ہے جو کرنا لازم ہو، مثلاً افسر کی خوشامد، حکومت سے ڈرنا، بیوی سے جھوٹ بولنا وغیرہ۔

فعل متعدی عموماً متعدی امراض کی طرح پھیل جاتا ہے ایک شخص کنبہ پروری کرتا ہے، دوسرے بھی کرتے ہیں، ایک رشوت لیتا ہے، دوسرے اس سے بڑھ کر لیتے ہیں، ایک بنا سپتی گھی کا ڈبہ پچیس روپے میں کر دیتا ہے دوسرا گوشت کے ساڑھے بارہ روپے لگاتا ہے، لطف یہ ہے کہ دونوں اپنے فعل متعدی کو فعل لازم قرار دیتے ہیں، ان افعال میں گھاٹے میں صرف مفعول رہتا ہے، یعنی عوام، فائل کی شکایت کی جائے تو فائلیں دب جاتی ہیں۔

فعل ماضی

ماضی میں کسی شخص نے جو فعل کیا ہوا سے فعل ماضی کہتے ہیں۔ کرنے والا عموماً بھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن لوگ نہیں بھولتے۔ ماضی کی کئی قسمیں مشہور ہیں۔ سب سے زیادہ شاندار ماضی ہے۔ جس قوم کو اپنا مستقبل ٹھیک نظر نہ آئے وہ اس صیغے کو بہت استعمال کرتی ہے۔

ایک ماضی شکیہ ہے۔ جن لوگوں کا ماضی مشکوک ہو وہ ماضی شکیہ کے ذیل میں آتے ہیں۔ عموماً ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔

ماضی شرطیہ یا ماضی تمنائی، جن لوگوں نے ریس میں یا تاش کے پتوں پر شرطیں بدل بدل کر اپنا ماضی تباہ کیا ہو، ان کے ماضی کو ماضی شرطی کہتے ہیں۔ چونکہ ان لوگوں کی تمنا ہوتی ہے، اور پیسے آئیں تو ان کو بھی ریس میں لگائیں اور اس لیے شرطی اور تمنائی دونوں ماضیاں ساتھ ساتھ آتی ہیں۔

اس کی دو اور قسمیں ہیں۔ ماضی قریب اور ماضی بعید۔ ماضی کو حتی الوسع قریب نہ آنے دینا چاہیے۔ جتنی بعید رہے گی اور جتنے اس پر پردے پڑے رہیں گے اتنی ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ماضی کا بعید رہنا مستقبل کے لیے بھی اچھا ہے۔

لفظ اور صیغے

پرانے زمانے میں تذکیر اور تانیث کے قاعدے مقرر تھے۔ قاعدہ یاد ہو تو لباس اور بالوں وغیرہ سے پہچان ہو جاتی ہے۔ اب مخاطب سے پوچھنا پڑتا ہے کو تو مذکر ہے یا مونث اور بتا تیری رضا کیا ہے۔ اس کے بعد اس سے صحیح صیغے میں گفتگو کرتے ہیں یا ایران ہو تو اس کے ساتھ صیغہ کرتے ہیں۔

بہت سے واحد ایک جگہ جمع ہوں تو جمع کے صیغے میں آجاتے ہیں۔ جمع کے صیغے میں تھوڑی سی احتیاط ضروری ہے۔ خصوصاً جن دنوں شہر میں دفعہ 144 لگی ہو۔ ان دنوں میں جمع نہیں ہونا چاہیے، واحد رہنا ہی اچھا ہے۔ ◆◆

اور بتی بجھ گئی

ہری کانت/ جہانگیر عباسی

چل..... چل رے جوان!''

کوچوان جیون نے تھکے ہارے گھوڑے کی جیسے لگامیں کھینچ کر آواز بلند کی اور تھکا ہارا گھوڑا قدموں میں تیزی، رفتار بڑھاتے ہوئے منزل کی جانب ایسے بڑھنے لگا جیسے اپنے مالک کے اسی اشارے کا منتظر ہو۔ آخری ریل کب کی جا چکی تھی۔ رات کے دس بجنے والے تھے اور اسٹیشن کے چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے کے ساتھ سناٹے کے ماحول میں ریلوے اسٹیشن اب کسی بھوت بنگلے کی طرح نظر آنے لگا تھا مگر جیون سواری کی اُمید لیے کئی دیر تک وہاں گم سم کھڑا رہا۔ جب کسی مسافر کی کوئی اُمید باقی نہ رہی تو وہ نراشا لیے گھر کی جانب جانے لگا۔ صبح سے لے کر اب تک اس نے آج صرف سوا روپے کمائے تھے اور اپنے کنبے کے چھے افراد کے ساتھ ساتھ اسے اس بے زبان جانور کا پیٹ بھی ان سوا روپوں میں ہی بھرنا تھا جو سارا دن شہر کی کچی پکی سڑکوں پر چلتے دوڑتے اب تھکاوٹ سے چُور چُور ہو چکا تھا۔

وہ دو گہرے آنسو اپنے اندر ایک انمول راز سموئے ہوئے تھے

ہر نئے دن کی شروعات ہوتے ہی جیون کی زندگی میں ایک یہی معمول تھا کہ وہ تانگا لے کر گھر سے نکلتا اور سواری کے لیے شہر کے کونے کونے تک چکر لگاتا رہتا مگر اُسے بہت کم ہی سواری نصیب ہوا کرتی جس بات کو لے کر اکثر پریشان سوچتا رہتا، ''آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

سوچ سوچ کر جب سر درد سے پھٹنے لگتا اور اُسے اس ''کیوں؟'' کا کوئی جواب نہ ملتا تو وہ مایوس ہو کر اپنے پرانے تانگے کی خستہ حالت اور بے ڈھنگی رفتار سے چلنے والے کمزور گھوڑے کو دیکھ کر یوں چپ ہو جاتا جیسے کوئی ضدی بچہ اپنی ضد پوری ہو جانے پر چپ سا ہو جاتا ہے۔ جیون نے کئی بار فیصلہ کیا کہ وہ اپنے تانگے کی حالت بدلے گا مگر اس ارادے کی تکمیل سے پہلے ہی وہ خالی ہاتھ رہ جاتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ باقی سب تانگے والے جیون سے بہت آگے اور خوشحال دن گزار رہے تھے۔

جیون بوجھل آنکھوں میں ہزار سوچوں کے انبار لیے شہر کے روشن علاقوں کی بڑی بڑی عمارتوں کے بیچ سے ہوتا پُررونق بازاروں کو خالی آنکھوں سے تکتا ہوا جب کچی بستی والے اندھیارے راستے پہ گھوڑا موڑ کر تانگا لیے آیا تب اُسے لگا جیسے وہ روشنی کی قید سے نکل کر اندھیرے کی اس حقیقی دنیا میں آ پہنچا ہو جس میں رہتے ہوئے جیون کا وجود اسی اندھیرے ماحول کا کبھی نہ ٹوٹنے والا حصہ تھا۔ تھکا ہارا گھوڑا بھی جیون کی طرح مایوسی کی تصویر بنا تیزی سے چلتا اپنے اس مہربان مالک کو گھر پہ پہنچانے کے لیے بے چین دکھائی دے رہا تھا جس کے مالک کا پیٹ بھی اس کی طرح کل رات سے ہی خالی تھا۔ کچی سڑک پر تیزی سے چلتے ہوئے تانگے میں لٹکتی لال ٹین اچانک یوں پھڑ پھڑانے لگی، جیسے پنجرے میں قید ہونے والا نیا پنچھی ہر گھڑی پھڑ پھڑایا کرتا ہے۔ لال ٹین کی کھٹ پٹ کی آواز کان پڑتے ہی جیون نے نظر گھما کر جیسے روشن لال ٹین کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل دھڑک کر رہ گیا کیونکہ لال ٹین کی ٹمٹماتی ہوئی لَو کے ساتھ مصیبت کے لیے آثار ایسے جلوہ افروز ہونے کے امکان نظر آنے لگے تھے جیسے شام کا سورج ڈوبتے ہی بڑھنے والے سائے اندھیرے کی علامت بن کر بڑھنے لگتے ہیں اور پھر چلنے والی تیز ہوا کے جھونکوں پہ ٹمٹماتی لَو کے بجھتے ہی ان دیکھی مصیبت خوف کی چادر لپیٹے، آنے والے لمحوں میں اس وقت سچ ثابت ہوئی جب پولیس کی دل ہلا دینے والی سیٹی کی گونج مشکل کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ پل بھر کے لیے جیون کو محسوس ہوا کہ اس نے سیٹی کی آواز کے بجائے موت کے فرشتے کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ اس نے اپنا کانپتا ہاتھ سوا روپوں کے سکوں پر یوں جما دیا جیسے کوئی یہ سکے چھین کر رفو چکر ہو جانے والا ہو۔ دوسرے ہاتھ میں تھامی ہوئی گھوڑے کی لگام خود بخود ڈھیلی پڑتی گئی۔ گھوڑا رُکتے ہی سپاہی جیون نے جب مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا۔ رعب دار وردی میں بڑے بڑے ڈگ بھرتا سپاہی اپنے نزدیک آتے دیکھ کر وہ اور بھی خوفزدہ ہو گیا۔ رات کے اندھیرے ماحول میں سپاہی کے مضبوط بوٹوں کی ٹک ٹک شانتی توڑتی ہوئی جیون کے دل کی آواز کے ساتھ دھک دھک کرتے مل کر اب ایک ہو گئی۔

سپاہی اس کی نظروں کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ جیون کو لگا سپاہی نہیں پر کوئی ہیکل دیو آ کھڑا ہوا ہو جو اُسے آنکھ جھپکتے کچا چبا جائے گا۔ جیون نے کانپتے ڈرتے سپاہی کو سلام کیا۔

''سلام سرکار''..... کچھ پل کے لیے سپاہی اسے گھورتا رہا تو بات بدل کر جیون خوشامدی لہجے میں پھر بولا: ''مائی باپ! کہاں جانا ہے؟''

''بے ایمان! تُو نے بتی کیوں بجھائی؟ اب تھانے چل۔'' رعب دار آواز میں گرجتے ہوئے پہلی بار بہاری سپاہی نے اسی انداز سے اپنی بات مکمل کی، ''اور پوچھتے ہو کہ کہاں جانا ہے''۔

''سرکار! وہ بتی..... بتی تو بجھ گئی!'' بجھی ہوئی بتی کو تکتے

رش بھری آواز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔
"بجھ گئی! مگر کیوں؟" کرخت لہجے میں زمین پر لات
پھر سے سوال کیا۔
"کیوں..... کیوں..... کیوں" اگلے کئی پل سہمے ہوئے
کے خالی دماغ میں لفظ "کیوں" سیٹی کی طرح زور زور
بجنے لگے پھر وہ سنبھل کر عاجزی سے جواب دینے لگا۔
"حضور والا! ت..... ت..... تیل ختم ہو گیا۔"
"احمق انسان! تانگا چلاتے ہو اور بتی کا خیال نہیں
تمہارا یہ کیسا جواب ہے؟"
"سرکار! جیون کی جوت جلائے رکھنے کے لیے ہمیں اپنا
سینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ جب ہماری قسمت کا چراغ ہی
ہو تو تانگے کی اس پھڑ پھڑاتی بتی کا خیال کہاں تک
"

نہایت کے سیلاب میں ڈوبتے تیرتے جیون کے
وجود میں نہ جانے کہاں سے ہمت بھر آئی کہ اپنی
سرکار رونا سپاہی کے سامنے رونا رویا اب ہت بنا جیون
آنکھوں سے آبشار کی طرح بہتے ہوئے آنسوں کو دیکھ رہا
اور پوچھتے ہوئے جیون پھر سے کہنے لگا۔ "مجھ پر دیا
سرکار! میرے بچے کل سے بھوکے ہیں اور دُودھ کے
بچے کے لیے معصوم رامو تڑپ رہا ہوگا۔"
اسے لبریز دل دُکھانے والی جیون کی داستان سن کر
سپاہی کا دل رحم کے ساگر میں غوطے کھانے لگا جیسے
ہت میں اپنے غریبی حال کی تصویر نظر آنے لگی اور
وہ پٹا ہوا اس کا پتھر دل ہمدردی کے جذبے سے
پگھل گیا جیسے پہاڑوں پہ جمی برف سورج کی تپش سے
پگھلتی ہے۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ بہاری سپاہی خود حالات
کا مجبور زندگی گزار رہا تھا۔ سترہ روپے کی ماہانہ تنخواہ
سے چھے معصوم بچوں کا پیٹ پالنا اس کے لیے کس قدر
مشکل ہے صرف وہ ہی جانتا تھا جو خود اپنے بچوں کو اکثر بھوکا
سوتا دیکھ کر تڑپ جایا کرتا اور اب اس کی معصوم بچی جیون کے
معصوم رامو کی طرح دن بہ دن سوکھی ٹہنی کی طرح ہو رہی تھی۔
آج صبح وہ اُسے بخار میں تڑپتے ہوئے گھر چھوڑ آیا تھا۔
علاج کے لیے ایک پھوٹی کوڑی بھی اس کے ہاتھ میں نہ تھی اور
اسی کا علاج نہ کرانے کے غم سے بھرا اپنی ڈیوٹی کر کے کسی
ہارے ہوئے جواری کی طرح گھر لوٹ رہا تھا کہ اچانک اس
کے پہلو سے گزرتے جیون کے تانگے میں لٹکتی بتی تجھی ہوئی
دکھائی دی۔ بنا بتی کے تانگا چلانے کے جرم میں اس نے سیٹی
مار کر جیون کو روک کر اب اس کے غیر قانونی عمل سے پورا پورا
فائدہ اُٹھانے کی اُمید اس کی مایوس دنیا میں روشن سورج کی
پہلی کرن کی طرح جاگ اُٹھی تھی۔ کچھ دیر پہلے جس سپاہی کا
دل انسانی ہمدردی کے ساگر میں رحم کے غوطے کھا رہا تھا وہ
ایسے راستے کے مانند بن گیا جس سے بچ کے نکلنا جیون کے
لیے ناممکن تھا۔ اپنے ہاتھ پہ ٹھہرے ہوئے پسینے کی اشد انگلی
سے صاف کرتے ہوئے سخت لہجے کا روپ دھار کر بہاری
سپاہی بگڑ کر کہنے لگا۔
"تم لوگ سارے قاعدے قانون پار کر جانے کے
عادی مجرم بن گئے ہو اس لیے ہوش ٹھکانے نہیں رہتا۔ تب ہی
تو بتی کے بغیر بے خوف تانگا چلا رہے ہو۔"
"پر حضور....." جیون کی بات پوری ہونے سے پہلے
سپاہی اس پر مزید برس پڑا: "آج تو تمہیں ہرگز نہیں چھوڑوں
گا اور ابھی کے ابھی تھانے لے جا کر دس روپے کا جرمانہ
بھروا ؤں گا۔ تب ہی جا کے سدھرو گے۔"
جرمانے کا سنتے ہی بوڑھے جیون کی سانس گلے میں اٹک
کر رہ گئی۔ کانپتے ہاتھوں سے سر پہ پڑی ہوئی پرانی پھٹی ٹوپی
اُتار کر سپاہی کے قدموں میں رکھتے زمین پہ ایسے جھک گیا
جیسے کوئی عبادت گزار اپنے مالک کے حضور جھک جایا کرتا
ہے۔ "مجھے معاف کر دیں سرکار..... میں حالات کا مارا ہوا بے
حد غریب بندہ ہوں۔"

اپنے قدموں میں روتے بڑبڑاتے ہوئے سپاہی کو بیچ میں جیون پہ رحم آرہا تھا مگر وہ خود غربت کی چکی میں پسا ہوا تھا۔ اپنی پھول سی معصوم بچی کے علاج کی خاطر مجبور تھا ہر حال میں اسے پیسے درکار تھے اس لیے خفگی ظاہر کرتے ہوئے رعب جھاڑنے لگا۔

''مجھے صرف تمہارے جرم سے مطلب ہے۔ آج تیرا چالان ہر حال میں کر کے رہوں گا۔ یہ فضول بکواس کسی اور کو جا کر سنانا۔''

کئی پہروں زمین پہ پڑا ہوا جیون روتے سسکتے سپاہی کی منتیں کرتا رہا مگر یہ سب سنا ان سنا کر کے ایک ہی بات پر ڈٹا ہوا تھا جس کے پیچھے اپنی بیمار بیٹی کی تڑپ اس کے دل کو ایسے بے چین کیے ہوئے تھی جیسے جیون اپنے کنبے کی بھوک مٹانے کے لیے ہر وقت بے چین در بدر رہتا تھا۔ کوئی اور راستہ نہ دیکھ کر جیون کو اس بات کا پکا یقین ہو گیا کہ اس دنیا میں غریب کی زندگی کسی کے آگے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ سپاہی اس سے کیا چاہتا ہے تب مصیبت سے چھٹکارا پانے کی خاطر لرزتے ہاتھ سے جیب میں محفوظ کیے ہوئے سوا روپے کے سکون کو نکال کر ہتھیلی پہ رکھا اور آخری بار حسرت بھری نگاہ سے سوا روپے کے سکوں کو دیکھ کر مٹھی بند کرنے کے ساتھ آنکھیں بھی بند کر کے روتے سسکتے سپاہی کی جانب بڑھا کر کہنے لگا۔

''میرے سارے دن کی بس یہ ہی کمائی ہے، سپاہی نے پہلے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے جیون کے چہرے کو دیکھا پھر لرزتی ہوئی مٹھی کو تکا۔ اگلے پل اس کی آنکھیں چمک گئی مگر دل ہی دل میں وہ جیون سے زیادہ ڈرا ہوا تھا۔ ادھر اُدھر نظر گھما کر سپاہی نے پھرتی سے جیون کی مٹھی سے سکے اپنی مٹھی میں یوں قابو کر لیے جیسے کوا چیز اپنی چونچ میں قابو کر کے سب کی پہنچ سے دُور اُڑ جایا کرتا ہے۔ اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اب سپاہی نے شوخی سے آخری نظر روتے جیون پہ ڈالتے کہنے لگا تھا۔ ''چلو اب نکلو یہاں سے اس بار معاف کیا مگر آگے سے خیال رہے۔''

کسی لٹے ہوئے مسافر کی مانند پریشان حال جیون مزید پریشانیاں ساتھ لیے تانگے میں ایسے آبیٹھا جیسے اس نے بہت سی سواریوں کو ساتھ لیا ہو۔ اگلے لمحے گھوڑا ریت پہ کیڑے کی طرح کچھ فاصلے تک رینگتے رینگتے پھر ریل کی رفتار پکڑتا تیز ہوتا کچی پکی سڑک پر آگے بڑھنے لگا جس کے دونوں جانب پھیلے ہوئے گھپ اندھیرے میں جیون جیسے اور تاریکی میں گرجتا جا رہا تھا۔

''معصوم بچوں کو کیا منہ دکھاؤں گا؟ رامو کے لیے دُودھ کہاں سے لاؤں گا؟..... بیوی کو کیا بتاؤں گا جو شام سے دروازے کی چوکھٹ پہ آس لگائے بیٹھی ہو گی۔ کل سے بھوکے اس بے زبان کو کیا کھلاؤں گا؟ ایسے بہت سے سوال تھے جو جیون کے تانگے کے پیچھے شرارتی بچوں کی طرح دوڑتے ہوئے اس کے گھر تک آپہنچے تھے۔

سوا روپے کے سکے ہاتھ میں تھامے سپاہی اک طرف اپنی جیت پہ شادمان دکھائی دے رہا تھا تو دوسری طرف جاتے ہوئے تانگے کی کھٹ پھٹ کی آوازیں اس کا وجود یوں چھلنی کر رہی تھیں جیسے میداں جنگ میں دشمنوں کی زد میں آیا ہوا اکیلا سپاہی کئی وار سے گھائل ہو جائے۔ ایک لمحے کے لیے بہادر سپاہی سہم کر رہ گیا اور یہ محسوس کرنے لگا کہ یہ خستہ حال تانگے کی آوازیں نہیں پر اس بوڑھے جیون کی آہیں ہیں جو میرے کیے ہوئے ظلم پہ احتجاجاً گونج رہیں تھیں۔

''میں ایسا نہ کرتا تو اور کیا کرتا؟ کہاں سے لاتا پیسے میری معصوم بچی کا علاج کیسے ہوتا؟''

اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے وہ خود سے بڑبڑانے لگا۔ تب یکا یک معصوم بیٹی کا بے حال چہرہ اندھیرے میں یوں روشن ہو کر چمکنے لگا جیسے چاند بادلوں کی گرفت سے نکل کر روشن ہو جایا کرتا ہے۔ اپنے وجود کی پوری طاقت سمیٹ کر وہ

بڑے بڑے قدم اُٹھاتا گھر کی جانب روانہ ہو جاتا ہے اور جیسے ہی گھر کے صدر دروازے کے قریب پہنچتا ہے۔ اس کی ہمت سست پڑنے لگتی ہے۔ معصوم پھول سی بچی ایک بڑے کھٹولے پہ پسینے میں نہائی ہوئی بے سست لیٹی ہوئی تھی جسے دیکھ کر ڈرتے لرزتے اپنا ہاتھ جیسے بچی کے سر پہ رکھتا ہے تو ہاتھ اس کے پسینے میں بھیگ جاتا ہے۔ تب سپاہی کے من میں مچی ہل چل یوں تھم کر رہ جاتی ہے جیسے طوفان جاتے ہی سکون چھا جائے۔

''اللہ کا لاکھ شکر ہے اب بخار اُتر چکا ہے۔'' اپنے پیچھے سے آتی ہوئی بیوی کے الفاظ کان پڑتے ہی سپاہی مڑ کر اسے ایسی عجب نظر سے دیکھنے لگا جیسے زندگی میں پہلی بار دیکھ رہا ہو مگر اس سے بے خبر بنی بچی کے ماتھے کو چوم کر پر مسرت لہجے سے بات مکمل کرنے لگتی ہے۔ ''پڑوسن سے سلائی کے باقی پیسے لے کر دوا لے آئی تھی تب ہی تو فائدہ ہوا ہے''۔

''آہ'' یہ سن کر بہاری سپاہی سکھ سے بھری ٹھنڈی سانس لے کر پل بھر کے لیے آنکھیں بند کر لیتا ہے پھر سوا روپے کے سکوں کو نکال کر اک طرف رکھ دیتا ہے۔ ہاتھ بتی کی زرد روشنی میں وہی سکے ایسے چمکتے نظر آنے لگتے ہیں جیسے سچ میں سونے کے ہوں اور پھر ان سکوں کی چمک دمک اس تیزی سے بڑھنے لگتی ہے کہ اب سپاہی میں انھیں دیکھنے کی ہمت باقی نہیں رہتی۔ خوف کھاتے جیسے وہ آنکھوں کو بند کرتا ہے ضمیر کی آواز کانوں میں بازگزشت کرنے لگتی ہے۔

''آج تم نے اپنے مطلب کے لیے ایک غریب کے منہ کا نوالا چھینا ہے تم ظالم ہو پاپی ہو''۔

کانپتے ہوئے بہاری سپاہی نے جیسے آنکھیں پھر سے کھولیں تو چمکتے سکوں کے بجائے اب بوڑھے جیون کا روتا ہوا چہرہ اس کی نظروں کے سامنے اُبھر آیا جس کی صدائیں تانگے میں لٹکتی ہوئی لال ٹین کی طرح جھولتے پھڑ پھڑانے لگی تھیں۔

''سرکار تیل ختم ہو گیا...... بتی بجھ گئی زندگی کے جیون خون پسینہ...... مجھے معاف کرو۔ حضور دیا کرو''۔

بہاری سپاہی کی کیفیت عجب سے عجب تر ہوتی گئی کیونکہ آج اس نے اپنی زندگی کی تاریکی کو روشن کرنے کی خاطر بوڑھے جیون کے وجود کو اور تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا۔ وہ چار پائی پہ کروٹیں بدلتے ایسے تڑپنے لگتا ہے جیسے کوئی دمے کا مریض تڑپتا رہتا ہے۔ پھر وہ خود سے بڑبڑانے لگتا ہے۔

''نہیں نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا...... ہرگز نہیں ہوسکتا''

سوا روپے کے سکوں کو مٹھی میں قابو کر کے سپاہی ایک بار پھر سے اپنے وجود کی مکمل طاقت سمیٹ کر بڑے بڑے تیز قدم اٹھاتا اندھیرے کو چیرتا ہوا مزدور بستی کی جانب بڑھنے لگا تھا اور بوڑھے جیون کا گھر ڈھونڈتے وہ جیسے گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس پہنچا تو قدم وہیں خود بخود جم گئے اور آنکھیں حیرت غم سے پھٹی رہ گئیں۔ بوڑھا جیون اپنا سر دونوں گھٹنوں کے بیچ میں دیے اب تک سسک سسک کر روئے جا رہا تھا جس کے ساتھ ٹوٹی ہوئی کوٹھی کے اندر سے روتے ہوئے معصوم بچے کی آواز مل کر ماحول کو اور بھی زیادہ غمزدہ بنائے ہوئے تھی۔ بہاری سپاہی کے جمے ہوئے قدموں میں جنبش ہونے لگی ہے اور وہ خود کسی مجرم کی طرح سے چلتا بوڑھے کے قریب آ گیا پھر جیب سے سوا روپے کے سکے نکال کر اس کے قدموں میں رکھتے ہوئے خود بھی یوں جھک گیا جیسے کچھ دیر پہلے بوڑھا جیون منت سماجت کرتے ہوئے اس کے آگے جھکا تھا بوڑھے جیون نے سر اٹھا کر اپنے عین سامنے پھر سے سپاہی کو دیکھا تو بجلی کے کرنٹ والے جھٹکے کی طرح کانپ کر رہ گیا اور لرزتے صرف اتنا کہہ سکا۔

''مائی باپ! آپ؟!!''

جواب میں بہاری سپاہی کچھ نہ کہہ سکا بس دو گہرے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپک کر جیون کے قدموں میں آ گرے۔ یہ ہی وہ دو آنسو تھے جو اپنے اندر ایک انمول راز سمیٹے ہوئے تھے ایسا راز جس میں ایک غریب کے لیے دوسرے غریب کا پیار بھرا ہوا تھا۔

انگور کھٹے ہیں

محمد عثمان حمید

آپ نے بچپن میں ایک بہت مشہور زمانہ کہانی پڑھی ہو گی کہ ایک تھا لومڑ۔ اسے سخت بھوک لگی۔ وہ خوراک کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ جلد ہی اسے انگوروں کی ایک بیل نظر آئی۔ انگوروں کے گچھے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ لہٰذا اس نے ان انگوروں کو پانے کی کوشش شروع کر دی۔ انگور کافی اُونچائی پر تھے۔ وہ انھیں پانے کے لیے کئی بار اُچھلا لیکن ناکام رہا۔ آخر کار تنگ آ کر اُس نے جدوجہد چھوڑ دی۔ وہ دل برداشتہ ہو گیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ انگور کھٹے ہیں۔ جب پک جائیں گے تو آ کر کھاؤں گا۔ نتیجہ: انگور کھٹے ہیں۔

فی زمانہ صرف لومڑ کے لیے ہی نہیں انگور عام انسان کے لیے بھی کھٹے ہو چکے۔ مہنگائی کے اس دور میں انگور کھانا عام آدمی کے بس کی بات نہیں رہی۔ متوسط گھرانے اپنے بچوں کو شاید یہی کہتے ہوں کہ انگور ابھی کھٹے ہیں۔ جب میٹھے ہوں گے تو خرید لیں گے۔

انگور ایک پودے اور اس کے پھل کا نام ہے۔ یہ پودا بیل کی صورت میں اُگتا اور اس کا پھل گچھوں میں اُگتا ہے۔ ایک گچھے میں 6 سے لے کر 300 انگور کے دانے اُگ سکتے ہیں۔ مختلف زبانوں میں اس کے مختلف نام ہیں۔ اُردو میں انگور، عربی میں انب، گجراتی ہراکھ، بنگالی داکھ، لاطینی میں مائیتس، پشتو میں کوڑ، فارسی میں انگور، ہندی میں انگور اور انگریزی میں (Grapes) گریپ کہتے ہیں۔

انگور اکثر ممالک میں پایا جاتا ہے۔ ذائقہ کی وجہ سے ہر چھوٹے بڑے سے متعارف ہے۔ ذائقے اور رنگت کے لحاظ سے تین اقسام کا ہوتا ہے۔ رنگت میں سبز، زرد اور سیاہ اقسام میں پایا جاتا ہے۔ ذائقے کے لحاظ سے ترش میٹھا (یعنی کھٹا میٹھا) پایا جاتا ہے۔ بیج کے بغیر بہت میٹھے کو کشمش (میوہ) کہتے ہیں۔ ترش کو سوکھا کا نام دیا جاتا ہے اور کم میٹھے کو منقیٰ کہا جاتا ہے۔ خشک ہونے پر کئی سال تک خراب نہیں ہوتا۔

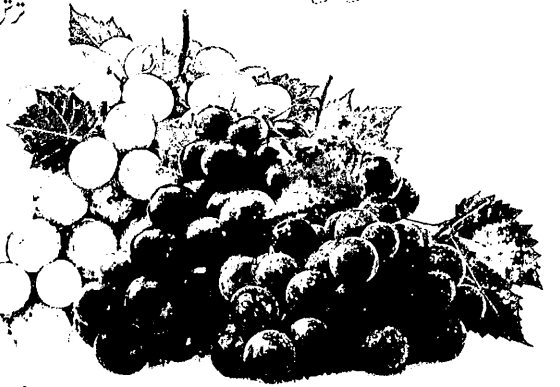

مقام پیدائش

دنیا میں اکثر مقامات پر کاشت کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں سرحد، بلوچستان، قندھار، افغانستان، آندھیر پردیش انڈیا میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ چین کا انگور اپنی خصوصیت

رس بھرے دیدہ زیب پھل کا نافع تذکرہ... جسے دیکھتے ہی جی للچا جاتا ہے

کے لحاظ سے خوش رنگت شیریں اور لذیذ ہوتا ہے۔ انگور کی کاشت کے لیے وہ علاقے زیادہ بہتر ہیں جہاں ہوا میں نمی کم رہتی ہو اور بارشیں بھی کم ہوتی ہوں۔ کیونکہ اگر ہوا میں نمی زیادہ ہو تو انگور پر پھپھوندی کا حملہ زیادہ ہوتا ہے جس سے پھل خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زیادہ بارشوں کی وجہ سے انگور کے گچھے پھپوندی کی وجہ سے گلنا شروع ہو جاتے ہیں، پھل پھٹ جاتا اور انگور پھیکے اور بدمزہ رہ جاتے ہیں۔

بلوچستان میں ایک روایت ہے کہ جب انگور کا گچھا بن جاتا ہے تو کاشتکار قرآن مجید لے کر باغوں میں بیٹھ جاتے اور تلاوت کر کے اللہ رب العزت سے دعا مانگتے ہیں کہ یا اللہ ہمارے باغات کو بارش سے محفوظ رکھنا۔

ارشادِ ربانی ہے: اور ہم نے اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور اس کے اندر سے چشمے پھوڑ نکالے، تاکہ یہ اس کے پھل کھائیں۔ (سورۂ یٰسین، 34)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے کشمش کا نبیذ بنایا جاتا تھا۔ آپ ﷺ اسے دن بھر پیتے اور دوسرے دن بھی پیا کرتے اور تیسرے دن بھی شام تک۔ پھر جو بچتا تو وہ خدمت گاروں کو پلایا جاتا یا بہا دیا جاتا۔ (سنن ابوداؤد، جلد سوم، کتاب الاشربہ، ص 137)

مزاج اور اقسام

انگور تازہ شیریں گرم تر، و خام سرد خشک اور منقی گرم خشک مزاج کا ہوتا ہے۔

اقسام کے لحاظ سے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) کشمش (۲) منقی (۳) کالا انگور۔

مقدار خوراک

ایک نارمل انسان ایک دن میں 125 گرام سے لے کر 250 گرام تک کھا سکتا ہے۔

خواص

مقوی قلب، ملین، مولد خون صالح، چستی اور جسم میں فربہ پن پیدا کرتا ہے۔ ایک مقوی غذا کی مانند ہے۔

انگور میں پائے جانے والے اجزا

پروٹین 1.8 فیصد، چکنائی 0.3 فیصد نمکیات 2.0 فیصد، فائبر 1.1 فیصد کاربوہائڈریٹس 74.8 فیصد، کیلشیم 87 ملی گرام، فاسفورس 80 ملی گرام، فولاد 7.7 ملی گرام وٹامن سی املی گرام توانائی 308 کلوریز۔

انگور مفرح، مقوی قلب

انگور کشمش اور منقیٰ مفرح قلب، مقوی قلب ہونے کے باعث خفقان اور ضعیف قلب میں مستعمل ہے۔ اس کی طاقت کا اثر ہمیشہ کے لیے قائم رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے خون میں گاڑھا پن پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میٹھا انگور اپنے اندر حرارت رکھتا ہے۔ یہ انجائنا، کولیسٹرول جیسے امراض پیدا نہیں ہونے دیتا۔

قبض کشا

قبض ایک نامراد مرض ہے جو آج کے معاشرے میں ستر فیصد عام اور عالمگیر حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ قبض نہ صرف آنتوں کو نقصان پہنچاتی ہے بلکہ دل، دماغ اور جگر میں بھی مختلف امراض کا باعث بنتی ہے۔ اس کا استعمال نہ صرف قبض کشا ثابت ہوتا ہے بلکہ آئندہ کے لیے ادویات کی حاجت نہیں رہنے دیتا۔ اس کا متواتر 1 سے 3 ماہ تک استعمال دائمی قبض کشا ہوتا ہے۔

مولد حرارت

اس کا مزاج صفراوی ہے۔ اس لیے یہ جسم میں حرارت کی کمی پوری کرتا ہے۔ حرارت کے بڑھنے کی وجہ سے جسم میں ہر قسم کے پیدا ہونے والے فساد کو ختم کرتا ہے۔ قوت مدافعت کو بڑھا کو جسم کولیسٹرول، توانا بناتا ہے۔ بیماری کے بعد پیدا ہونے والی کمزوری کو ختم کرتا ہے۔

مولد خون صالح

جگر صفراوی خزانہ ہے۔ جہاں کیموس آ کر خون کی شکل اختیار کرتا ہے۔ انگور سے جگر میں حرارت کا عمل بہتر ہو جاتا

ہے جس سے تازہ خون پیدا ہونے کا عمل سست نہیں ہوتا خون میں سرخی اور قوت کو بڑھاتا ہے۔ اس کا استعمال خون لگانے سے کئی درجہ بہتر ہے۔

درد شقیقہ

انگور آدھے سر کی درد شقیقہ میں بھی مفید پایا گیا ہے۔ اس کی کونپلیں لے کر لیپ کریں اور یہ لیپ صبح سورج طلوع ہونے سے قبل پیشانی پر لگایا جائے اور انگور کھانے کو دیے جائیں شفا ہوگی۔

خشک کھانسی

خشک کھانسی سے بلغم آسانی سے خارج نہیں ہوتی جس کی وجہ سے مریض بار بار کھانسی کرتا ہے۔ اس صورت میں بادام مغز ایک تولہ کو پیس کر تخم دی گولیاں بنائیں۔ ایک گولی بوقت ضرورت منہ میں رکھ کر چوستے رہیں انشاء اللہ کھانسی کو فائدہ ہوگا۔

قوت ہاضم

انگور ایک ایسا پھل ہے جو معدہ میں حرارت پیدا کر کے اس میں ہاضمہ کی قوت کو بڑھاتا ہے جس مریض کی غذا ہضم نہیں ہوتی اور بھوک کم لگتی ہو تو اس کو کھانے کے ایک گھنٹہ بعد مناسب مقدار میں خون کھانے کو دیں یہ شکایت رفع ہو جائے گی۔

گردوں کی بیماریاں

انگور میں پانی اور پوٹاشیم کی مقدار کافی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ منفرد قسم کی پیشاب آور صلاحیت رکھتا ہے چونکہ اس میں ایلیومن اور سوڈیم کا رائیڈ کی موجودگی بہت معمولی ہوتی ہے۔ اس لیے گردوں پر انگور کے استعمال کا برا اثر نہیں پڑتا۔ گردوں کی سوزش اور مثانے کی پتھریوں کے خاتمے کے لیے انگور بہترین غذائی علاج ہے۔

تھوک میں خون آنا

برگ انگور پیس کر بقدر سات گرام کھانا تھوک میں خون آنے کو روکتا ہے نیز معدی معدہ اور قبض دور کرتا ہے۔

تپ دق

تپ دق میں انگور کا رس آب حیات ہے ان کی کم ہو رہی قوت انگور کھانے سے پھر حاصل ہو جاتی ہے۔ ٹائفائیڈ بخار میں بھی انگور کا رس دیتے رہنے سے مریض کی قوت بحال رہتی ہے۔

بواسیر اور قوطوں کی سوزش

انگور کے پتوں کو سل پر پیس کر ان کی ٹکیہ بنا کر مسوں پر باندھ دی جائے تو بواسیر کو فائدہ ہوتا ہے اور درد بھی رک جاتا ہے۔ اسی طرح ان پتوں کو اگر قوطوں پر باندھ دیں تو ان کی سوزش ختم ہو کر درد بھی بند ہو جاتا ہے۔

سردی کا علاج

جن لوگوں کو سردی لگتی ہو انھیں 30 سے 35 دانے کشمش پانی میں دھو کر دودھ میں ابال کر کشمش کھا کر اوپر سے وہی دودھ پینے سے سردی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

دودھ کی کمی

دودھ پلانے والی مائیں اگر کالے انگور کا رس 100 گرام روزانہ استعمال کریں تو دودھ مناسب مقدار میں اتر آتا ہے جو بچے کی صحت کے لیے مفید ثابت ہوتا ہے۔

چھوٹے بچوں کی کمزوری

کالے میٹھے انگور کا رس ایک سے دو چمچے لے کر شہد خالص 4 .1 سے 2 / 1 چمچے ملا کر دیں۔ چھوٹے بچوں کے سوکھے کے مرض اور کمزوری میں مفید ہے۔

انگور کے بیجوں کے فوائد

جن لوگوں کو انگور پسند ہوتے ہیں ان میں سے اکثر کا خیال ہوتا ہے کہ بغیر بیج کے انگور زیادہ مزیدار ہوں گے لیکن آپ کو جان کر حیرانگی ہوگی کہ بیج والے انگور صحت کے لیے زیادہ مفید ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو ان کے فوائد کا علم ہو جائے تو اگلی بار آپ بازار سے صرف بیج والے انگور ہی

خریدیں گے۔ آیئے آپ کو انگور کے بیج کھانے سے صحت کو ملنے والے انگنت فوائد سے آگاہ کرتے ہیں۔

ڈپریشن کے لیے

2010ء میں کی جانے والی ایک تحقیق کے مطابق انگور کے بیجوں میں ایسے کمپاؤنڈ پائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے سیروٹین اور ڈوپامین کے لیول بڑھتے ہیں۔ دماغ کو سکون ملتا اور ڈپریشن میں کمی آتی ہے۔

اضافی وزن سے نجات

ہمارے جسم میں فاسد مادے اکٹھے ہونے سے وزن میں غیر ضروری اضافہ ہوتا ہے لیکن انگور کے بیج استعمال کرنے سے بڑھتے وزن پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

کینسر کے خلاف فائدہ

بعض اوقات ایسی بیماریاں جن میں دوائیوں سے مزید علاج معالجہ ممکن نہ رہے، اللہ کی عطا کردہ نعمتیں پھلوں کی صورت ایسی شفا عطا کرتی ہیں کہ انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

ان بیجوں میں موجود کمپاؤنڈز کی وجہ سے کینسر کے خلاف مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ کچھ تحقیقات کے ابتدائی نتائج میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ انگور کے بیجوں کی وجہ سے کینسر کم ہوتا ہے اور نئے کینسر کے خلیات نہیں بنتے۔

دل کی مضبوطی کے لیے

ایک تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ انگور کے بیجوں میں یہ خصوصیت موجود ہے کہ ان کے استعمال سے ہمارا بڑھا ہوا کولیسٹرول کم ہوتا اور دل کی شریانیں کھلتی ہیں۔ اس وجہ سے دل کی دھڑکن معتدل رہتی ہے اور ساتھ ہی دل کے دورے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔

جھریوں کے لیے

وقت گزرنے کے ساتھ انسان کی جلد پر جھریاں بننے لگتی ہیں اور بڑھاپے کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں لیکن اگر آپ انگور کے بیج کھائیں گے تو یہ امکانات کم ہونے لگیں گے۔ بڑھاپے سے بننے والی جھریوں کو روکا نہیں جاسکتا لیکن اس عمل کو سست کیا جاسکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انگور کے بیج انتہائی مفید ہیں۔ ماہرین صحت کا کہنا ہے کہ ان بیجوں میں وٹامن سی اور انٹی آکسیڈینٹس کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے جس کی وجہ سے بڑھاپا دیر سے آتا ہے۔

انگور کے پتوں کے فوائد

یورپ اور بہت سارے ایشیائی ممالک میں انگور کے سبز پتوں کو طویل عرصے سے مختلف تکالیف سے نجات کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مقامی انگور کے پتوں کے فوائد امریکیوں نے بیان کیے ہیں جن میں بہتے خون کو روکنے کا علاج بھی شامل ہے۔ اس کے پتوں سے بنی چائے کا استعمال بھی کیا جاتا ہے جس سے بدہضمی کی شکایت دُور ہوتی ہے۔ نیز اس کے پتوں کا لوشن گنٹھیا کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پتے وزن میں کمی اور جسم کی صفائی ستھرائی کی مصنوعات کے لیے بھی استعمال ہوسکتے ہیں۔ ان میں موجود فائبر خون میں شوگر کے اخراج کو طول دیتا ہے۔ یعنی اس کی بیل لگانے کے بے شمار فوائد ہیں۔ گھر کی خوبصورتی، تازہ پھل کی دستیابی، اور پتوں کو بطور جڑی بوٹی استعمال کرنا۔

تقریباً 300 برس قبل ہسپانویوں نے براعظم امریکا میں انگور متعارف کروائے، قبل ازیں وہاں انگور نہیں تھے۔ انگوروں کی آٹھ ہزار سے زیادہ اقسام ہیں۔ انگور کے ایک کپ میں 100 حرارے ہوتے ہیں۔ اس سے وٹامن ''کے'' اور ''سی'' کی دن بھر کی تقریباً چوتھائی ضرورت پوری ہوجاتی ہے۔

"آپ کی زکوٰۃ و عطیات نے بدل دیا مقدر"

کاروان علم فاؤنڈیشن کے مالی تعاون سے کم وسیلہ، یتیم اور معذور مگر باصلاحیت طلباء وطالبات اعلیٰ پیشہ وارنہ تعلیم حاصل کر کے اپنے خاندان کا سہارا بن رہے ہیں اور اس طرح قومی ترقی کے دھارے میں شامل ہو رہے ہیں

الحمدللہ **6,820** طلباء وطالبات کو اعلیٰ تعلیم کیلئے **-/177,449,015** روپے کے وظائف جاری کیے جا چکے ہیں جن میں **1189** یتیم اور **451** معذور طلبہ بھی شامل ہیں

اسکالرشپ حاصل کرنے والے طلباء وطالبات کی تعداد اور شعبہ جات کی تفصیل

میڈیکل
- ایم بی بی ایس 1568
- بی ڈی ایس 64
- ڈاکٹر آف فزیوتھراپی 65
- ڈی وی ایم 136
- ڈی فارمیسی 121
- ہیلتھ سائنسز 45

انجینئرنگ
- بی ایس سی انجینئرنگ 1638
- بی ٹیک 24
- ڈپلومہ ایسوسی ایٹ انجینئرنگ 167

کمپیوٹر سائنسز
- بی سی ایس آئی ٹی 75
- آئی سی ایس 25

سائنسز
- ایم ایس سی 176
- بی ایس آنرز 1038
- ایف ایس سی 713

مینجمنٹ
- ایم بی اے ایم پی اے 66
- بی بی اے 77

کامرس
- اے سی سی اے سی اے 28
- ایم کام 41
- بی کام آنرز 164
- آئی کام 57
- ڈی کام 65

سوشل سائنسز
- ایم فل 26
- ایم اے 147
- بی اے آنرز 64
- بی اے 87
- ایف اے 114

تعلیم و تدریس
- ایم ایڈ 10
- بی ایڈ آنرز بی ایڈ 44
- بی ایس ایڈ 13

قانون
- ایل ایل بی 22

زکوٰۃ و عطیات دیجیے علم و ہنر سے آراستہ روشن اور باوقار پاکستان کے لئے!

آپ کے تعاون کے منتظر

ایس۔ ایم۔ ظفر (سرپرست) | مجیب الرحمٰن شامی (چیئرمین) | غلام احمد بمبل (سینئر وائس چیئرمین) | شکیلہ لقمان (وائس چیئرمین) | ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی (سیکرٹری جنرل) | ایوب صابر اظہار (سیکرٹری فنانس) | احسان اللہ وقاص (رکن مجلس عاملہ)

کاروان علم فاؤنڈیشن

Meezan Bank میزان بنک سمن آباد، لاہور پاکستان اکاؤنٹ نمبر 0240 0100882859

گھر سے عطیات کی وصولی کے لئے رابطہ

لاہور: مہدی رضا **0300-1103344** اسلام آباد: کلیم اللہ چوہدری **0300-1104455**

مکان نمبر 604، بلاک سی، (نزد شوقی چوک) فیصل ٹاؤن لاہور۔

فون: **0321 846 1122, 0333 846 1122** وٹس ایپ نمبر: **0300 110 3030**

کاروان علم فاؤنڈیشن تمام متعلقہ حکومتی اداروں سے باقاعدہ رجسٹرڈ فلاحی ادارہ ہے لہٰذا آپ مکمل اطمینان اور اعتماد سے اپنی زکوٰۃ و عطیات ارسال کر سکتے ہیں

کاروان علم فاؤنڈیشن کو دیے گئے عطیات کی رقوم پر حکومت پاکستان کی طرف سے ٹیکس استثنیٰ دیا گیا ہے Tax Exemption # 3952155

کاغذ ہے پیرہن

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

اخبار بڑے کام کی چیز ہے۔ اس سے آپ مکھی، مچھر، اُڑا اور مار سکتے ہیں۔ نلکی بنا کر لاؤڈ اسپیکر کے طور پر بھی استعمال کر لیجیے۔ اس نلکی سے بچوں کی تہذیب اور تادیب میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اخبار کو آپ بارش اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے چھتری کے طور پر برت لیجیے۔ اس میں اشیائے خوردنی بھی لپیٹی جاسکتی ہیں۔ بچھا کر حسب موقع بیٹھ یا لیٹ سکتے ہیں۔ یہ دسترخوان کا کام بھی دیتا ہے۔ اس سے منہ پونچھنے میں کوئی حرج نہیں۔

سردیوں میں اس سے آگ تاپی جاسکتی ہے۔ گرمیوں میں پنکھا جھل سکتے ہیں۔ ردّی میں بیچ کر رقم حاصل کر لیجیے۔ حتیٰ کہ اسے مالکان کی پالیسیوں کے خلاف بطور احتجاج نذر آتش کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ ہم اخبار خریدتے ہی اس لیے ہیں کہ اسے مختلف انداز میں استعمال کریں۔ اتنی کثیر الاستعمال شے ہم نے کوئی اور نہیں دیکھی۔

بعض حضرات البتہ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ اخبار کا ایک اور استعمال بھی ہے..... اور وہ ہے مطالعہ! اس پر ہمیں از حد حیرانی ہوتی ہے۔ اگر اخبار صرف پڑھنا ہی ہے تو خریدنے کی کیا ضرورت؟ یہ کام تو پڑوس کے اخبار سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ اخبار بینی کی لت انگلستان میں نشے کی طرح ہے کہ ہر انگریز کو اخبار خریدنے کا چسکا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارا ملک بڑی حد تک اس لعنت سے محفوظ ہے۔

اوّل تو بہت کم لوگ اخبار پڑھتے ہیں اور پڑھیں بھی تو اڑوس پڑوس سے مانگ تانگ کر، نائی کی دکانوں پر، کتب خانوں میں اور بسوں ریل گاڑیوں میں ایک دوسرے کے کندھوں کے اُوپر سے اُچک اُچک کر پڑھتے ہیں۔ معدودے چند لوگ اخبار خرید کر پڑھنے کی علت میں مبتلا ہیں۔ وہ جب تک صبح سویرے تازہ اخبار کے درشن نہ کر لیں ان کے حلق سے ناشتا نہیں اُترتا۔ زندگی میں کچھ کمی کا احساس ہوتا ہے اور سارا دن وہ پژمردہ اور ملول رہتے ہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ یہ اخبار میں پڑھتے کیا ہیں..... اس میں ہوتا ہی کیا

مصنف ایک عام چیز کے وہ پہلو سامنے لائے ہیں جن تک عموماً نظریں پہنچ نہیں پائیں

ہے؟

مثلاً صفحہ اوّل کو لیجیے۔ اس پر چند تصویریں اور چند سرخیاں ہوتی ہیں۔ یہ تصویریں یا تو کسی خوبصورت کھلاڑی کی ہوں گی یا بدصورت سیاستدانوں کی، جنہیں دیکھ کر وہی خوش ہو سکتے ہیں جن کی تصویریں چھپی ہیں۔ بعض اوقات کھدی ہوئی سڑکوں، اُبلتے ہوئے گٹروں، کوڑے کے انبار سے بند گلیوں اور پانی سے محروم نلکوں کی تصاویر بھی اخبار کی زینت بنتی ہیں لیکن یہ سب کچھ تو آپ اپنے محلے میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے اخبار پڑھنے کی کیا ضرورت؟ باقی رہیں سرخیاں! وہ ان بیانات پر مشتمل ہوتی ہیں جو سیاست دان، سرکاری افسر اور وزراء عوام کی تفریحِ طبع کے لیے دیتے رہتے ہیں۔

اخبار میں مزاحیہ کالم بھی ہوتا ہے کچھ قارئین ہنسنے ہنسانے کے لیے اس کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یوں درج بالا بیانات سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ ان خبروں کو صرف محکمۂ اطلاعات کا عملہ ہی کسی قدر توجہ سے پڑھتا ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ انھیں اس کام کے پیسے ملتے ہیں۔

اکثر کسی اداکارہ کی ساتویں یا آٹھویں شادی کی خبریں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ان میں سابقہ شوہر اور جملہ امیدوار ہی دلچسپی لے سکتے ہیں۔ باقی رہ گئیں قدرتی آفات اور حادثات جیسے بارش، سیلاب، بجٹ، انتخابات، جرائم وغیرہ کی خبریں، تو جناب! بہت سے ہوشیار مدیر ایک ہی حادثے یا واقعہ کی تصویریں سارا سال اول بدل کر چھاپتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال اگر موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے ٹھنڈی سڑک پر پانی جمع ہو گیا تھا اور اس کی تصویر فائل میں موجود ہے، تو اس سال بوندا باندی شروع ہوتے ہی یہ تصویر صفحہ اوّل پر نظر آئے گی۔ دراصل مدیر کو علم ہے کہ ٹھنڈی سڑک پر گندے پانی کے نکاس کا نظام ناقص ہے اور موسمِ برسات میں وہاں پانی ضرور جمع ہو گا اور پھر یہی تصویر اگلے سال سچ مچ کے سیلاب کے موقع پر بھی کام آئے گی۔

حادثاتی خبروں کے علاوہ اخبارات کی محبوب خبریں برطانیہ کے شاہی خاندان کے رازہائے دروں سے متعلق ہوتی ہیں۔ اگر کسی شاہی شخصیت کو چھینک بھی آ جائے، اس کی خبر سیاہ چوکھٹے میں شائع ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی تصویر ہوتی ہے "شہزادی فلاں چھینک مارتے ہوئے۔" اگر یہ خبریں نہ ہوں تو آپ حالات حاضرہ سے افسوسناک حد تک ناواقف رہیں گے۔

اب وہ صفحہ کھولیے جس پر اداریہ شائع ہوتا ہے۔ یہ بات تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ اداریہ پڑھنے کی چیز نہیں۔ اسے کوئی قاری نہیں پڑھتا یہاں تک کہ خوش نویس بھی اسے بغیر پڑھے کتابت کر دیتا ہے۔ اسے علم ہے کہ ہر اداریے کا موضوع، لہجہ، متن اور الفاظ تک بعینہٖ وہی ہوں گے جو روزِ اوّل سے چلے آ رہے ہیں۔ بعض ماہر اداریہ نویس تو فرصت میں مہینے بھر کے اداریے ایک ساتھ لکھ ڈالتے ہیں۔ روز روز بور ہونا کون پسند کرتا ہے؟ اب سوال یہ ہے کہ اداریہ چھاپنے کا مقصد آخر کیا ہے؟ اس کا جواب سیدھا سادہ سا ہے۔ اگر اداریہ نہ چھاپا جائے تو خالی جگہ بہت بُری لگے گی۔

اخبار میں ایک اور کالم "یہ ہفتہ آپ کے لیے کیسا رہے گا" بھی شائع ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے چار سالہ "ولی عہد" کی قسمت کے حالات معلوم کرنا چاہے تو مندرجہ ذیل تحریر نظر آئی:

"آپ کا ستارہ مریض اس وقت زہرہ سے عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ یہ بات زحل کو سخت ناگوار گزرے گی چنانچہ وہ مریض پر دھاوا بول سکتا ہے۔ اس کے نتیجے میں آپ کے حالات دگرگوں ہو جائیں گے۔ کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ بچوں کی صحت خراب رہے گی۔ نمازیں قضا کریں گے۔ بیوی سے ناچاقی کا امکان ہے۔ والدین سے اختلافات ہونے کا اندیشہ ہے۔ حادثے کا خطرہ ہے۔

لیکن اگر مشتری، مریض کی مدد کو آ گیا، تو پھر وارے نیارے ہوں گے۔ دھن برسنے لگے گا۔ علم و ادب کی طرف

رجحان رہے گا۔ آپ بیرونِ ملک سفر کریں گے۔ کنوارے ہیں تو شادی ہوجائے گی اور شادی شدہ ہیں تو دوسری شادی ہو جائے گی بلکہ تیسری کا بھی امکان پیدا ہوسکتا ہے۔

البتہ قمر کا زوال آپ پر زوال لاسکتا ہے۔ ادھر پلوٹو کی شمس سے ناچاقی ہوگئی ہے۔ ادھر عطارد مریخ کے گھر میں ہے۔ خود زہرہ خدا جانے کہاں ہے؟ اگر یہ وضع فلکی یونہی قائم رہی تو آپ کا اللہ ہی حافظ ہے۔ اتوار اور پیر نحس ہیں۔ منگل بدھ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ جمعرات اور جمعہ بس یونہی سے ہیں۔ ہفتہ کوئی خاص نہیں۔ بیوی بچوں کی صحت کا خیال رکھیں۔ جیب کتروں سے ہوشیار رہیں۔

وہ تو خیریت گزری کہ ہمارے چار سالہ بچے کو اس درہم برہم قسم کے نظامِ فلک کی اطلاع نہ مل سکی اور وہ ستاروں کے اشاروں پر نہ چل سکا ورنہ بڑی تباہی پھیلتی اور وہ ہفتہ صاحب زادے کی سوانح عمری کا ایک ناقابلِ فراموش باب بن جاتا۔

اب اگر اخبار میں یہی کچھ ہوتا ہے تو لوگ اسے کیوں پڑھتے ہیں؟ اس ضمن میں ہر شخص اخبار بینی کی مختلف وجوہ رکھتا ہے۔ کچھ لوگ محض اس لیے مطالعہ کرتے ہیں کہ بین الاقوامی سیاست اور اقتصادیات کے ان مسائل پر خون کھولا سکیں جن کے بارے میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بحث کرنے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ حضرات کی اخبار بینی محض فلموں کے اشتہار دیکھنے تک محدود ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہوجانے کے بعد کہ فلم 'جٹ دا پتر' کون سے سینما میں چل رہی ہے، اخبار اُن کے لیے کاغذ کا ایک لمبا چوڑا بے کار ٹکڑا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ فلم دیکھنے کے دوران پکوڑے یا گنڈیریوں کی پلیٹ کا کام دیتا ہے۔

بعض باذوق حضرات فلمی صفحے پر بھی نظر کرم ڈالتے اور عمر رسیدہ ہیروئن کو تو ندیل ہیرو کے پہلو میں دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ ایک صاحب دل صرف یہ جاننے کے لیے اخبار پڑھتے ہیں کہ کہیں ادا کارہ آنسہ دلآرام کی شادی تو نہیں ہوگئی؟ اور یہ معلوم کر کے ان کے دل کو آرام آجاتا ہے کہ موصوفہ ہنوز کنواری ہیں۔ سماج سدھار تحریک سے وابستہ ایک بزرگ یہ دیکھنے کے لیے اخبار پڑھتے ہیں کہ کہیں اس میں کوئی ایسی خبر یا تصویر تو شائع نہیں ہوگئی جس سے بچوں اور نوجوانوں کے اخلاق کو ناقابلِ تلافی ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہو، چنانچہ وہ کن انکھیوں سے تصویر دیکھتے اور لاحول پڑھتے جاتے ہیں۔

لاحول تو خیر ہم بھی پڑھتے ہیں لیکن ان لوگوں پر جو اخبار پڑھ کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں اور اخبار کے صحیح استعمال سے واقف نہیں۔

خواتین کا صفحہ بھی اخبار میں چھپتا ہے۔ اس صفحے پر ایک بڑی سی رنگین تصویر ہوگی جس میں میک اپ سے لتھڑی ہوئی ایک بی بی دانت نکوس رہی ہوں گی۔ ان محترمہ کے انٹرویو میں لکھا ہوگا کہ انھیں وقتاً فوقتاً خدمتِ خلق کا دورہ پڑتا ہے اور علاج کے لیے مجبوراً اخبارات میں تصویر اور خبر دینا ہوتی ہے۔ قصابوں کی عالمی کانفرنس ہو یا شوقیہ حلق پھاڑنے والوں کا مقابلۂ موسیقی، فیتہ کاٹنے کے لیے اس سوشل ورکر خاتون کو بلایا جاتا ہے۔ معزز خاتون کو بالعموم کھانا پکانے کا شوق ہوتا ہے۔ جس کا خمیازہ ان کے اہلِ خانہ کو اکثر بدہضمی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ کھانے میں تھالی کا بینگن اور پکانے میں ٹینڈے گوشت پسند ہیں۔ باورچی کے سر پر کھڑی ہو کر نہایت عمدہ اور نذیذ ٹینڈے گوشت پکواتی ہیں۔ کپڑوں میں بے تکا پاجامہ اور ریزی نما ڈوپٹا اچھا لگتا ہے۔ پھولوں میں گوبھی کا پھول اور رنگوں میں چیک بک کا رنگ پسند ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ سوشل ورک کے بعد بقیہ زندگی سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں پر یادِ الٰہی میں گزار دیں۔

اب اگر آپ اس بصیرت افروز انٹرویو سے محروم رہ جائیں تو واللہ کتنی بڑی نعمت سے تہی دامن رہ جائیں گے! یہ انٹرویو آپ کی فہم و دانش کو دو چند کرتا ہے، اس کا ہر ہفتہ شائع ہونا ضروری ہے۔ بس تصویر اور خاتون کا نام تبدیل کر دیے جاتے ہیں تاکہ آپ یکسانیت کی وجہ سے بیزار نہ ہوجائیں۔

غیر ملکی ادب

فرینک اوکانر، حسن ہاشمی

شیشہ

جنگ عظیم جاری تھی۔ میرے ڈیڈی فوج میں تھے۔ اُنھیں اکثر و بیشتر محاذ پر رہنا پڑتا۔ گھر آنے کی نوبت گاہے گاہے آتی۔ جنگ کے زمانے میں اُنھیں میں نے بہت کم دیکھا۔ کبھی کبھار دیکھا بھی تو اس طرح کہ سوتے سوتے میری آنکھ کھل جاتی اور خاکی وردی والا ایک لمبا تڑنگا شخص مجھ پر جھکا ہوتا۔ ڈیڈی مجھے پیار کرنے کے لیے مجھ پر جھکتے تھے۔ اُن کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ رات گئے آتے۔ اُن کے فوجی بوٹ کی کھٹ کھٹ سے میری آنکھ کھل جاتی یا کبھی کبھی اُن کے آنے کی خبر مجھے صبح ہوتی۔ میں سو کر اُٹھتا تو ڈیڈی کو ممی کے پلنگ پر سوتا ہوا دیکھتا۔ ممی اُس وقت ناشتا تیار کرنے کے لیے باورچی خانے میں ہوتیں۔ میرے ڈیڈی کا گھر آنا جانا ہمیشہ پُراسرار رہا مگر اُن کے آنے سے مجھے خوشی ہوتی تھی حالانکہ ممی کا پلنگ خاصا بڑا تھا اور صبح سویرے میں اپنے کمرے سے نکل کر ممی کے ساتھ لیٹ جاتا تھا۔ ڈیڈی کے آنے کے بعد پلنگ کی گنجائش کم ہو جاتی تھی اور میں اُن دونوں کے درمیان پھنس کر رہ جاتا تھا۔

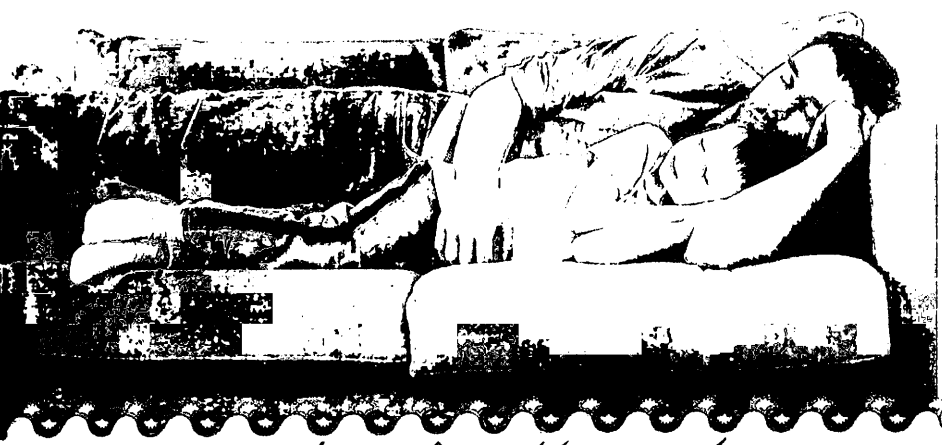

ایسے معصوم شکوہ کناں کی کہانی جس کا کوئی رازداں نہ تھا

ڈیڈی تمباکو نوشی کے عادی تھے۔ اُن کی سانسوں سے تمباکو کے بھبکے اُٹھتے تھے، میں پریشان ہو جاتا تھا۔ اُن کے کھردرے ہاتھ اور ڈاڑھی کے نوکیلے بال بھی مجھے اچھے نہیں لگتے تھے لیکن ڈیڈی جب بھی آتے، بہت ساری چیزیں لاتے۔ کھلونے، تمغے، گورکھا چاقو اور دوسرے تحائف۔ یہ سب چیزیں میرے کھلونوں کی الماری میں محفوظ ہو جاتیں۔

جنگ کا زمانہ میرے لیے بہت پُرسکون تھا۔ میرے کمرے کی کھڑکی مشرق کی طرف کھلتی تھی۔ ممی نے کھڑکیوں پر دبیز پردے ڈال رکھے تھے لیکن میری آنکھ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ کھل جاتی اور میں بستر سے بہت ہشاش بشاش اُٹھتا۔ کچھ دیر تک میں اُن کاموں کے متعلق سوچتا رہتا جو مجھے دن بھر میں کرنے ہوتے۔ ہمارے ہاں کوئی ملازم نہیں تھا لہٰذا مجھے ممی کے کاموں میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی یہ کام مجھے بہت ناگوار گزرتے تھے، پوری بلڈنگ میں صرف ہمارے گھر میں کام کرنے والا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ میں نے بارہا ممی سے نوکر رکھنے کے لیے ضد کی مگر ممی کا کہنا تھا کہ نوکر کو تنخواہ دینے کے لیے اُن کے پاس پیسے نہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ دوسرے کاموں کے لیے ممی کے پاس پیسے کہاں کہاں سے آجاتے ہیں۔

ممی میرے جاگنے کے بعد ہی بستہ چھوڑتی تھیں۔ پھر وہ اُٹھ کے ناشتا تیار کرنے لگتیں۔ ناشتے کے بعد ہم روزانہ چرچ جاتے اور ڈیڈی کے لیے دُعا کرتے پھر سودا سلف لے کر گھر آجاتے۔ کسی روز کچھ وقت مل جاتا تو ممی مجھے اپنی کسی سہیلی کے ہاں لے جاتیں اور اگر موسم خوشگوار ہوتا تو ہم باغ میں چہل قدمی کرنے چلے جاتے۔

ہر رات سونے سے پہلے میں دُعا کرتا کہ اے خدا! ڈیڈی کو جلدی سے گھر بھیج دے۔ یہ دعا مجھے ممی نے سکھائی تھی۔

ایک صبح میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ڈیڈی ہمیشہ کی طرح پُراسرار طور پر موجود ہیں۔ اُس روز ڈیڈی خاکی وردی کے بجائے نہایت خوبصورت نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ممی بہت زیادہ خوش نظر آرہی تھیں۔ نہ معلوم اس میں خوشی کی کیا بات تھی، مجھے تو ڈیڈی خاکی وردی کے بغیر کچھ زیادہ اچھے دکھائی نہیں دیے۔ ممی ہنستی مسکراتی ہوئی گھر بھر میں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ اُنھوں نے مسرت بھرے لہجے میں مجھے بتایا کہ

''لیری! خدا نے ہماری دُعا سُن لی۔ تمہارے ڈیڈی جنگ سے واپس آگئے ہیں۔''

گھر کے کام کاج نمٹا کے ہم لوگ چرچ گئے۔ وہاں ہم نے جنگ سے ڈیڈی کی بحفاظت واپسی پر خدا کا شکر ادا کیا۔

چرچ سے لوٹ کے ڈیڈی اور ممی آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ ڈیڈی زیادہ بول رہے تھے۔ ممی اُن کی بے سروپا باتیں بڑے غور سے سُن رہی تھیں۔ ممی کا یہ انہماک مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے ڈیڈی کی گفتگو میں دخل اندازی کرنا چاہی۔

''لیری بیٹے! کچھ دیر خاموش رہو۔''

ممی نے پیار سے مجھے سمجھایا۔ یہ الفاظ ممی عموماً کسی غیر دلچسپ مہمان کے سامنے کہا کرتی تھیں، اس لیے میں نے خاموشی کے بجائے گفتگو جاری رکھی۔

''لیری! خاموش رہو۔''

ممی نے بے چینی سے پہلو بدل کر نسبتاً سخت لہجے میں کہا:

''دیکھ نہیں رہے ہو، میں تمہارے ڈیڈی سے باتیں کر رہی ہوں۔''

یہ جملہ میں نے ممی کے منہ سے پہلی بار سُنا تھا۔ ''دیکھ نہیں رہے؟ میں تمہارے ڈیڈی سے باتیں کر رہی ہوں''۔ میرے دل میں فوراً خیال آیا کہ اگر ہماری دعا کا یہی اثر ہے تو خدا نے ہماری دعا دھیان سے نہیں سنی۔ میں نے بھی لہجہ بدل کر سوال کیا:

''آپ ڈیڈی سے باتیں کیوں کر رہی ہیں؟''

''ہم بہت ضروری گفتگو کر رہے ہیں۔ تم خاموش رہو یا جاؤ، جا کر کھیلو۔'' ممی نے فیصلہ صادر کر دیا۔

شام کو ممی کے کہنے سے ڈیڈی مجھے بازار گھمانے نکلے۔ ممی مجھے ہمیشہ باغ میں لے جاتی تھیں۔ اس تبدیلی سے مجھے خوشی ہوئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری اور ڈیڈی کی دلچسپیوں میں بے حد تضاد ہے۔ اُنھیں بازار کی رونق، دوڑتی بھاگتی گاڑیوں اور جلتی بجھتی روشنیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اُنھیں جگہ جگہ اپنے ہم عمروں کے ساتھ کھڑے ہو کر باتیں بنانے میں لطف آتا تھا۔ میں نے اُنھیں ایسا کرنے سے روکنا چاہا تو اُنھوں نے مجھے ہاتھ سے پیچھے دھکیل دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا بور ہوتا رہا۔

شام کی چائے پر ممی اور ڈیڈی کی ضروری گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ ڈیڈی بازار سے اخبار خرید لائے تھے۔ وہ کبھی اخبار پڑھتے، کبھی ممی سے گفتگو کرنے لگتے۔ ممی فوراً اُن کی طرف متوجہ ہو جاتیں۔ میں اُنھیں کوشش کے باوجود اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکا پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری، کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ میری بار بار کی دخل اندازی پر ممی نے جھنجھلا کر کہا:

''لیری! جب ڈیڈی اخبار پڑھ رہے ہوں تو تمھیں خاموش رہنا چاہیے۔''

مجھ پر واضح ہو گیا کہ ممی میرے مقابلے میں ڈیڈی سے گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں یا وہ ڈیڈی سے اتنی خوفزدہ ہیں کہ اُن کے سامنے مجھ پر توجہ دینا نہیں چاہتیں۔

رات کو ممی مجھے میرے کمرے میں سلانے آئیں۔ میں نے اُن سے دریافت کیا:

''ممی! اگر میں دعا مانگوں کہ اے خدا! ڈیڈی کو واپس جنگ پر بھیج دے تو کیا وہ بھیج دے گا؟''

ممی کچھ دیر خاموش رہیں پھر اُنھوں نے مسکرا کر کہا:

''نہیں''۔

''کیوں نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ اب جنگ نہیں ہو رہی ہے۔''

''لیکن ممی! آپ تو کہتی ہیں کہ خدا ہر کام کر سکتا ہے، اگر وہ چاہے تو کیا جنگ دوبارہ شروع نہیں کر سکتا؟''

''وہ چاہے تو شروع کر سکتا ہے مگر وہ چاہے گا نہیں۔''

اُنھوں نے میرا گال تھپتھپایا۔ ''جنگ خدا نہیں کراتا، بُرے لوگ کراتے ہیں۔''

''اگر خدا جنگ نہیں کراتا تو بُرے لوگ کیوں کراتے ہیں؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا: ''کیا بُرے لوگ خدا سے بڑے ہوتے ہیں؟'' ممی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے نا اُمیدی سے چُپ سادھ لی۔

میں حسب معمول صبح سویرے اُٹھا اور ممی کے کمرے میں چلا گیا۔ ممی اور ڈیڈی سوئے ہوئے تھے۔ مجھے فوراً اُن دونوں کے درمیان گھسنا پڑا۔ ممی ایک کنارے سکڑی سمٹی لیٹی تھیں اور ڈیڈی نے اپنے حصے سے زیادہ بستر پر قبضہ جما رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اپنے لیے خاطر خواہ جگہ کیسے نکالوں۔ میں نے ڈیڈی پر دو چار لاتیں چلائیں، وہ غراتے ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ میں اپنے لیے جگہ بنا کر اطمینان سے انگوٹھا چوسنے لگا۔ بستر کی گرمی نے مجھے بہت آرام پہنچایا۔ چند لمحوں بعد میں نے ممی کو آواز دی۔ ''ممی! ممی!''

''شش! ڈیڈی کو مت جگاؤ۔'' ممی نے اُٹھ کر مجھے خاموش کر دیا۔

ممی، ڈیڈی سے گفتگو کرتے وقت مجھے نظر انداز کرتی تھیں مگر یہ بات مجھے اُس سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ممی سے گفتگو کیے بغیر دن شروع ہو سکتا ہے۔ میں نے اُن سے پوچھا: ''کیوں ممی؟''

''بے چارے ڈیڈی تھکے ہوئے ہیں۔'' اُنھوں نے سرگوشی کی۔

''بے چارے ڈیڈی''۔ ممی کے منہ سے مجھے یہ جملہ قطعی

پسند نہیں آیا۔ میں نے اُن کی ہدایت سُنی ان سُنی کر کے کہا:

''کیا آپ کو یاد ہے، آج مجھے آپ کے ساتھ کہاں جانا ہے؟ آج میں آپ کے ساتھ دریا کنارے چل کے مچھلیاں پکڑوں گا۔ آپ نے کہا تھا نا کہ دریا سے لوٹ کے آج ہم مچھلیاں پکائیں گے۔''

ممی نے میری بات کا جواب نہیں دیا، میرے منہ پر ہاتھ رکھ کے کہنے لگیں:

''ڈیڈی کو مت جگاؤ۔''

مگر ڈیڈ جاگ چکے تھے۔ اُن کے گلے سے غراہٹ نکلی اور وہ ماچس تلاش کرنے لگے، پھر اُنھوں نے آنکھیں پھاڑ کے غور سے گھڑی دیکھی۔ ممی نے بڑے نرم لہجے میں اُن سے پوچھا:

''چائے پیو گے ڈیئر؟''

''چائے؟'' ڈیڈی نے حیرت سے کہا: ''ابھی کیا وقت ہوا ہے۔''

میں بیچ میں بول پڑا:

''اُٹھ جائیے ڈیڈی! چائے پی لیجیے۔ میں چائے پی کے مچھلیاں پکڑنے جاؤں گا۔''

میں نے بہت اُمید سے ممی کی طرف دیکھا۔

''خاموشی سے سو جاؤ لیری!'' ممی نے مجھے زور سے ڈانٹا۔ مجھے رونا آ گیا۔

ڈیڈی نے کچھ نہیں کہا۔ اُنھوں نے خاموشی سے پائپ سُلگایا اور کمرے میں دھواں بکھیرنے لگے۔ وہ خاموشی سے پائپ پی رہے تھے، میری یا ممی کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔

میں ممی سے اکثر ضد کرتا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ سلائیں۔ وہ کہتی تھیں کہ نہیں، ایک بستر پر سونا صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں سوچنے لگا کہ یہی بات اُنھوں نے ڈیڈی سے کیوں نہیں کہی۔

ڈیڈی پائپ پیتے پیتے اُٹھے اور باورچی خانے میں چلے گئے۔ وہاں اُنھوں نے چائے بنائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ممی کے لیے تو چائے لائے لیکن میرے لیے نہیں۔ مجھے غصہ آ گیا۔

''ممی!'' میں نے چیخ کر کہا:

''میں بھی چائے پیوں گا۔''

''تم میرے ساتھ پی لینا۔'' ممی نے کہا۔

یہ بات مجھے بہت بُری لگی، میں ممی کی چائے میں حصہ کیوں بٹاتا؟ مجھے میرے گھر میں برابر کا حق ملنا چاہیے تھا۔ میں سوچنے لگا۔ ڈیڈی اور میں ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم دونوں میں سے ایک کو اس گھر سے جانا پڑے گا۔ میں نے جھنجھلاہٹ میں ممی کی تمام چائے پی لی لیکن اُنھوں نے تحمل مزاجی سے کام لیا، کچھ نہیں کہا۔

رات کو ممی مجھے سلانے آئیں۔ اِدھر اُدھر کے دو ایک جملوں کے بعد اُنھوں نے آہستگی سے کہا:

''لیری! میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔''

''کیا؟'' میں نے دریافت کیا۔

ممی بولیں:

''وعدہ کرو کہ تم صبح صبح آ کے بے چارے ڈیڈی کو پریشان نہیں کرو گے؟''

پھر وہی بے چارے ڈیڈی۔ دو ہی دنوں میں ممی کی تمام ہم دردیاں اُن کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ مجھے غصہ آنے لگا۔

''کیوں ممی؟''

''تمہارے ڈیڈی پریشان اور تھکے تھکے رہتے ہیں، اُن کے لیے سونا بہت ضروری ہے۔ تمہارے آنے سے اُن کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔''

''لیکن ممی! ڈیڈی پریشان اور تھکے تھکے کیوں رہتے ہیں؟''

''اس لیے کہ جب وہ جنگ پر تھے تو ہمارے لیے خرچہ بھیجتے تھے۔ اب جنگ ختم ہو جانے سے اُن کی ملازمت بھی ختم

ہوگئی ہے۔ خرچا نہیں آئے گا تو ہم گزارا کیسے کریں گے؟ تمہارے ڈیڈی کے لیے ضروری ہے کہ وہ محض ہمیں آرام پہنچانے کی خاطر باہر جاکے کام کریں اور باہر جاکے کام کرنے کے لیے اُن کی نیند پوری ہونا ضروری ہے۔''

صبح میری آنکھ کھلی تو ممی کی باتیں مجھے یاد تھیں۔ میں بہت دیر تک اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ کھلونوں سے کھیلتا رہا لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ سورج نکل ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ کوئی مجھے ایک پیالی چائے بنا دے۔ آخر مجھ سے برداشت نہ ہوسکا، ممی کی باتیں ایک دم میرے ذہن سے نکل گئیں اور میں اُن کے کمرے میں چلا گیا۔ ممی اور ڈیڈی سو رہے تھے۔ میں ممی کے اوپر سوار ہوکے اپنے لیے جگہ بنانے لگا۔ ممی کی آنکھ کھل گئی۔ اُنھوں نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔

''لیری! تم نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا؟''

میں شرمندہ ہو کے رہ گیا۔ ممی نے میرا ماتھا چھوتے ہوئے پریشانی سے کہا:

''اوہ، تمہارا تو بدن بھی گرم ہے۔ اچھا آؤ، خاموشی سے سوجاؤ، بالکل بات نہ کرنا۔''

میں ان کی پشت سے چپک کے کچھ دیر تک زبردستی آنکھیں موندے لیٹا رہا لیکن آخر کب تک لیٹا رہتا۔ میں تو ممی سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ ''ممی! ممی!'' میں نے سرگوشی میں مجھے ڈانٹا۔ ''یہ بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟''

میں باتیں کرنا چاہ رہا تھا اور ڈیڈی سونا چاہ رہے تھے۔ میں نے سوچا، آخر یہ گھر کس کا ہے؟ یہ سوچ کے میں نے اعتماد سے کہا:

''ممی! ڈیڈی کی صحت کے لیے اچھا ہے کہ یہ دوسرے کمرے میں سویا کریں۔'' ممی خاموش ہوکر رہ گئیں۔

بہت دیر بعد اُنھوں نے میری جانب کروٹ بدلتے ہوئے کہا:

''لیری! یا تو بالکل چُپ ہوجاؤ یا اگر چُپ نہیں ہوسکتے تو اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔''

گویا میرے ساتھ ممی نے جو ناانصافی شروع کردی تھی، میں نے اُس کا اقرار خود اُن کے منہ سے کروالیا جبھی تو اُنھوں نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ اُلٹا مجھے ڈانٹنے لگیں۔ یہ سب کچھ ڈیڈی کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ میں نے ممی کی نظر بچا کے ڈیڈی کی کمر پر ایک لات لگادی۔ اس حرکت کا خاطر خواہ اثر ہوا، ڈیڈی نے غرا کے آنکھیں کھول دیں:

''کیا وقت ہوا ہے؟''

اُنھوں نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے دروازے میں کوئی کھڑا ہو۔

ممی نے دنیا بھر کی مٹھاس اپنی آواز میں گھولتے ہوئے کہا:

''ابھی کوئی خاص وقت نہیں ہوا ہے۔'' وہ بستر سے اُٹھیں اور مجھے گھورتے ہوئے بولیں: ''تم نے ڈیڈی کو جگا دیا نا، چلو اُٹھو اور اپنے بستر پر جاؤ۔'' اُنھوں نے جھک کر مجھے بستر سے اُٹھانا چاہا۔ میرا حق مجھ سے زبردستی چھینا جا رہا تھا۔ میں احتجاجاً اُن کے ہاتھوں میں اکڑ گیا اور زور زور سے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے چیخنے لگا۔ میرا چیخنا ایسا تھا کہ مردہ بھی قبر سے اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اچانک ڈیڈی دہاڑے:

''عجیب گدھا لڑکا ہے، یہ کبھی سوتا بھی ہے کہ نہیں؟''

اُنھوں نے خود کو چادر میں لپیٹتے ہوئے گردن اُٹھا کر مجھے دیکھا۔ چادر سے صرف دو سیاہ آنکھیں جھانکتی دکھائی دیں۔ اُف وہ کتنے ڈراؤنے لگ رہے تھے۔

ممی کے لیے مجھے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر دروازے تک پہنچتے پہنچتے اُنھوں نے مجھے زمین پر کھڑا کردیا۔ میں اُن کے ہاتھوں سے چھوٹتے ہی کمرے کی دیوار سے جا لگا اور زور زور سے اس طرح پاؤں پٹخنے لگا جیسے میری قوت ڈگنی ہوگئی ہو۔

ڈیڈی اُٹھ بیٹھے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے

گھورتے ہوئے چلائے۔ ''خاموش!'' اُن کی چنگھاڑ نے مجھے ایک لمحے کے لیے گنگ کر دیا۔ اس انداز میں مجھے اس سے پہلے کسی نے مخاطب نہیں کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ڈیڈی کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ مجھے بھی طیش آ گیا۔ میں سسکتے ہوئے جواباً چیخا: ''تم..... تم چُپ رہو۔''

''کیا کہا؟'' ڈیڈی نے بستر سے چھلانگ لگائی۔

''مائنک! مائنک!'' دروازے کے قریب سے ممی کی سہمی ہوئی آواز دی۔ ''لیری بچہ ہے، ابھی تم سے مانوس نہیں ہوا۔'' میں نے ممی کی طرف دیکھا، اُن کی آنکھوں میں خوف تھا۔

ڈیڈی ایک درندے کی طرح مجھ سے جھپٹے۔ میں ننگے پاؤں کمرے میں ادھر اُدھر ناچنے لگا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، کمرے سے نہیں نکلوں گا۔

اُس روز سے ہماری زندگی عذاب ہو گئی۔ اب ڈیڈی اور میں ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے۔ وہ ممی سے میرا وقت چُرانے کی کوشش کرتے اور میں اُن کا وقت چُرانے کے چکر میں رہتا۔ جب بھی ممی مجھے سونے سے پہلے کہانی سنانے بیٹھتیں، ڈیڈی کو اپنی کسی پرانی چیز کی ضرورت پیش آ جاتی یا چائے پینے کی خواہش ہونے لگتی یا کوئی دلچسپ واقعہ یاد آ جاتا۔ ڈیڈی اور ممی جب بھی گفتگو میں محو ہوتے، میں شور مچا مچا کر کھلونوں سے کھیلنے لگتا۔

ایک شام ڈیڈی باہر سے واپس آئے۔ میں اُن کے صندوق سے چیزیں نکال نکال کر کھیل رہا تھا۔ اُس میں اُن کے تمغے تھے اور نہ جانے کیا کیا چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ڈیڈی مجھے اپنی چیزوں سے کھیلتے دیکھ کر برس پڑے۔ اُن کے برسنے پر ممی جھنجھلا گئیں۔ اُنھوں نے ڈیڈی کی چیزیں سمیٹ کر صندوق میں رکھتے ہوئے مجھے ایک چانٹا رسید کر دیا۔

''لیری! ڈیڈی کی چیزیں اُس وقت تک مت چھیڑا کرو جب تک وہ خود اجازت نہ دیا کریں۔''

حالات روز بہ روز خراب ہوتے گئے۔ میں نے سوچا بہت غور کیا مگر یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ آخر ڈیڈی میں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ ممی اُنھیں مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ کسی طرح مجھ سے بہتر نہیں تھے۔ انھیں چائے تک پینا نہیں آتی تھی۔ چائے پیتے وقت اُن کے منہ سے سُڑ سُڑ کی آوازیں نکلتی تھیں۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ ڈیڈی اخبار پڑھ کر ممی کو خبریں سناتے ہیں شاید اس لیے وہ انھیں زیادہ چاہتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں بھی ادھر اُدھر سے خبریں جمع کر کے ممی کو سنانے لگا لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر مجھے گمان ہوا کہ ڈیڈی کی تمباکو نوشی ممی کو اچھی لگتی ہے لہٰذا ایک روز میں نے بھی ڈیڈی کا پائپ اُٹھا کر انھی کی طرح ہونٹوں میں دبایا اور گھر میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے ممی سے پہلے ڈیڈی نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ تو موقع کی تاک میں رہتے تھے، اُنھوں نے فوراً میری پٹائی کر دی۔ پھر ایک دفعہ چائے پیتے ہوئے میں نے ڈیڈی کی طرح سُڑ سُڑ کی آوازیں نکالیں۔ ممی نے مجھے بُری طرح ڈانٹ دیا۔

میں ہر وقت وہ راز جاننے کی فکر میں لگا رہتا تھا جس کی وجہ سے ممی ڈیڈی کو زیادہ پسند کرتی تھیں۔ آخر ایک دن یہ بات میری سمجھ میں آ گئی، نہ معلوم یہ معمولی بات پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ ڈیڈی نے چونکہ ممی سے شادی کی تھی اس لیے ممی انھیں مجھ پر فوقیت دیتی تھیں۔ ایک دن ہمت کر کے میں نے ڈیڈی کو جتا دیا کہ میں نے اُن سے شکست قبول نہیں کی ہے، ہاں اپنے بڑے ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ ڈیڈی نے میری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ ایک شام وہ دونوں میری موجودگی نظر انداز کر کے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ میں نے بڑے مدبرانہ انداز میں ممی کو مخاطب کیا:

''ممی! آپ جانتی ہیں، میں بڑا ہو کر کیا کروں گا؟''

''نہیں جانتی، بتاؤ، کیا کرو گے؟'' اُنھوں نے سوال کیا۔

''میں آپ سے شادی کروں گا۔'' میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ ڈیڈی نے مذاق اُڑانے کے انداز میں قہقہہ لگایا لیکن ممی خوش ہوگئیں۔ شاید یہ سُن کر اُنھیں سکون ملا تھا کہ ایک دن ڈیڈی سے اُنھیں نجات مل جائے گی۔ انھوں نے مجھے گود میں اُٹھالیا۔

''بھئی یہ تو بہت اچھا ہوگا۔''

''ہاں، بہت اچھا ہوگا۔'' میں نے کہا: ''پھر ہمارے بہت سارے، بہت سارے بچے ہوں گے۔''

''خوب۔'' اُنھوں نے مجھے چومتے ہوئے کہا:

''اب بہت جلد تمہارا بھائی آ جائے گا پھر تم اکیلے نہیں رہو گے۔ یوں سمجھ لو، تمہارے لیے ایک ننھا سا کھلونا آ رہا ہے۔''

بھائی کی خوشخبری سُن کر مجھے بہت اطمینان حاصل ہوا کہ ڈیڈی کی تمام مخالفتوں کے باوجود ممی کو مجھ سے محبت ہے جبھی تو وہ میرے لیے بھائی لا رہی ہیں۔

بھائی آنے سے پہلے گھر کا ماحول میرے لیے بدستور اجنبی بنتا گیا۔ اب ڈیڈی رات کو دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ ممی کو بھی کوئی خاص کام نہیں ہوتا تھا پھر بھی وہ مجھے سیر کے لیے نہیں لے جاتی تھیں۔ اُن کا مزاج چڑچڑا ہوتا جا رہا تھا۔ بات بات پر جھنجھلا جاتی تھیں۔ خصوصاً میری ہر حرکت پر اُنھیں غصہ آ جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھڑکنے لگی تھیں۔ اُنھوں نے مجھے گود میں اُٹھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وقت یونہی گزرتا رہا۔

ایک دن ممی اسپتال سے واپس آئیں تو تنہا نہیں تھیں، وہ میرے لیے ایک بھائی لے کر آئی تھیں۔ اُس کا نام سونی تھا۔ سونی حالانکہ میرے کھیلنے کے لیے لایا گیا تھا لیکن مجھے تو ممی اُسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھیں۔ وہ دن بھر سونی کے ساتھ پلنگ پر پڑی رہتیں۔ میں پہلے ہی روز سے سونی کو ناپسند کرنے لگا۔

وہ مجھ سے بہت مختلف لڑکا تھا۔ اُسے ہر وقت ممی کی توجہ چاہیے ہوتی اور ممی گویا اُسی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ اتنی سی بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ بسا اوقات سونی خواہ مخواہ بھی اُن کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانا چاہتا ہے۔ عجیب کاہل لڑکا تھا۔ دن دن بھر سوتا رہتا۔ اس کی نیند میں خلل پڑنے کے ڈر سے مجھے خاموش رہنا پڑتا تھا۔ پہلے ممی کی زبان پر بے چارے ڈیڈی کا نعرہ رہتا تھا، اب وہ ''سونی کو مت جگاؤ، سونی کو مت جگاؤ'' کی رٹ لگائے رکھتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سونی آخر اُس وقت کیوں نہیں سوتا جس وقت سب سوتے ہیں، ہر وقت کیوں سوتا رہتا ہے۔ میں موقع کی تاک میں رہتا۔ جب بھی ممی کسی کام میں لگی ہوتیں، میں زور سے چٹکی بھر کے سونی کو جگا دیتا۔ ایک روز ممی نے مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا اور خوب مارا۔ اس سے پہلے اُنھوں نے مجھے اس طرح کبھی نہیں مارا تھا۔ میں روتا ہوا باہر نکل کے لان میں کھلونوں سے کھیلنے لگا۔ اب اس گھر میں کھلونوں کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ میرے کھلونے ہی میرے سچے دوست تھے حالانکہ پہلے میں اُنھیں بے پروائی سے ادھر ادھر پھینک دیتا تھا لیکن اب اپنے دل کی تمام باتیں اُنھی سے کرتا تھا۔

میں ایک شام لان میں کھیل رہا تھا معاً ڈیڈی آتے دکھائی دیے۔ میں ایسا بن گیا جیسے وہ مجھے نظر نہ آئے ہوں۔ میں نے انھیں سنانے کے لیے اُونچی آواز میں اپنے کھلونوں کو مخاطب کیا:

''سنو ہوائی جہاز! سنو چابی کی موٹر! اب اس گھر میں اگر کوئی اور بے بی آیا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

ڈیڈی ٹھٹھک کر رُک گئے اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگے:

''لیری! تم کیا کہہ رہے تھے ابھی؟''

''میں اپنے کھلونوں سے باتیں کر رہا ہوں۔'' میں اُن کی طرف ایک اُچٹتی نظر ڈال کے پھر کھیل میں مشغول ہو گیا۔ ڈیڈی کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے پھر چھوٹے چھوٹے قدم

نشانِ حیدر:

نشانِ حیدر کی مسلح افواج سے تعلق رکھنے والے افراد کو بہادری کے لازوال کارنامے سرانجام دینے پر بعد از شہید ہونے پر دیا جانے والا سب سے بڑا ایوارڈ ہے۔ اب تک 10 اشخاص کو یہ ایوارڈ دیا گیا ہے جن میں سے 9 کا تعلق پاکستان آرمی سے اور ایک کا تعلق پاک فضائیہ سے ہے۔

نشانِ حیدر کو پاکستان منٹ میں تیار کیا جاتا ہے اور اس کی تی میں 88 فیصد تانبا، 2 فیصد زنک اور 10 فیصد سونا استعمال ہوتا ہے۔ ایوارڈ کی تیاری میں استعمال ہونے والا میٹریل دشمن سے چھینے گئے ہتھیاروں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ کیپٹن راجہ محمد، ۲۔ میجر طفیل محمد، ۳۔ میجر عزیز بھٹی، ۴۔ پائلٹ آفیسر راشد منہاس، ۵۔ میجر محمد اکرم، ۶۔ میجر صابر شریف، ۷۔ سوور محمد حسین، ۸۔ محمد محفوظ (لانس نائک)، ۹۔ کیپٹن کمال شیر خان، ۱۰۔ لالک جان (حیولدار)

اُٹھاتے اندر چلے گئے۔

اس شام کے بعد میں نے ڈیڈی کے رویے میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔ اُن کا سلوک مجھ سے اچھا ہو گیا تھا لیکن ممی کا رویہ وہی رہا۔ اُن کی توجہ کا مرکز اب بھی سونی ہی تھا۔ ممی اب ڈیڈی سے بھی بہت کم باتیں کرتیں۔ وہ لوٹھڑا ہر وقت اُن سے چمٹا رہتا تھا۔ ڈیڈی کے کام کرنے بھی ممی نے چھوڑ دیے تھے۔ ہر کام ڈیڈی کو خود کرنا پڑتا تھا۔ ممی کے اس رویے سے ڈیڈی بھی کچھ پریشان نظر آتے۔ وہ ممی سے میری طرح صاف صاف بات تو نہیں کرتے تھے لیکن اکثر یہ شکایت ضرور کرتے کہ سونی کے رات بھر روتے رہنے سے اُن کی نیند پوری نہیں ہو سکی لیکن ممی سونی کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتی تھیں۔ ڈیڈی کی شکایت کے جواب میں وہ تڑ سے کہہ دیتیں:

''اسے جب بھوک لگتی ہے تبھی روتا ہے۔''

مجھے ممی کی نا سمجھی پر بہت افسوس ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ سونی خواہ مخواہ روتا ہے تاکہ ممی کی توجہ کسی اور جانب مبذول نہ ہو۔

ایک رات کوئی میرے بستر پر آ گیا۔ میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ ممی ہوں گی۔ آخر انھیں احساس ہو ہی گیا کہ وہ میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں لیکن اُسی وقت دوسرے کمرے سے سونی کا رونا اور ممی کا چمکارنا سنائی دیا۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ ممی نہیں تھیں، ڈیڈی تھے۔ اُن کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور وہ تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ سوتے سوتے اُٹھنے کے باعث اُن کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔ گویا میری طرح ڈیڈی بھی ممی کے کمرے سے بے دخل کر دیے گئے تھے۔ مجھے ڈیڈی پر ترس آنے لگا اور میرا دل اُن کے لیے پیار سے بھر گیا۔ میں نے اپنے بازو اُن کی گردن میں ڈالے اور انھیں خود میں سمیٹ کر سلانے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈیڈی نے گردن اُٹھا کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا پھر زور سے مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

گھاس کی جڑیں

ابوالامتیاز ع۔س۔مسلم

ناظرین بخیر، میاں میاں نور الٰہی سے ہماری چالیس پینتالیس سال پہلے سے اُن دنوں سے یاد اللہ ہے جب ہم نے 1959ء میں روزنامہ ''انجام'' میں ''دریچے'' کا آغاز کیا تھا۔ بلکہ اُس سے بھی قبل ہماری شناسائی اُن سے ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کی تنقیدی محفلوں کی مرہونِ منت تھی جس میں ہم دونوں بڑے ذوق وشوق سے حصہ لیا کرتے تھے۔ پھر میاں صاحب ہمارے کالم کی طرح نجانے کہاں غائب ہو گئے کہ ہمارے دل میں طرح طرح کے وسوسے آنے لگے اور ہم ''صبر شکر'' کر کے بیٹھ رہے۔ بلکہ کچھ عرصہ بعد خود بھی اگر تارک الدنیا نہیں، تو سترہ اٹھارہ سال کے لیے تارک الوطن ضرور ہو گئے۔

اگلے دن ٹیلیفون کی گھنٹی بڑے زور سے بجی۔ چونگا اٹھاتے ہی کسی کی آواز آئی ''خنجر اُٹھے گا''، زبان سے یہ الفاظ نکلنے ہی والے تھے کہ ''بھائی میرے پاس کچھ نہیں، یہ گھڑی اور چند روپے جیب میں ہیں، لے لو، چاہو تو کار بھی لے جاؤ، لیکن میری جان بخشی کرو''، لیکن اچانک ہی یہ احساس ہو گیا کہ میں تو دفتر میں ہوں اور یہ ٹیلیفون ہے۔ جان میں جان آئی اور طے کر لیا کہ آئندہ کالم کا ایسا خطرناک عنوان نہیں رکھیں گے۔ آواز مانوس سی تھی لیکن ذہن میں تصویر بن نہیں پا رہی تھی۔ یکا یک جیسے ذہن روشن ہو گیا اور پوچھا ''کیا میاں نور الٰہی بول رہے ہیں؟'' اُدھر خوشی سے

نادان عوام نہیں جانتے کہ اُن کی بھلائی یا بُرائی کس بات میں ہے

ایک نعرۂ مستانہ بلند ہوا اور چونگا ہمارے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔

معلوم ہوا، ہماری طرح میاں صاحب بھی گردش زمانہ کا شکار اور نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے پھرتے رہے ہیں۔ برسوں کی ''جلا وطنی'' کے بعد ''امت'' میں ہمارا کالم ''خنجر اٹھے گا'' پڑھ کر ''ابوالامتیاز'' کے لاحقے کے باوجود انھیں یقین ہو گیا کہ اللہ کے فضل سے ہم ابھی اُفتاں و خیزاں اسی جہان ہست و بود میں موجود ہیں۔ تو ان کی محبت نے ایسا جوش مارا کہ ہمارے ٹیلیفون کا چونگا ٹوٹتے ٹوٹے بچا۔

دوسرے روز میاں صاحب ہمارے سامنے جلوہ فرما تھے۔ فرمانے لگے: ''یار کیا لوگوں کے دلوں سے خوف خدا اٹھ گیا ہے؟''

میں نے دریافت کیا: ''آپ کا کیا خیال ہے؟''

کہنے لگے: ''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے خوف خدا تو کیا ''لوگ'' سمجھتے ہیں (نعوذ باللہ) خدا ہی اٹھ گیا ہے''۔

میں نے عرض کیا: ''میاں صاحب کیوں کفر بکتے ہو، ویسے جہاں تک ''لوگوں'' کا تعلق ہے اس میں تعجب کی کیا بات ہے، اب تو سیکولرزم کا زمانہ ہے۔ ہم جمہوریت کی طرف بڑھ رہے ہیں، بلکہ ہمیں تو چھوڑیے خود جمہوریت گھاس کی جڑوں (Grass Roots) تک پہنچ رہی ہے۔ عام دیدار یار ہوگا، مگر آپ کیوں پریشان ہیں؟''

کہنے لگے: ''میاں تم کون سی جمہوریت کی بات کرتے ہو، آئین تو معطل ہے، سیاسی لیڈران کرام یا تو جلا وطن ہیں یا اُن کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں اور جو موجود ہیں وہ بھی صرف چار دیواری میں ہی ''گدا'' پا سکتے ہیں یعنی چادر اور چار دیواری کے اندر رہ کر''۔

میں نے عرض کیا: ''میاں صاحب آپ کس چکر میں ہیں، اگر شوق ہے تو گھاس کی جڑوں والی جمہوریت کا ایکشن لڑ لیجیے، یا ''ناظم'' کے نصب کے لیے کھڑے ہو جایئے۔ سنا ہے پولیس اور بیوروکریسی ناظم کے ماتحت ہو گی۔ لیکن تب تک علاقے کے ایس پی کو اپنی فدویت کا یقین دلا دیجیے کہ حضور مائی باپ ہیں، جیسا حکم کریں گے ویسا ہی ہو گا۔ میں علاقے کی ہر ایک کے بارے میں تمام اطلاعات بہم پہنچاؤں گا، کہ کس گھر میں کیا پکا ہے یا ''پک رہا ہے''۔ نہیں بھی پک رہا تو اپنے فرائض کی بجا آوری اور آپ کی ترقی اقبال اور فائل کا پیٹ بھرنے کے لیے کچھ مرچ مسالہ حسب مزاج عالی، اپنی طرف سے ڈال دوں گا۔ بس ذرا سی نظر عنایت ہو جائے۔ سنا ہے کہ کلاس مانیٹر کی طرح آپ کے ساتھ بھی کوئی مانیٹر ہے۔ بس اُس سے بچا کر رکھیے۔ ایک بار منتخب ہو جاؤں پھر آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی ہو گا''۔

کہنے لگے: ''بھئی کیا تم سنکی ہو گئے ہو اور کیسی گھاس کی جڑوں والی جمہوریت کی بات کر رہے ہو۔ ہمیں تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ہاں ''بنیادی جمہوریت'' ضرور دیکھی تھی۔

''بس بس'' میں نے کہا: ''کچھ اُسی سے ملتی جلتی شے ہے۔ لیکن زیادہ تیز ہے۔ آپ کو یاد ہے ہم ''نیا راہی'' میں اسے ''بے نامی'' جمہوریت لکھتے تھے۔ بنیادی جمہوریت بس ''بنیادی'' ہی رہے۔ برگ و بار لا کر سرسبز و شاداب نہ ہو سکے۔ ویسے ایک شے آج کل بنیاد پرستی بھی ہے اور وہ گردن زدنی ہے اور جمہوریت ''سیاسی'' ہوئی تو فیلڈ مارشل صاحب کا بستر گول ہو گیا''۔

''ہاں ہاں یاد آیا''، میاں صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اُس زمانے میں تو بھانت بھانت کی جمہوریت تھی۔ ہائے کیا ورائٹی تھی۔ مجھے تو نام بھی بھول گئے۔ تمہیں کچھ یاد ہو گا۔ بہت بڑھ چڑھ کر ''درون خانہ'' لکھا کرتے تھے''۔

میں نے کہا ''میاں صاحب! سب یاد ہے لیکن کیوں بجھی ہوئی راکھ کرید کر چنگاریوں کو ہوا دے رہے ہو۔ یاد نہیں اسکندر مرزا نے کہا تھا ہمارے ہاں سیدھی سادھی جمہوریت نہیں چل سکتی؟ اس لیے Controlled

Democracy'' یعنی ''لگامی'' جمہوریت ہونی چاہیے، تاکہ گھوڑی، سوار کے قابو میں رہے اور ادھر اُدھر بھٹک کر خواہ مخواہ راستہ کھوٹا نہ کرے۔ پھر انڈونیشیا کے صدر احمد سوئیکارنو نے بھی تو Guided Democracy یعنی ''امامی جمہوریت'' کا ڈول ڈالا تھا۔ نادان عوام نہیں جانتے تھے کہ اُن کی بھلائی یا برائی کس بات میں ہے۔ اس لیے ضروری تھا کوئی ''اوپر'' سے ان کو بتانے والا، لگام کھینچنے والا یا سیاسی امامت کرنے والا ہو اور یہ صرف کوئی آزاد منش، نابغہ روزگار فرد ہی ہوسکتا ہے، جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو اور اُسے نہ لوگوں کے ووٹوں کی احتیاج ہو، نہ ان کے مشورے کی پابندی اور جسے یقین ہو کہ اُسے ''قدرت کاملہ'' نے لوگوں کو سیدھا کرنے، ان کی جہت فکر کو ''درست'' کرنے اور نئی دنیا میں داخل کرنے کے لیے بطور خاص ''منتخب'' کیا ہو۔

آخر میاں صاحب سے نہ رہا گیا، کہنے لگے ''یار تمہاری پہلیاں بجھانے کی عادت نہ گئی۔ صاف صاف کہو کیا بات ہے''۔

میں نے عرض کیا ''میاں صاحب بات تو کہہ دی ہے۔ آپ خواہ مخواہ تجاہل عارفانہ سے کام لے رہے ہیں۔ ''بے نام جمہوریت'' کا حشر تو ہمارے سامنے ہے۔ اسی طرح اسکندر مرزا والی ''لگامی جمہوریت'' اور سوئیکارنو کی ''امامی جمہوریت'' اور ان کے بانیوں کا جو انجام ہوا، وہ بھی آپ بھول گئے، جو مجھ سے گھاس کی جڑوں والی جمہوریت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں؟ بس یہ بھی بے نامی اور لگامی یا اُن کی کوئی درمیانی قسم ہے۔ اسے آپ ''مقامی جمہوریت'' کہہ لیجیے۔ اب یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ گھاس میں لگنے والی امریکن سنڈی کی طرح اس نئی جمہوریت کی سنڈی جڑوں میں لگنے سے گھاس باقی رہتی ہے یا صرف سنڈی، یا لوگوں کو گھاس ہی کھانا پڑتی ہے''۔

''ویسے یہ بھٹو نے نہیں کہا تھا کہ ہم گھاس کھالیں گے لیکن ایٹم بم ضرور بنائیں گے۔ سو ایٹم بم تو ہم نے اللہ کے فضل سے گھاس کھائے بغیر بنالیا، لیکن:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

اور اگر خدا نے چاہا تو ورلڈ تو ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور گھاس کی جڑوں والی ''مقامی جمہوریت'' کی بدولت اب گھاس کھانے میں کوئی سر باقی نہیں رہنی چاہیے''۔

میاں نور الٰہی میرے منہ کی طرف دیکھنے لگے اور میں انھیں تکنے لگا اور ہم بے اختیار ہنس پڑے۔ آخر میاں صاحب، کپڑے جھاڑتے اور یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے:

تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

حاضر جوابی

ایک مرتبہ مہاتما گاندھی نے اعلان کیا کہ وہ ۱۲۵ برس تک زندہ رہیں گے۔ اس پر بابائے اُردو مولوی عبدالحق نے انھیں ایک خط لکھا: ''میری بھی یہی دلی دعا ہے کہ آپ ۱۲۵ برس تک جئیں تاکہ آپ نے اب تک جو غلطیاں کی ہیں ان کی تلافی کے لیے مناسب وقت مل سکے''۔

☆☆☆

ایک دفعہ اقبال سے سوال کیا گیا کہ عقل کی انتہا کیا ہے؟ اقبال نے جواب دیا: ''حیرت''۔ پھر سوال ہوا کہ عشق کی انتہا کیا ہے؟ فرمایا: ''عشق کی کوئی انتہا نہیں''۔ پوچھا گیا کہ پھر آپ نے کیسے کہہ دیا کہ ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں؟ بولے: یہ بھی تو کہا کہ مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں''۔

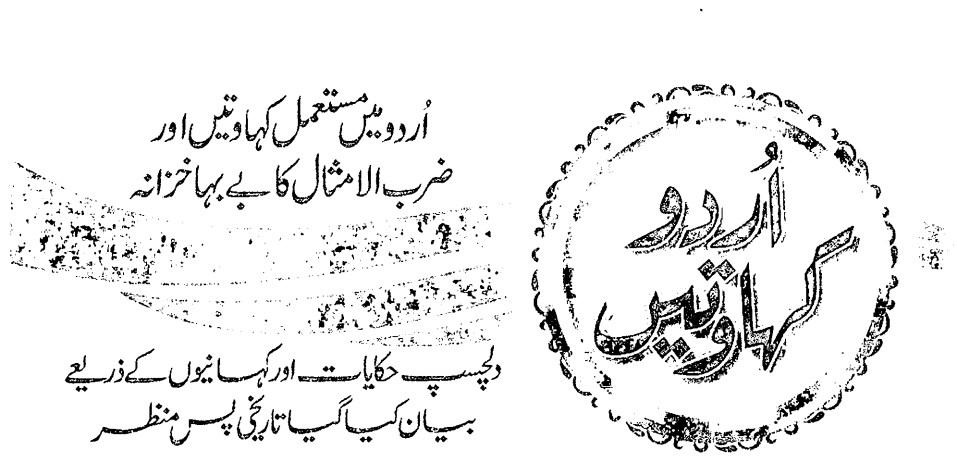

﴿اندھے نے راہ پوچھی، کنوئیں میں جا گرا﴾

جب کوئی شخص کسی نادان یا احمق کو ہدایت دے، اس کی رہبری کرے اور اس کے فائدے کی باتیں بتائے مگر وہ اپنی لاعلمی اور نادانی کے سبب فائدے کی جگہ نقصان اُٹھائے تو اس کہاوت کا اس پر اطلاق ہوتا ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت ہے جو اس طرح ہے:

حکایت: ایک اندھے نے کسی نیک شخص سے کہیں کا راستہ پوچھا۔ اس نے اندھے کو صحیح راستہ بتا دیا۔ اندھا اپنی سمجھ کے مطابق اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ کچھ دُور جانے کے بعد اس نے اپنی عقل کے مطابق راہ تھوڑی بدلی۔ آگے جا کر وہ ایک کنوئیں میں گر گیا۔ اگر وہ نیک شخص کے بتائے ہوئے راستے پر ہی چلتا یا خود ہی سمجھدار ہوتا تو یہ حادثہ پیش نہ آتا۔

☆☆☆☆

﴿ان کو بھی لکھو﴾

کسی احمق اور نادان شخص کے لیے یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پس منظر میں ایک چھوٹی سی حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے۔

حکایت: ایک دن اکبر بادشاہ نے اپنے خاص درباری بیربل سے پوچھا کہ ''اس دنیا میں آنکھ والوں کی تعداد زیادہ ہے یا اندھوں کی؟''

بیربل نے برجستہ جواب دیا: ''جہاں پناہ! اندھوں کی تعداد زیادہ ہے اور آنکھ والوں کی کم۔''

''تم اسے کیسے ثابت کر سکتے ہو؟''

بیربل نے جواب دیا: ''حضور اس کے لیے مجھے ایک منشی اور ایک رجسٹر کی ضرورت ہوگی تاکہ میں اس رجسٹر میں اندھوں

کے نام لکھ سکوں۔''

بادشاہ نے بیربل کی یہ درخواست منظور کرتے ہوئے اپنے ایک منشی کو رجسٹر دے کر بیربل کے حوالے کر دیا۔ بیربل اس منشی کو لے کر نکل پڑے اور راستے میں کنکر چننے لگے۔ جو بھی اس راستے سے گزرتا وہ بیربل کو کنکر چنتے دیکھ کر پوچھتا تھا:

''بیربل! یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس پر بیربل اسے جواب دینے کے بجائے منشی سے کہتا:

''ان کو بھی لکھو۔''

منشی اس کا نام اندھوں کی فہرست میں لکھ لیتا۔ اسی طرح ایک لمبی فہرست تیار ہو جانے کے بعد جب بیربل نے اسے اکبر بادشاہ کے حضور پیش کیا تو اکبر بیربل کی دانائی کا قائل ہو گیا اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔

☆☆☆

﴿جانور ہی تو ہے﴾

معصوم ہے، کچھ شعور نہیں۔ جب کوئی شخص ہر حال میں اپنی بات منوائے یا اپنی کہی ہوئی بات کی تردید اپنے بچاؤ کے لیے بے جھجک غلط بیانی کرے تو یہ کہاوت کہی جاتی ہے۔ اس کہاوت سے متعلق ایک لوک کہانی اس طرح سے مشہور ہے:

کہانی: ایک قاضی نے اپنے بیل کو کسی تیلی کی سپردگی میں اس شرط پر دیا کہ وہ اس بیل سے کولہو وغیرہ چلانے کا کام لے اور اس کے عوض میں روزانہ ایک سیر تیل قاضی کے گھر بھجوا دیا کرے۔ بیل کو کھلانے پلانے کی ساری ذمہ داری تیلی کی ہوگی۔ تیلی نے قاضی صاحب کے بیل کو کھلی اور گھاس وغیرہ کھلا کھلا کر خوب موٹا تازہ کر دیا۔ اتفاق سے ایک دن قاضی کے بیل نے تیلی کے بیل کو سینگ مار مار کر ہلاک کر دیا۔ مقدمہ قاضی کی عدالت میں پیش ہوا تو انھیں یہ اطلاع دی گئی کہ تیلی کے بیل نے قاضی کے بیل کو مار ڈالا ہے۔ قاضی صاحب نے اپنی لال کتاب کھولی اور اس میں دیکھ کر کہا:

لال کتاب میں نکلا یوں
تیلی بیل لڑایا کیوں
کھلی کھلا کے کیا مسٹنڈ
بیل کا بیل اور ڈنڈ کا ڈنڈ

یعنی تیلی بیل کے بدلے بیل بھی دے اور جرمانہ بھی ادا کرے۔ تیلی یہ سن کر گھبرا گیا اور متعجب ہو کر نہایت ادب سے دبی زبان میں قاضی صاحب سے عرض کیا:

حضور میرے بیل نے آپ کے بیل کی جان نہیں لی بلکہ آپ کے بیل نے میرے بیل کو سینگ مار مار کر ہلاک کر دیا ہے۔''

یہ سن کر قاضی صاحب فوراً بولے۔

''جانور ہی تو ہے۔''

☆☆☆

رانا محمد شاہد

بلیک باکس

فضائی حادثے کی وجوہات کا پتا لگانے والا آلہ...

22 مئی کو عید سے دو دن پہلے پاکستان ایک سانحے سے دو چار ہوا۔ جب کراچی ائیر پورٹ سے محض ایک کلو میٹر دُور پی آئی اے کا جہاز تباہ ہوگیا۔ جہاز میں سوار زیادہ تر مسافر عید منانے کے لیے اپنے گھروں کو جارہے تھے۔ جس کی وجہ سے اس حادثے نے دکھ کی شدت میں اضافہ کردیا۔

حادثے کے چند دن بعد فرانسیسی ماہرین کی ٹیم آئی اور حادثے کے مقام کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ بلیک باکس بھی ساتھ لے گئی۔ جس میں موجود فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر اور کاک پٹ وائس ریکارڈر کے ذریعے حادثے کی اصل وجوہ کا پتا چلایا جاسکے کہ حادثہ کیوں ہوا۔

بلیک باکس کے نام سے خیال کیا جاتا ہے کہ یہ یقیناً کالے رنگ کا کوئی ڈبا ہوگا مگر ایسا نہیں ہے۔ بلیک باکس تیز مالٹا یا اورنج کلر کا ہوتا ہے۔ اس نارنجی رنگ کے آلے کا نام بلیک باکس کیوں پڑا؟ اس حوالے سے مختلف آراء ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانیہ کی رائل ائیر فورس کے ہوا باز اس آلے کے اندر خفیہ اور پراسرار مشین کو مذاق میں ''بلیک باکس'' کہنے لگے تھے۔ یہ بعد میں اس کا مستقل نام بن گیا۔ ایک خیال یہ ہے کہ اس نام کی وجہ شاید یہ ہے کہ حادثے کے بعد جب یہ خاصی تلاش بسیار کے بعد ملتا ہے تو آگ اور جلنے کی وجہ سے سیاہ رنگ کا ہوجاتا ہے۔ جبکہ کچھ آراء کے مطابق ابتدا میں یہ مکمل سیاہ پینٹ میں ڈیزائن کیا جاتا تھا لہٰذا اسی مناسبت سے بلیک باکس مشہور ہوگیا۔

جب بھی کوئی جہاز فضائی حادثے کا شکار ہو تو جلد از جلد بلیک باکس ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ تاکہ اس آلے کی مدد سے حادثے کی وجوہ کا پتا چلایا جا سکے۔ یہ آلہ ایک اُمید پیدا کرتا ہے کہ شاید حادثے کی وجوہ معلوم ہونے سے کچھ ایسے حقائق سامنے آجائیں جن کا سدِ باب کیا جا سکے تاکہ آئندہ پروازوں کو ہر ممکن حد تک اُس صورتِ حال سے بچایا جا سکے۔

ظاہری شکل کے لحاظ سے بلیک باکس ایک ایسا مستطیل

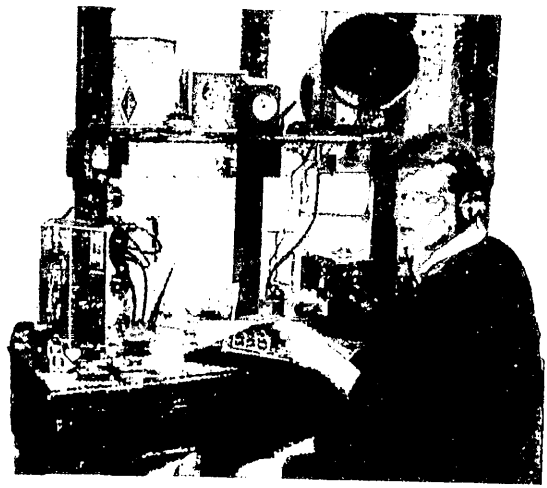

نما ڈبا ہے جو جہاز کی دُم میں نصب کیا جاتا ہے۔ عموماً حادثے کی صورت میں طیارے کا سامنے والا پہاڑ، کسی عمارت یا زمین وغیرہ سے ٹکرا کر تباہ ہو جانا زیادہ تر ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کی حفاظت کے پیشِ نظر اسے جہاز کے پچھلے حصے میں نصب کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ جہاز اگر سمندر میں ڈوب جائے تو بھی بلیک باکس کے اندر موجود ڈیٹا متاثر نہیں ہوتا۔

ایک اندازے کے مطابق چھے ہزار میٹر گہرے پانی میں بھی چوبیس گھنٹے تک ڈیٹا محفوظ رہتا ہے۔ البتہ ریکارڈر بند ہونے کی صورت میں ڈیٹا ضائع بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تصور کرنا کہ بلیک باکس کسی بھی صورت میں تباہ نہیں ہو سکتا، غلط ہے۔ انتہائی شدید حادثہ اسے تباہ بھی کر سکتا ہے۔ اب تک 11 سے زائد حادثات ایسے ہو چکے جن میں بلیک باکس نہیں ملا یا اس میں موجود ڈیٹا ضائع ہو چکا تھا۔

یہ آلہ دو حصوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک حصے کو فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر (FDR) اور دوسرے کو کاک پٹ وائس ریکارڈر (CVR) کہا جاتا ہے۔ پائلٹ اور کنٹرول ٹاور کے درمیان ہونے والی گفتگو بلیک باکس میں محفوظ ہوتی ہے۔ حادثہ سطحِ زمین پر ہو، فضا یا سمندر میں، بلیک باکس میں ریکارڈ ڈیٹا سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ حادثے کے وقت طیارے کی بلندی کتنی تھی اور طیارے کے اندر کیا چل رہا تھا؟

وائس ریکارڈر کی حساسیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ یہ کاک پٹ میں ہونے والی معمولی سی حرکت یا بٹن آن کرنے کی آواز کو بھی محفوظ کر لیتا ہے۔ اس لیے حادثے کے فوراً بعد بلیک باکس تحقیقاتی ٹیم کی تلاش کا بنیادی اہم جزو ہوتا ہے تاکہ یہ پتا چل سکے کہ حادثے کے فوراً پہلے طیارے کی کیا کیفیت تھی اور کس بارے میں گفتگو ہو رہی تھی اور کیا کیا محرکات و حالات درپیش تھے۔ یہاں تک کہ پائلٹ اور نائب کے درمیان نارمل گفتگو ہوئی یا عملے کے بیچ حادثے سے پہلے کہیں کوئی تلخ کلامی تو نہیں ہوئی۔

☆☆☆

بلیک باکس ایجاد کرنے کا خیال سب سے پہلے ایک آسٹریلین سائنس دان ڈیوڈ وارن کے ذہن میں آیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈیوڈ کے والد ایک طیارے کے حادثے میں

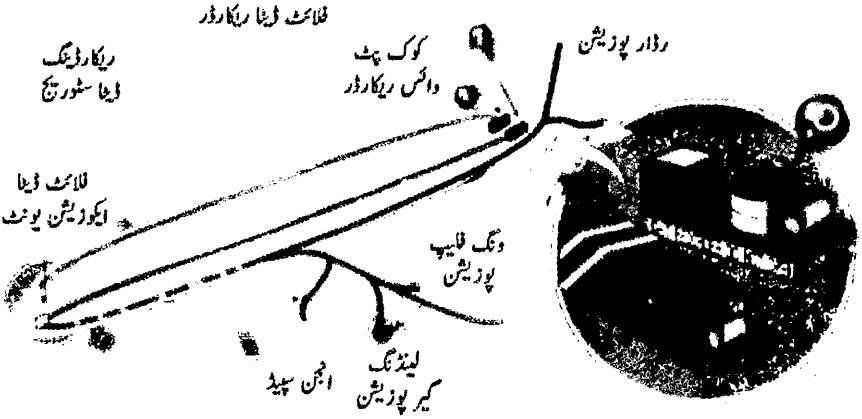

انتقال کر گئے تھے۔ جب ان کے والد اس حادثے میں لقمۂ اجل بنے تو ڈیوڈ کی عمر صرف 9 برس تھی۔ اس وقت تک فضائی حادثوں کی تحقیقات کے لیے کوئی آلہ موجود نہ تھا۔ اس طیارے کے ساتھ کیا معاملہ درپیش ہوا؟ پائلٹ کس مشکل کا شکار تھا اور حادثے سے پہلے اس نے کنٹرول ٹاور سے رابطہ کیا یا نہیں؟ ان کے مابین کیا گفتگو ہوئی؟ حادثے کا ذمہ دار کون تھا؟ یہ سب راز بلیک باکس نہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے پردے میں ہی رہ گئے۔

چنانچہ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ ڈیوڈ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ ایک ایسا آلہ بنائے گا، جس سے فضائی حادثے کی وجوہ جاننے میں مدد مل سکے گی۔ ان الجھنوں اور کشمکش نے اسے گھیرے رکھا کہ وہ یوں جان نا پایا کہ اس کے والد جس فضائی پرواز کے حادثے کا شکار ہوئے اس میں اصل مسئلہ کیا تھا۔ تاکہ آئندہ اس صورتِ حال کا سدِّ باب کیا جا سکے۔

وہ بڑا ہو گیا مگر وہ کچھ بھولا نہیں تھا۔ نہ اپنے والد کو، اُس حادثے کو اور نہ اپنے آپ سے کیے گئے اُس عہد کو۔ کم و بیش اس فضائی حادثے کے 16 سال بعد 1950ء میں ڈیوڈ وارن نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوششیں شروع کیں اور صرف 3 سال بعد 1953ء میں اپنے اُس خواب کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ اس کام میں برٹش ایئر رجسٹریشن بورڈ کے سیکرٹری سر رابرٹ کا اسے بھرپور تعاون حاصل رہا۔ پہلی بار ایئرو ناٹیکل ریسرچ لیبارٹری ARL میں یہ بلیک باکس تیار کیا گیا۔

بلیک باکس کی بیرونی تہ مضبوط سٹیل یا ٹائٹینیم دھات کی بنی ہوتی ہے۔ یہ مضبوط تہ باکس کو شدید دھچکے اور دباؤ سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ مضبوط تہ فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر (FDR) اور کاک پٹ وائس ریکارڈر (CVR) کو بھی محفوظ رکھتی ہے۔ اس آلے کو مختلف آزمائشوں سے بھی گزارا جاتا ہے۔ اس کا کریشن ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ تاکہ اندازہ ہو سکے کہ یہ کتنا دباؤ اور حادثے کی شدت کو برداشت کر سکتا ہے۔ اس میں اسے 11 سو ڈگری درجہ حرارت والی آگ میں ایک گھنٹے تک رکھنا بھی شامل ہے تاکہ یہ دس گھنٹے تک جلتے جہاز میں بھی محفوظ رہ سکے۔

اسی طرح 24 گھنٹے تک زیرِ آب رکھنے کے ساتھ اسے سمندر کے نمکین پانی میں 4270 میٹر کی گہرائی تک 30 یوم کے لیے رکھا جاتا ہے تاکہ اس بات کا اندازہ ہو کہ اتنی گہرائی

سے اس کے سگنل پہنچ رہے یا نہیں۔ اس بات کا بھی پتا چلایا جاتا ہے کہ پانی میں گرنے کی صورت میں یہ 6 ہزار میٹر گہرے پانی کا دباؤ بھی برداشت کرسکتا ہے یا نہیں۔

بلیک باکس گہرے پانی میں تلاش کرنا ہو تو اس کے ساتھ ایک ڈیوائس بیکن لوکیشن لوکیٹر نصب ہوتی ہے۔ جو 20 ہزار فٹ یا 4 کلومیٹر گہرے پانی تک بخوبی کام کرتی ہے اور ہر سیکنڈ میں ایک بار پنگ ساؤنڈ اور لوکیشن دیتی ہے اور اس کی بیٹری 30 دن سے 90 دن تک کام کرتی ہے۔ سمندری تہ میں پڑا بلیک باکس اپنے مقام کے بارے میں مطلع کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ذیل میں ایسے فضائی حادثات کا ذکر ہے جن میں بلیک باکس نہیں ملا یا اس میں موجود ڈیٹا ضائع ہو چکا تھا۔

ان حادثات میں 16/اگست 1965ء کو ایک جھیل میں گرنے والا یونائیٹڈ ائیر لائنز کا طیارہ جس کا بلیک باکس جھیل کے 76 میٹر گہرے پانی سے نہ مل سکا۔ 22 جولائی 1973ء کو پین امریکن ائیر ویز کا گرنے والا طیارہ، 30 ستمبر 1975ء کو مالے ائیر لائنز کا گرنے والا طیارہ، اسی طرح 30 جنوری 1979ء کو وارگ ائیر لائنز کا بوئنگ 707، نومبر 1987ء کو ساؤتھ افریقن ائیر لائنز کا جمبو طیارہ، 4/اکتوبر 1992ء کو اسرائیلی ائیر لائنز کا طیارہ 11 ستمبر 2001ء کو یونائیٹڈ ائیر لائنز کا طیارہ جو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر سے ٹکرایا۔ ان سب کے بلیک باکس نہیں ملے۔ اسی طرح 4/اکتوبر 2001ء کو سائبر ائیر لائنز اور یکم جون 2009ء کو ائیر فرانس کے طیارے جن حادثات کا شکار ہوئے ان کے بلیک باکس ملے ہی نہیں یا ان میں موجود ریکارڈ ضائع ہو چکا تھا۔

حادثے کے بعد بلیک باکس ڈھونڈنا بھی خاصے تردد کا کام ہے۔ بعض اوقات کئی دن تک بلیک باکس نہیں ملتا۔ ماہرین اب اس خیال پر کام کر رہے ہیں کہ طیارے کی رئیل ٹائم لوکیشن، وائس ریکارڈنگ اور فلائٹ ڈیٹا کو براہِ راست سیٹلائٹ سے منسلک کر دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مستقبل میں ایسے حادثات کے بعد بلیک باکس کی ضرورت نہیں رہے گی۔ سب کچھ سیٹلائٹ کے ذریعے منسلک ہوگا۔ چونکہ بلیک باکس جتنا بھی مضبوط ہو، اس کے تباہ ہونے یا ڈیٹا تک رسائی میں ناکامی کے امکانات موجود رہتے ہیں۔

جبکہ سیٹلائٹ کے ذریعے منسلک ہونے پر ایسے تمام خدشات ختم ہو جائیں گے۔ بلیک باکس کے حوالے سے ساری تحقیق و تفتیش عموماً وہی کمپنیاں کرتی ہیں۔ جن کا طیارہ ہوتا ہے۔

◇○○

دلچسپ معلومات

افریقہ میں ایک جگہ ایسی ہے جس پر کوئی بھی ملک اپنا حق نہیں جتاتا۔ یہ علاقہ بیئر طویل کے نام سے جانا جاتا ہے اور اس کا رقبہ 060.2 مربع کلومیٹر ہے اور یہ مصر اور سوڈان کی سرحدوں کے درمیان واقع ہے۔

☆☆☆☆

سن 1519 میں میگلن ایک بڑے گروپ کے ساتھ سمندر کے راستے سپائس آئی لینڈ یعنی مصالحے والے جزیرے کی تلاش میں نکلے تھے۔ کئی ممالک ہوتے ہوئے تین سال بعد یہ گروپ اسی جگہ پہنچا جہاں سے وہ روانہ ہوا تھا۔

☆☆☆☆

اب پچھتائے کیا ہوت

زیبا عزیز

میری جواں سالہ معصومہ، میری بھولی بچی'' اس قسم کی صدائیں سن کر ہم ہڑبڑا کر

اپنی موت کے مناظر جاگتی آنکھوں دیکھتی اور لُطف اُٹھاتی چُلبلی لڑکی کی دلچسپ لفاظی

اُٹھے۔ پریشانی کے ساتھ ساتھ معمولی سی شرمندگی ہوئی کہ ہم اتنی دیر تک سوتے رہے اور ٹی وی پر ڈراما بھی شروع ہوگیا ہے۔ توبہ ہے ہماری کاہلی پر۔ منہ پھاڑ کر زبردست قسم کی انگڑائی لی (جسے سینسر والے دیکھ لیتے، تو قینچی کی نظر ہوجاتی)۔

افوہ یہ سب خواتین کس کے پلنگ کے پاس رو رہی ہیں؟ گھبرا کے ننگے پیر دوڑے اور محوِ استراحت شخصیت کے روئے مبارک سے چادر ہٹائی۔ ہائیں!! یہ کیا! بالکل ہمارے جیسی فوٹو اسٹیٹ کون ہے بھلا؟ اک دم گھبرا گئے۔ قسم سے آج تو ہم نے کوئی شرارت نہیں کی۔ یہ کارنامہ ضرور عذرا کمبخت کا ہے۔ ابھی جا کر سب کو بتاتے ہیں کہ ہم تو زندہ ہیں۔ چیخ چیخ کر سب کو بتایا، مگر سب بہرے بنے رہے۔ امّی، خالہ، پھوپھو سب کے کندھے ہلا ڈالے، مگر کسی نے ہماری طرف توجہ ہی نہیں کی۔ پاپا کو ڈھونڈنے کی کوشش کی، وہ نظر نہ آئے۔ ٹکی بھائی کونے میں کھڑے رو رہے تھے۔ ہم نے حسبِ معمول اُن کا گال کھینچا، مگر اُنھوں نے لفٹ نہ کرائی، ورنہ جواب میں زوردار تھپڑ ضرور ملتا ہے۔ آج اِس قدر شرافت کا مظاہرہ کیوں ہو رہا ہے؟ غصّے میں آ کر کتابوں کا ریک اُلٹا دیا کہ شاید کوئی متوجہ ہو اور واقعی نصف درجن خواتین دوڑی دوڑی آئیں۔ یہ کیا عذرا ہماری کتابوں کو سینے سے لگا کر رو رہی ہیں؟ یہ تو ان سے الرجک تھیں۔ اِنھیں کیا ہوا؟ پاس جا کر سنا۔ کچھ خواتین سے کہہ رہی تھیں، ''دیکھا آپ نے اس کی کتابوں کو بھی غش آ گیا اور یہ کتاب دیکھ رہی ہیں آپ۔ شفیق الرحمٰن کی کرنیں۔ میں نے ایک دفعہ ہاتھ سے چھین کر پھینک دی تھی، تو بہت ناراض ہوئی تھی۔ اسے غصّہ بہت کم آتا تھا، مگر ان حضرت کی وجہ سے ہماری خوب جنگ ہوتی اور ہمیں شکست نصیب ہوتی۔ یہ بجنگ آمد، اندلس میں اجنبی، ہمہ یاراں دوزخ، تادمِ تحریر، انشا جی کا سیٹ (کتابوں کا) لبیک، رم جھم، ان سب کو صحیفے کہا کرتی تھی (چپکے سے نعوذ باللہ کہا عذرا نے)۔ یہ ہماری جنگوں کا باعث تھے۔'' پھر بین کے انداز میں بلند آواز سے بولی، ''ہائے اب ان گری کتابوں کو کون اُٹھائے گا۔ اِن بڈھے ادیبوں کے پیچھے مجھ سے کون لڑے گا۔''

(یہ عذرا کے خیالات ہیں، ہمارے قطعی نہیں)۔ اس وقت ہمیں یہ شدید خدشہ ہوگیا کہ کیا واقعی ہم عینِ عالمِ جوانی میں ان سوگواران کو داغِ مفارقت دے گئے ہیں، ورنہ عذرا سے اتنی حقیقی ایکٹنگ کی امید نہ تھی۔ ہاتھ میں چٹکی لینا چاہی، تو ایسا لگا جیسے ہوا میں ہاتھ چلا دیا۔ اُف! تو کیا ہم واقعی .....؟ نہیں، نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ ہمارے سہانے خواب، رزلٹ کا انتظار، آرمی میڈیکل میں داخلہ، ہارٹ سپیشلسٹ، ورلڈ ٹور، اسپین کے غاروں کا زامبرا رقص ..... اُف کیا اِس قدر جلدی سپنے چکنا چُور بلکہ چورم چُور ہوجاتے ہیں؟ اور ہم نے سچے دل کے ساتھ سب کے ہمراہ رونا شروع کر دیا۔ ہمیں اپنی جواں موت پر سیروں بلکہ منّوں ٹنوں کے حساب سے رونا آ رہا تھا۔ شاید ہی کوئی ''اپنی'' وفات پر اتنا رویا ہوگا۔ اب خیریت اسی میں تھی کہ چپ چاپ جا کر اپنے جسم میں داخل ہو جائیں اور مزے سے پس ماندوں کی حرکات کا نظارہ کریں ..... ہوں! تو یہ ہمارے سرہانے کون اِس قدر حلق کی گہرائی سے تلاوت کر رہا ہے؟ اوہو یہ تو ہماری دوست بشریٰ ہیں اور دائیں بائیں ہماری کزنز مع ہماری عزیز دوست فرح کے براجمان۔ سب سڑ سڑ کرتی جاتیں اور بلند آواز سے قرآن شریف پڑھ رہی تھیں۔ غور سے تلاوت سننے لگے، سیما، اسماء اور لبنیٰ تم کے مارے کچھ غلط پڑھ گئیں۔ دل میں آیا ٹوک دیں۔ عذاب ہم کو ہی ہونا تھا۔ پھر سوچا چپ رہیں (جو کام زندگی میں نہ ہوا، کب ہوا؟ ہائے قسمت) ساری عمر جملے بازیوں سے اِن لوگوں کو پریشان کیا۔ ہم انھیں بخش دیتے ہیں تاکہ یہ بھی ہمیں بخشیں (سپارے وغیرہ)۔ یوں روتا، سب کو ہٹاتا، دوڑتا چلا آ رہا ہے؟ قریب تھا کہ ہم پہ آن گرتا کسی نے تھام لیا۔ ہم نے بھی

غور سے دیکھا۔ اوہ یہ تو خالدہ باجی ہیں۔ یہ کہاں سے آ گئیں؟ یہ تو لندن میں تھیں۔ خیر اچھا ہوا ہمارا ''منہ'' دیکھ لیں گی ورنہ خواہ مخواہ حسرت رہ جاتی (اُن کو)۔ خالدہ باجی کے ہم آواز ہو کر جس طرح سب رو رہے تھے، ہمیں ''سارے دوست ہمارے'' یاد آ گیا۔

تھوڑی دیر میں ہمیں کسی نے پھر ڈسٹرب کیا یعنی چادر منہ سے ہٹائی۔ ہم نے بھی کن انکھیوں سے جائزہ لیا۔ ہمارے دراز قد احسان ماما تھے جن کے لیے اکھیاں پوری کھولنی پڑیں، بلکہ گردن کو بھی تکلیف دی، مگر وہ ڈرے نہیں۔ بس حسرت سے دیکھتے رہے۔ اپنے ہنس مکھ ماموں کی افسردگی سے ہم بھی افسردہ ہوئے۔ بے چارے جب بھی آتے، کہتے ''ہمارے یہاں کب آ رہی ہو؟'' زندگی میں تو جا نہ سکے، اب سوئم سے فراغت کے بعد انھی کی گاڑی میں ان کے گھر ہو کر آئیں گے، ہم نے دل کو تسلی دی۔

اک دم روشنی پھیل گئی۔ سب بتیاں روشن ہو گئیں۔ تو کیا شام ہو گئی؟ ''بھئی کیا ہمیں دفنانے کا ارادہ نہیں ہے؟'' ہم نے خالدہ باجی سے پوچھا، مگر شاید اُنھوں نے سنا نہیں (ورنہ وہ اِس وقت بے ہوش ہو چکی ہوتیں)۔ سابقہ تجربات کی روشنی میں چپ رہے۔

بھئی کیا بدتمیزی ہے؟ پھر چادر ہٹا دی۔ اوہ یہ ناصر میاں ہیں۔ یہ چھوٹے چچا مع فیملی اِتنی جلدی کیسے پہنچ گئے؟ کیا بچوں کی چھٹیوں کی وجہ سے پروگرام بن گیا اور یہاں آ کر اس ''سانحۂ عظیم'' کا پتہ چلا۔ ناصر کو بڑا افسوس تھا کہ اس نے میرے پھلجھڑی جیسے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ خاموش! خاموش امّی گلوگیر آواز میں کسی کو بتا رہی ہیں کہ ہماری وصیت کے مطابق شریف ماما اور فاروق چچا کا انتظار ہے۔ تو کیا عذرا نے ہماری شرارت میں لکھی ہوئی وصیت سب کو دکھا دی؟ اُف خدایا، ہم نے اِس میں کوئی نامعقول خواہشیں لکھی تھیں۔ اِس میں ہم نے اپنے کپڑے عذرا کے نام کیے تھے، تو وہ جو ہم نے نیا تنگ پاجامہ کرتا بنایا تھا، وہ اُس کو مل جائے گا؟ ہرگز نہیں!! ہم امّی کے خواب میں آ کر اُن کو منع کر دیں گے اور کہیں گے کسی ''مستحق'' کو دے دیں، یہ اور بات ہے کہ عذرا کو اپنی خوشی سے دے دیں۔

توبہ، اِس قدر شور! یہ کیا گھسیٹ گھسیٹ کر لایا جا رہا ہے؟ اخاہ! برف کی سلّیں! اب مزہ آئے گا۔ چند گھنٹے تو آرام سے کٹیں گے۔ افتخار بھائی، نیاز ماموں کو بتا رہے ہیں کہ شریف ماما نہ آ سکیں گے؟ دیارِ غیر میں رہنا کبھی کبھی بڑا کھلتا ہے، خاص طور پر ہم جیسے ''عزیزوں'' کی موت پر۔ انھیں کس قدر افسوس ہو گا کہ وہ اپنی سرپھری بھانجی کے آخری دیدار سے محروم ہوں گے۔ اگر وصیت پر پورا عمل درآمد ہو رہا ہے، تو کہیں عذرا نے شفو چچا کو تار نہ کروا دیا ہو۔ کون سی گھڑی تھی جو ہم نے وصیت لکھی تھی! شفو چچا سے ملنے کی کتنی خواہش تھی جو تمام خواہشوں سمیت حسرتوں کی لمبی فہرست میں شامل ہو گئی ہے۔

ٹلّی بھائی رونا دھونا بھول کر حساب لگا رہے تھے کہ کل صبح تک اتنے کی برف خرچ ہو جائے گی۔ کمبخت کو ساری زندگی ٹھنڈی چیزوں کا خبط رہا۔ فریزر کا ٹھنڈا پانی پی کر زندہ رہی۔ کوک اور آئس کریم کھا کھا کر گلا خراب کیا۔ دوائیں بھی مجھے ہی دینا پڑتی تھیں۔ اب مرنے کے بعد بھی، ٹھیک ہے بھئی عیش کر لے، اگر غلطی سے جنت میں چلی گئی (جس کا امکان بہت کم ہے) تو وہاں بھی ایئر کنڈیشنڈ محل ملے گا۔ واہ بھئی واہ کچھ لوگ واقعی کچھ معاملوں میں کچھ کچھ خوش نصیب ہوتے ہیں۔

اب غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ آنکھ اُس وقت کھلی جب کسی نے منہ پہ پانی ڈالا۔ ایک زوردار قسم کی دھاڑ کے ساتھ ہم اُٹھ بیٹھے، مگر یہ کیا؟ امّی اور آپی سے کس نے کہا ہے کہ ہمیں نہلائیں؟ مانا ہم کاہل ہیں، مگر ایسے بھی نہیں اور یہ پانی کون ڈال رہا ہے؟ یہ بڑی چچی جان ہیں ..... یہ کب

آئیں؟ تُف ہے ہماری یادداشت پر۔ ہم تو کل سے مرحوم ہیں۔ اچھا تو ہم ساری رات ''سوئے'' ہیں۔ اچھے بچوں کی طرح نہلائے گئے اور بدلائے گئے (بھئی کفنائے گئے)۔ پھر دوبارہ اُسی کمرے میں پہنچا دیے گئے۔ منہ پر چادر نہیں ڈالی گئی (شاید تھوڑا سا نور آ گیا ہوگا)۔ یہ سرخ سرخ سوجی آنکھوں سے ہمیں کون دیکھ رہا ہے؟ ارے یہ تو ہمارے چچا جان ہیں۔ ان کے چہرے پر اس قدر غم و اندوہ دیکھ کر ہمارا دل کٹ کر رہ گیا۔ یہ پاپا کل سے کہاں غائب ہیں۔ دل چاہا چچا جان سے پوچھیں، مگر چپ رہے۔ (مجبور ہیں اُف اللہ) نو بھئی سفید ٹوپی لگائے سامنے سے ہمارے والد صاحب آ رہے ہیں۔ چپ چاپ آ کر ہمارے سرہانے بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھیں بھی کچھ کہہ رہی تھیں۔ اب یہ ہر مہینے کون ان کے کپڑے استری کرے گا؟ ایسی کئی غم انگیز باتیں سوچ کر ہم سنگین قسم کے غمگین ہو گئے۔

غم سے نجات پانے کے لیے سوچا پورے گھر کا راؤنڈ لگائیں۔ بھوک لگ رہی ہے، ذرا باورچی خانہ سے ہو آئیں۔ یہ دروازہ اندر سے بند کیوں ہے۔ کھڑکی میں سے اندر جھانکا۔ ہوں! ناشتا ہو رہا ہے۔ خود اندر جا کر شریکِ طعام ہونے کی کوشش کی اور دروازہ کھلوائے بغیر اندر پہنچ گئے۔ کاش زندگی میں یہ قدرت حاصل ہوتی۔ کتنی مشکلیں آسان ہو جاتیں۔ ہم کو آتا دیکھ کر در خود بخود وا ہو گئے۔

اندر بڑے بڑے لوگ موجود تھے۔ کوئی ڈبل روٹی مکھن کھا رہا تھا۔ کوئی چائے نوش کر رہا تھا۔ لبنیٰ قورمہ اور نان کھا رہی تھی۔ ہمارا پسندیدہ کھانا! ہم نے بھی چکھنا چاہا۔ بہت مرچیں تھیں۔ یقیناً رفیع ماموں کے ہاں سے آیا ہوگا۔ ٹھنڈا پانی پیا اور باورچی خانے سے باہر آ گئے۔ برآمدے میں کوئی دیوار سے ٹیک لگائے، سر جھکائے کھڑا تھا۔ قریب گئے، چچا تھے۔ یہ ان کے پاس کون کھڑا ہے؟ چہرہ دیکھا دیکھا سا لگتا ہے۔ اوہو، یہ تو شفو چچا ہیں۔ یہ واقعی آ گئے۔ ہم کھڑے رہ گئے۔ ان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی اور وہ دھیمے دھیمے انداز میں غالباً تعزیت کر رہے تھے۔ بھائی نے آ کر بتایا پاپا قبر کے سلسلے میں گئے ہوئے ہیں۔ شفو چچا بہت اچھے انسان ہیں، ہم ملے بغیر ہی ان کے مرید ہیں اور جو اُن کے ملاقاتی ہیں، اُن کا حال کیا بتائیں۔ وہ بھی ہماری ناگہانی موت پر افسردہ تھے۔ چچا جان بھی آنسو ضبط کیے کھڑے تھے۔ یا اللہ آج یہ سب ہمیں رُلا کر دم لیں گے۔ اپنے مرنے کا شدت سے افسوس پہلی بار ہوا۔ زندگی میں ہمیں احساس ہی نہ تھا کہ اتنے پیارے پیارے لوگ ہمارے لیے افسردہ ہوں گے، ورنہ بخدا ہم پوری کوشش کرتے کہ موت کا فرشتہ واپس لوٹ جائے۔ ویسے بھی ہمیں عالمِ خواب میں شکار کیا گیا، جو اصولاً غلط ہے۔ کم از کم حملے سے پہلے اطلاع کر دینی چاہیے۔ ہم نے سنجیدگی کے ساتھ غور کیا کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا تھا۔ اپنی حماقت یاد آ گئی۔ دوپہر سونے سے پہلے کسی بات پر ناراض ہو کر سوچا تھا کہ بس مر ہی جائیں۔ ایسی دردناک، خوفناک اور خطرناک زندگی کا کیا فائدہ۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی بات بہت جلد سن لی، اگر معلوم ہوتا کہ قبولیت کی گھڑی ہے، تو ہم اپنی گھسی پٹی دعائیں جو مشہورِ عام ہو گئیں، مگر قبولِ عام نہ ہو سکیں، دوبارہ مانگ لیتے، مگر کیا ہو سکتا تھا۔

اب پچھتائے کیا ہوت
جب آ گئی ہم کو موت

افسردگی سے قدم اُٹھائے اپنے جسدِ خاکی میں واپس آ گئے۔ ساری کزنز اپنی پوزیشنیں سنبھالے مسکین صورت بنائے بیٹھی تھیں۔ اب وقتِ رخصت قریب تھا۔ ایک آنٹی نے آ کر کہا ''لڑکیو! کب سے بھوکی ہو، جاؤ شاباش کچھ کھا لو۔ تم لوگوں کے رونے سے اسے تکلیف ہوگی (واقعی ہمارا سر دُکھنے لگا تھا) چلو اُٹھو شاباش۔'' سب نے اجتماعی طور پر نفی میں گردن ہلا دی۔ ہم اس قدر زور سے ہنسے، اگر

وہ سب سُن سکتیں، تو اُٹھ کر بھاگ گئی ہوتیں۔ کافی دیر تک ہنسی آتی رہی دنیا والوں کی منافقت پر تو ویسے بھی زندگی ہنستے ہنستے گزر گئی۔ ہمارے بھائیوں کا کہنا تھا کہ ہماری وفات کے بعد ٹی وی سے ٹوتھ پیسٹوں کے اشتہارات آنا بند ہو جائیں گے۔ پتا نہیں ٹی وی والوں نے اِس بارے میں کیا کیا ہوگا۔ اپنے بارسوخ انکلز اور آنٹیز سے ہماری درخواست ہے کہ وہ یہ کام ضرور کروا دیں، ورنہ ایک گھرانے کی دل شکنی ہوگی۔

اوہو یہ ہم ہل کیوں رہے ہیں؟ اچھا تو ہماری مجبوری سے فائدہ اُٹھا کر ہمارے نہ چاہنے کے باوجود ہمیں لے جایا جا رہا تھا۔ ہم نے حسرت سے اپنے گھر کے در و دیوار پر نظر ڈالی جہاں ہم نے اپنے سنہرے 18 سال گزار دیے تھے۔ غم انگیز نظروں سے اپنے رشتہ داروں پر نظریں گاڑیں۔ ہماری ساری کزنز کھوئی ہوئی توانائی حاصل کرنے کے بعد کافی تندرست آوازوں میں رو رہی تھیں۔

مختلف لوگوں کے کندھوں سے منتقل ہوتے ہوئے آخرکار ہم اپنی آخری منزل پر پہنچ گئے۔ وہیں نمازِ جنازہ ہوئی۔ اب یقیناً ہمیں دفنا دیا جائے گا۔ منوں مٹی تلے! اُف خدایا!! رُواں رُواں کانپ اُٹھا۔ دل چاہا تھا کہ زور زور سے روئیں، مگر ساری زندگی مسکراتے رہے۔ اب مسکراہٹ لیے عالمِ بالا میں حاضر ہوں گے۔ موت تو اٹل حقیقت ہے۔ دل کو خوب تسلی دی، مگر ایک پھانس سی دل میں چبھ رہی تھی۔ عزیز پیارے لوگوں کی جدائی!! مگر جب بھی سب یاد آئے، مسکرا لیا کریں گے کہ شفو چچا کا کہنا یہی تھا۔ جن کا کہنا ہم نے اوّل جانا ہمیشہ۔

سو گواران نے قبر میں اُتار دیا۔ ہم نے اچھی طرح جائزہ لیا۔ خاصی کشادہ جگہ تھی۔ افوہ، یہ منہ پر کیا گر رہا ہے؟ مٹی آ رہی ہے۔ اب قبر پر مٹی ڈالی جا رہی ہوگی، محاورۃً نہیں، بلکہ عملاً۔ ہم گھبرا کر باہر نکل آئے۔ اوپر سے ہماری قبر بند ہو چکی تھی۔ اب پانی چھڑکا جا رہا تھا۔ وصیت کے مطابق پھولوں کے پودے لگائے جا رہے تھے۔ اپنی وصیت کی افادیت کا احساس ہوا۔ سر پر ایک درخت کی چھاؤں پہلے سے موجود تھی۔ خوبصورت جگہ تھی۔ ہماری پرانی کمزوری۔ ان جگہوں سے ہم کھینچ کھانچ کر لائے جاتے تھے، مگر اب ہمیشہ یہیں رہیں گے خوبصورتی کے درمیان یہ بات خوش کُن بلکہ بہت ہی مسرور کُن تھی۔

سب آہستہ آہستہ واپس جا رہے تھے۔ ہاں مگر کچھ لوگ دیر تک کھڑے حسرت بھری نگاہوں سے ہماری قبر کو تک رہے تھے۔ اب انھیں کون بتاتا کہ بھئی ہم تو باہر کھڑے ہیں؟ دیکھنا ہے، تو ہمیں دیکھو۔ لوگ چپکے چپکے آنسو بہا رہے تھے۔ وہ لوگ جو ہمیں ساری زندگی بہت عزیز رہے اور اب بھی ہیں۔ ہم بھی ان سب کو عزیز تھے، مگر کب تک رہیں گے؟ یہ اللہ جانے۔ ہم واپس اپنی قیام گاہ آ گئے جہاں منکر نکیر ہمارے منتظر تھے۔ اُن سے جو سوال و جواب ہوئے..... سینسر.....

یہ سوال و جواب ہم آپ کو نہیں بتائیں گے کہ اگر مستقبل میں آپ سب کے نمبر ہم سے زیادہ ہو گئے تو!! ہمارے پاس تو کوئی سفارش بھی نہیں ہے۔ آخر کمپیٹیشن بھی کوئی چیز ہے۔

◇○○

پیروڈی

دہلی میں پیروڈی شاعری کا مشاعرہ تھا۔ جب گلزار زتشی کا نام صدارت کے لیے پیش کیا گیا تو وہ انکسار سے بولے:

حضور! میں صدارت کا اہل کہاں ہوں؟

اس پر کنور مہندر سنگھ نے فرمایا:

مطمئن رہیں، آپ بھی صدر کی پیروڈی ہی ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر رضوان سعید

گرمیوں میں عصر کے بعد گھر سے کلینک کو جاتے ہوئے سڑک پر ایکسیڈنٹ کے وجہ سے ٹریفک میں کافی دیر پھنسا رہا۔ کلینک ایک گھنٹہ لیٹ پہنچا تو طبیعت پر جھنجھلاہٹ طاری تھی۔ اُسی کیفیت میں اپنے کمرے میں اپنے آپ کو پُرسکون کرنے کی کوشش میں ہی مصروف تھا کہ اچانک باہر گلی میں عجیب سا شور وغوغا ہونے پر میری بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا تو میرے استفسار پر معلوم ہوا کہ ایک خاتون مریضہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور اُس کے ساتھ آنے والے لوگ کلینک کے عملے کے ساتھ جھگڑ رہے ہیں کہ ہمارے مریض کو پہلے دکھایا جائے۔

ایمرجنسی صورت حال بھانپتے ہوئے میں نے مریضہ کو فوراً بلوا لیا۔ معلوم ہوا کہ مریضہ کی آنکھ ناقابل برداشت درد میں مبتلا ہے۔ دیکھنے میں سرخ بوٹی اور سوزش بھی محسوس ہو رہی تھی۔ پریشان کن بات یہ تھی کہ مریضہ کی بینائی بالکل بند تھی اور اسے شدید متلی ہو رہی تھی۔

چونکہ میرے کیبن میں باہر کے مقابلے میں روشنی قدرے کم ہوتی ہے، اس روشنی میں آتے ہی مریض کسی حد تک پُرسکون ہو جاتا ہے لیکن درد کی شدت اُسے قدرے بے چین کیے ہوئے تھی۔ تفصیلی معائنے سے قبل مریضہ کو درد اور قے کے لیے ایک انجکشن دیا تاکہ وہ آرام دہ حالت میں آ کر اپنا معائنہ کروا سکے۔ مریضہ کو کچھ افاقہ ہوا تو وہ اپنی تکلیف کے بارے میں معلومات دینے کے قابل ہوئی۔

مکمل معائنہ اور ہسٹری سے معلوم ہوا کہ اس وقت اسے کالے موتیے کا شدید حملہ ہوا ہے جس کی وجہ سے ایک آنکھ کی بینائی تقریباً بند اور دوسری آنکھ بھی متاثر ہو رہی ہے۔ اس کی متعلقہ دوا شروع کرنے کے بعد اپنی عادت کے مطابق میں نے ان لوگوں کو کالے موتیے کے متعلق معلومات دینی شروع کر دیں اور یہ بھی بتایا کہ یہ جاننا ان کے لیے اب سب سے زیادہ اہم اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ کالا موتیا ایک آنکھ کی بیماری نہیں بلکہ یہ دونوں آنکھوں کی بیماری ہے۔

دوسری اہم بات یہ کہ علاج بلاتعطل (یعنی بلاناغہ) جاری رہے تاکہ دوسری آنکھ کو بچایا جا سکے۔ تیسری یہ کہ دوائی کا مقصد بچی ہوئی نظر کی بحالی اور مزید شدید حملوں سے بچانا ہے۔

کالا موتیا

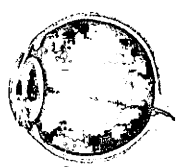

ٹھیک آنکھ

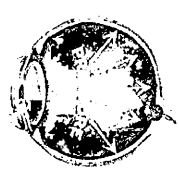

متاثرہ آنکھ

کیا اسے اندھا پن کہا جا سکتا ہے؟ جو آنکھوں کے امراض کا مکمل گروہ کہلاتا ہے

کالا موتیا کے بارے میں مزید معلومات

کالا موتیا آنکھ کو متاثر کرنے والے امراض کا ایک گروہ ہے۔ اس میں آنکھ کی بیرونی پرتوں پر پڑنے والے دباؤ میں غیر معمولی اضافے کی وجہ سے متعدد تبدیلیاں وقوع پزیر ہوتی ہیں۔

بصری قرص (Optic Dise) کا مقام یا ساخت میں تبدیلی

بصری میدان (Visual Field) میں بیرون سے اندرون کی جانب خلل کا واقع ہو جانا۔ (کالے موتیے سے متاثرہ مریض کا بصری میدان)

اس کا ایک دوسرا نام سبز موتیا بھی ہے۔ جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابتدا میں آنکھ کے عدسے اور قرینہ میں گہری کثافت کا آجانا ہے۔ ملتے جلتے ناموں کے باوجود سفید موتیا کی بیماری سے اس کا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ انگریزی میں اس کا نام یونانی لفظ (Glakos) سے ماخوذ ہوا ہے جس کے معنی چاندی یا بھوری رنگت سے آتے ہیں۔

طبی طور پر کی کسی بھی بیماری کی غیر موجودگی میں آنکھ کے بصری عصب کے سر (Optic Nerve Head) اور بصری میدان (Visual Field) میں ساختی اور فعلیاتی تبدیلیوں کے واقع ہو جانے کا نام ہے اور مناسب وقت پر مناسب علاج نہ ملنے کی صورت میں نظر کا ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔

عصب باصرہ (Optic Nerve)

بے شمار اعصاب کا مجموعہ جو پردۂ بصارت کے تمام خلیات سے بہت ہی باریک تاروں کی صورت میں ہماری دماغی بصارت کے نظام اور مرکز سے جڑا ہوتا ہے۔

"کالے موتیے (Optic Disc) میں ہونے والی تبدیلیاں"

اس کو کالے موتیے کی شناخت میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ایک اہم جز مانا جاتا ہے۔ آنکھ کو مجموعی طور پر ایک گیند سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ کسی فٹ بال کی صورت اس میں بھری ہوئی ہوا برقرار رہتی ہے۔ اس طرح آنکھ کی شکل برقرار رکھنے میں ایک معاون اور اہم مائع جو آنکھ کے اندر ہی بنتا ہے اہم کردار ادا کرسکتا ہے۔ اس مائع کو ہم خلط آبی (Aquaous Humor) کہتے ہیں۔ یہ ہدبی جسم (Ciliary Body) میں بنتا ہے۔ وجوہ میں:

☆ اس مائع (Aquaous Humor) کا ضرورت سے زیادہ بننا،

☆ اس کے اخراج کے نظام میں خرابی یا بندش،

☆ اس کی پیداوار اور اخراج کے تناسب میں کسی بھی قسم کے بگاڑ، درون العین دباؤ کا خلفشار کا شکار ہو جانا اور یہی زرق یا کالے موتیے کا باعث بننے میں اہم کردار نبھاتا ہے۔

کالے موتیے کے بارے میں بنیادی علم کے بعد عام طور پر مریض جو کچھ اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہے، وہ مندرجہ ذیل سوالات اور ان کے جوابات کی روشنی میں کافی حد تک واضح ہو جائے گا۔

سوال ۱: عام طور پر کن علامات کا کالے موتیے سے گہرا تعلق ہوتا ہے؟

کالے موتیے کے مریض عام طور پر آنکھ میں شدید درد یا سر درد، دھندلائی ہوئی نظر اور سرخ آنکھ کے ساتھ آنکھوں کے ڈاکٹر سے رابطہ کرتا ہے۔ لیکن ان تینوں علامتوں کا بیک وقت ظاہر ہونا ضروری نہیں۔ بنیادی طور پر ہر آدمی (عورت و مرد) جو 40 سال کی عمر سے زائد ہو، اُسے سال یا 2 سال بعد اپنی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ آنکھوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر سے کروا لینا چاہیے۔ کیونکہ اُوپر بیان کردہ تینوں علامات کی غیر موجودگی میں بھی یہ کسی کو ہوسکتا ہے۔ جتنی جلدی اس کے بارے میں پتہ چل جائے اتنا ہی زیادہ نظر کو بچایا جاسکتا ہے۔

سوال ۲: کالا موتیا کن لوگوں کو ہوسکتا ہے؟

کالا موتیا یوں تو بڑی عمر کے لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے لیکن پیدائشی طور بھی یہ بچوں میں ہوسکتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ ہر عمر کی بیماری ہے اور اس کا وقت پر علاج ضروری ہے ورنہ نظر مکمل طور ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ جانے والی نظر ناقابل واپسی ہوتی ہے۔

سوال ۳: کیا کالے موتیے کو روکا جاسکتا ہے؟

ہم کالے موتیے کو علاج سے ختم تو نہیں کرسکتے لیکن اس کے بڑھنے کے عمل کو روک کر اندھے پن سے بچا جاسکتا ہے۔ جس کے لیے ہمیں بروقت علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے جو بھی طریقۂ علاج اپنایا جائے، اس سے بیماری کو قابو میں کیا جاتا ہے مثلاً بلند فشارِ خون یا ذیابیطس کی بیماری میں۔

سوال ۴: کیا کالے موتیے کے تمام مریض اندھے ہو جاتے ہیں؟

خوش قسمتی سے جواب ''نہیں'' میں ہے لیکن اس ناں کے لیے بنیادی شرائط میں بروقت تشخیص اور علاج ہے۔ یہاں یہ نقطہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ نظر میں گراوٹ خاص طور پر بصری میدان میں صرف دس فیصد لوگوں میں ہوتی ہے اور اُن لوگوں میں زیادہ جو علاج کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

سوال ۵: کیا کالے موتیے کا مریض اپنی نارمل زندگی گزار سکتا ہے؟

اس کا انحصار مریض کے اپنے اُوپر ہوتا ہے اور درج ذیل سوالات کے جوابات اس پر روشنی ڈال سکتے ہیں۔

☆ کیا مرض کی تشخیص بروقت ہوئی؟

☆ کیا مریض کو بروقت علاج میسر ہوا؟

☆ کیا مریض باقاعدگی سے اپنا علاج کرتا ہے یعنی دوائی یا جو طریقہ ہے اس پر عمل کرتا ہے؟ اہم بات یہ ہے کہ اگر مریض ہی چاہے تو اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔

☆ کیا کالے موتیے سے مریض مرسکتا ہے؟

جواباً عرض یہ کہ کالے موتیے سے کسی کی موت واقع نہیں ہوتی۔ اگر آپ کالے موتیے کے مریض ہیں اور آپ اس وقت مکمل اندھے نہیں تو خوش قسمتی سے زیادہ چانس یہی ہے کہ آپ اندھے نہیں ہوں گے۔ ہاں لیکن کالے موتیے سے صرف عصب باصرہ (Optic Nerve) اور عصبی تاروں (Optic Radiations) کی موت واقع ہوتی ہے جو اندھے پن کا باعث بنتے ہیں۔

☆ کیا آپ واقعتاً کالے موتیے کے مریض ہیں؟

اگر آپ خدانخواستہ اندھے پن کا شکار ہوگئے ہیں تو اس کا فیصلہ اپنے معالج پر چھوڑ دیں کہ وہ وجہ تلاش کرے کہ آپ کے اندھے پن کی اصل وجہ کیا ہے؟ اور آپ کو کس طرح کے علاج کی ضرورت ہے۔ یاد رہے کہ:

''ہر اندھا پن کالے موتیے سے نہیں ہوتا اور ہر کالے موتیے کا مریض اندھا نہیں ہوتا۔''

کالے موتیے کے کون کون سے طریقے علاج کے لیے اپنائے جاتے ہیں؟

☆ اس میں آنکھ میں ڈالنے والی دوائیاں۔

☆ کھانے والی دوائیاں۔

☆ لیزر اور سرجری۔

ان میں موجود ایک کیمیائی مادہ جس کو (Catechins) کہتے ہیں آنکھ کے اندرونی دباؤ کو کم کرنے میں اور نظر کو مستقل کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ کافی اور چن اشیاء میں (Caffeine) پائی جاتی ہے وہ اندرونی دباؤ کے اضافے کا باعث ہوتا ہے اور کالے موتیے کے مریضوں میں مزید اضافے کا باعث ہوسکتا ہے۔

کیا کالا موتیا آنکھ کا کینسر ہے؟

کالا موتیا کالا اس لیے کہلاتا ہے کہ اس میں نظر مستقلاً ضائع ہوسکتی ہے یعنی اندھا پن لیکن یہ کینسر بالکل نہیں۔

☆☆☆

اولمپک کھیل

شیخ عبدالحمید عابد

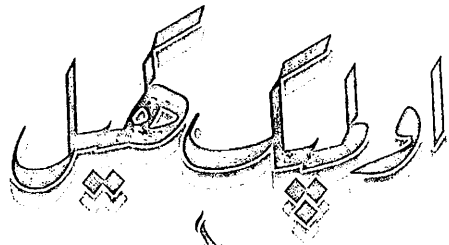

اولمپک کھیلوں کے مقبول ترین مقابلے کا نام ہے اور ان میں دنیا بھر سے ہزاروں کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ اولمپک کھیلوں کو دنیا کا اہم ترین مقابلہ تصور کیا جاتا ہے جس میں 200 سے زائد اقوام شریک ہوتی ہیں۔ اولمپک کھیلوں میں موسم سرما اور موسم گرما کے مقابلے ہر چار سال بعد منعقد ہوتے ہیں، یعنی دو اولمپک مقابلوں کے درمیان دو سال کا وقفہ ہوتا ہے۔

قدیم یونان کے مقام اولمپیا میں ہر چوتھے سال کھیلوں کے مقابلے منعقد ہوتے تھے۔ پہلا باقاعدہ مقابلہ 776 قبل مسیح میں ہوا۔ یہ میدان کے چکر کی ایک دوڑ تھی اور اسے سٹیڈ (Stade) کہتے تھے۔ اسی سے لفظ اسٹیڈیم نکلا۔ فاصلہ تقریباً دو سو گز تھا۔ چودھویں مقابلوں میں اس سے دگنے فاصلے کی دوڑ (تقریباً اڑھائی میل) جو اسٹیڈم کے بارہ چکر ہوتے ہیں پروگرام میں شامل ہوئی۔

اٹھارہویں کھیل میں سپہ گو قسم کے لوگوں کے لیے پینٹا تھلان (Pentathlon) کے نام سے ایک مقابلہ شروع کیا گیا۔ اس میں ہر کھلاڑی کو پانچ کھیلوں میں اپنی برتری ثابت کرنا ہوتی۔ ان میں لمبی چھلانگ، نیزہ پھینکنا، سٹیڈ دوڑ، ڈسک پھینکنا اور کشتی شامل تھی۔ بعد میں مکے بازی اور کشتی کے علیحدہ مقابلے بھی شروع ہوئے اور اسٹیڈیم کے قریب ہپوڈروم (Hippordrome) میں رتھ دوڑوں کے مقابلے

عالمی بھائی چارہ اور مثبت محرکات کو جنم دینے والی خوبصورت کہانی

ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ کئی اور کھیل بھی کھیلے جانے لگے۔

شروع میں اولمپک مقابلے صرف یونانی نسل کے نوجوان شرفا کے لیے مخصوص تھے۔ بعد میں کم عمر لڑکوں کو بھی شامل کیا جانے لگا۔ یونانی مقبوضات کے کھلاڑیوں کو حصہ لینے کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اولمپک کھیلوں کے ساتھ قدیم یونان کی بعض مذہبی روایات بھی وابستہ تھیں۔ پہلے پہل یہ جشن صرف ایک دن رہتا تھا۔ بعد میں اس کی تقریبات پانچ دن جاری رہنے لگیں۔

یونان کی مختلف ریاستیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں لیکن اولمپک کھیلوں کا وقت صلح کا دور تصور کیا جاتا۔ اس عرصے کے لیے تمام جھگڑے ختم کر دیے جاتے۔ قدیم یونانی ادب اور فنون لطیفہ اولمپک تحریک سے کافی متاثر ہوئے۔ پانچویں صدی قبل مسیح اولمپک کھیلوں کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد یونانیوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا تو ان کھیلوں کو بھی زوال آ گیا۔ 393ء میں رومی شہنشاہ تھیوڈوسیس اوّل نے حکماً اولمپک کھیلوں کو بند کر دیا۔

انیسویں صدی میں اولمپک تحریک میں ازسرنو دلچسپی لی جانے لگی۔ مشہور فرانسیسی عالم بیرون پی ایروئے کوبرتین کی کاوشوں سے 1896ء میں یونان کے دارالحکومت ایتھنز میں زمانہ قدیم کے اولمپک کھیلوں کا آغاز ہوا۔ یہ کھیل ہر چوتھے سال دنیا کے مختلف شہروں میں ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد دنیا بھر کے شوقیہ کھلاڑیوں میں صحت مندانہ مقابلے کا جذبہ پیدا کرنا اور عالمی بھائی چارے کو فروغ دینا ہے۔ ان کھیلوں نے رنگ و نسل کے امتیازات ختم کر دیے۔ یہی بات مذہبی اور سیاسی اختلافات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

جدید اولمپک کھیل عالمی پیمانے پر منعقد ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر گوشے کے شوقیہ (Amateur) کھلاڑی ہزاروں کی تعداد میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ آج کل اتھلیٹکس، باسکٹ بال، باکسنگ، سائیکلنگ، فٹ بال، پیراکی، ہاکی، جمناسٹک، کشتی، گھڑسواری، ویٹ لفٹنگ، نشانہ بازی، شمشیر زنی، سپہ گری، کشتی دانی، واٹر پولو، کینوئنگ (Canoeing) اور بادبانی (Yachting) کے مقابلے ہوتے ہیں۔ سرمائی کھیلوں کے مقابلے ان کے علاوہ ہیں۔ پہلے ٹینس، تیر اندازی، رسہ کشی، گاف، پولو وغیرہ کے مقابلے بھی ہوتے تھے لیکن اب یہ کھیل اولمپک مقابلوں میں شامل نہیں ہیں۔

قدیم اولمپک کھیلوں میں جیتنے والے کا انعام زیتون کے پتوں کا تاج ہوتا جو اس کے سر پر پہنایا جاتا۔ جدید مقابلوں میں اوّل دوم اور سوم آنے والے کھلاڑیوں کو بالترتیب سونے (ملمع) چاندی اور کانسی کے تمغے دیے جاتے ہیں۔

جدید اولمپک کھیل شہروں کی طرف سے منعقد کرائے جاتے ہیں۔ ہر دفعہ اولمپک کھیلوں کے لیے کئی شہر اُمیدوار ہوتے ہیں۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی ان کی درخواستوں پر غور کر کے کسی ایک کے حق میں فیصلہ دے دیتی ہے۔ پاکستان 1948ء سے اولمپک میں شرکت کر رہا ہے۔ 1960ء کے کھیلوں میں جو روم (اٹلی) میں ہوئے تھے، پاکستان نے ہاکی میں طلائی تمغہ حاصل کیا اور اس طرح ہاکی میں عالمی برتری قائم کی۔

اولمپک تقریبات قدیم اولمپک کھیلوں کے جشن کا ایک اہم جزو یونانیوں کی مذہبی تقریبات تھیں۔ ان میں سے بعض تقریبات جدید اولمپک کھیلوں کے موقع پر بھی منائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان کی اہمیت اب محض رسمی ہے۔ سب سے پہلے اولمپک مشعل روشن کی جاتی ہے۔ قدیم اولمپک کھیلوں کے بجائے وقوع روولمپیا میں زیئس دیوتا کے کھنڈرات میں سورج کی شعاعیں آتشی شیشے میں گزار کر ایک مشعل روشن کی جاتی ہے۔

یہ مشعل ایک نوجوان یونانی عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جس نے قدیم دیویوں کا سا لباس پہنا ہوتا ہے۔ اس کے گرد اسی قسم کا لباس پہنے خدمتگار عورتیں ہوتی ہیں۔ دیوی

ایک یونانی جوان کو مشعل تھما دیتی ہے، جو اسے لے کر دوڑنا شروع کرتا ہے۔ ایک مقررہ فاصلے تک دوڑنے کے بعد یہ مشعل دوسرے آدمی کو دے دی جاتی ہے۔

اس مشعل کو بروقت روشن رکھا جاتا ہے اور اسے حسب موقع بحری یا ہوائی جہاز کے ذریعے منزل مقصود کے قریب پہنچایا جاتا ہے۔ یہاں سے پھر اُسے لے کر دوڑنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ آخری آدمی اُسے لے کر عین افتتاحی تقریب کے موقع پر اسٹیڈیم میں داخل ہوتا ہے۔ اسٹیڈیم کا ایک پورا چکر لگانے کے بعد وہ شعلے کو ایک خاص طور پر تیار کردہ آتش دان میں منتقل کر دیتا ہے۔

جدید اولمپک کھیل دو ہفتے تک جاری رہتے ہیں۔ اس دوران میں شعلے کو ہر وقت جلتا رکھنے کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ اسٹیڈیم میں شعلہ روشن کرنے سے پہلے تمام حصہ لینے والے کھلاڑیوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ سب سے آگے یونان کے کھلاڑی داخل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد میزبان ملک کی زبان کے حروف ابجد کے اعتبار سے تمام ملکوں کے کھلاڑی آتے ہیں۔ ہر ملک کے کھلاڑیوں کے آگے اس ملک کا جھنڈا اور ایک تختے پر ملک کا نام ہوتا ہے۔

اس کے بعد میزبان ملک کا فرمانروا یا صدر کھیلوں کے افتتاح کا اعلان کرتا ہے۔ نقارے بجائے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ موسیقی کے ساتھ اولمپک جھنڈا بلند کیا جاتا ہے۔ پھر کبوتر چھوڑے جاتے اور تین توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔ اس لمحے اولمپک مشعل اسٹیڈیم میں داخل ہوتی ہے۔

اب اولمپک حلف اُٹھایا جاتا ہے۔ تمام ملکوں کے جھنڈے اُٹھانے والے نصف دائرہ بناتے ہیں۔ میزبان ملک کا ایک کھلاڑی اپنے علمبردار کو لے کر آگے بڑھتا ہے اور تمام حصہ لینے والے کھلاڑیوں کی جانب سے کھیل کے اُصولوں پر کاربند رہنے کا حلف اُٹھاتا ہے۔ اس کے بعد میزبان ملک کا قومی ترانہ بجایا جاتا اور پھر مختلف کھیلوں کے مقابلے، پروگرام کے مطابق شروع ہو جاتے ہیں۔

اولمپک جھنڈا سفید کپڑے کا ہوتا ہے۔ وسط میں پانچ رنگین دائرے زنجیر کی صورت ملے ہوتے ہیں۔ جھنڈے کی سلاخ کی طرف نیلا، پھر زرد، سیاہ، سبز اور سرخ دائرے پانچ براعظموں کی اولمپک تحریک میں شمولیت ظاہر کرتے ہیں۔ یہ جھنڈا پہلے پہل 1920ء میں استعمال ہوا تھا۔ ساٹن کا بنا ہوا اصل جھنڈا ہر دفعہ اولمپک کھیلوں کے موقع پر ایک میزبان شہر سے دوسرے کو پہنچایا جاتا ہے۔

یہ دائرے اولمپک نشان تصور ہوتے ہیں۔ تمام ملکوں میں ان کا استعمال سوائے اولمپک تحریک کے سلسلے میں قانوناً منع ہے۔ یہی صورت اولمپک ماٹو (ہمیشہ تیز تر، ہمیشہ بلند تر، ہمیشہ مضبوط تر) کی ہے۔ ہر کھیل کے مقابلے کے بعد فتح کی تقریب ہوتی ہے۔ ایک خاص چبوترے پر اوّل آنے والا کھلاڑی (ٹیم کی صورت میں کپتان) درمیان میں بلند جگہ پر کھڑا ہوتا ہے۔ دوم آنے والا کھلاڑی اس کی دائیں جانب اور سوم آنے والا بائیں طرف۔ دونوں ذرا نیچے ہوتے ہیں۔ کوئی معزز فرد ان کو تمغے دیتا ہے اور پھر ان تینوں کے قومی جھنڈے ان کے پیچھے اسی ترتیب سے بلند ہوتے ہیں۔ اوّل آنے والے کھلاڑی کے ملک کا قومی ترانہ بجتا ہے اور یہ تینوں جھنڈوں کی طرف منہ کر کے سلامی دیتے ہیں۔

اختتامی تقریب کے موقع پر تمام کھلاڑیوں کا دوبارہ اجتماع ہوتا ہے۔ یونان، میزبان ملک اور آئندہ مقابلوں کے میزبان ملک کے جھنڈوں کو سلامی دی جاتی ہے۔ انٹرنیشنل اولمپک کمیٹی کا صدر آئندہ اولمپک کھیلوں میں شرکت کی دعوت دنیا بھر کے نوجوانوں کو دیتا ہے اور میزبان ملک کا سربراہ کھیلوں کے اختتام کا اعلان کرتا ہے۔ پھر نقارے بجتے ہیں۔ موسیقی کے ساتھ اولمپک شعلہ بجھایا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اولمپک جھنڈا اُتار لیا جاتا ہے۔ اس موقع پر توپوں کی سلامی دی جاتی ہے۔

2008ء میں منعقد ہونے والے اولمپکس مقابلوں کو بیجنگ 2008ء اولمپکس بھی کہا جاتا ہے۔ ان مقابلوں کا آغاز 8/اگست کو ہوا جو 24/اگست 2008ء تک جاری رہے۔

204 نیشنل اولمپک کمیٹیوں میں سے کل 10942 کھلاڑیوں نے ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ ان مقابلوں کے انعقاد کے حوالے سے منفرد بات یہ ہے کہ چین کو پہلی بار اولمپکس کی میزبانی ملی اور بہت ہی خوبصورتی سے بیجنگ میں اولمپکس مقابلوں کو کھیلا گیا۔

ان کھیلوں کو کامیابی سے منعقد کروانے کے لیے چین نے تقریباً 44 بلین روپے خرچ کیے۔ ان مقابلوں میں چین نے 48 سونے کے تمغے جیتے اور پہلی پوزیشن حاصل کی۔ امریکا ان مقابلوں میں دوسرے نمبر پر رہا جبکہ روس نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ 2012ء سمر اولمپکس کو لندن 2012ء اولمپکس بھی بولا جاتا ہے کیونکہ 2012ء میں اولمپکس کے مقابلے برطانیہ کے عظیم شہر لندن میں کھیلے گئے۔

ان مقابلوں کا آغاز 27 جولائی 2012ء کو ہوا اور 12/اگست 2012ء کو یہ مقابلے اختتام پزیر ہوئے۔ ان مقابلوں میں کل 10768 کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ اولمپکس مقابلے کے انعقاد کے حوالے سے لندن کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ برطانیہ کے شہر لندن کو تین مرتبہ ان مقابلوں کی میزبانی کا شرف حاصل ہے۔ 2012ء اولمپک مقابلے اس وجہ سے بھی منفرد خصوصیت رکھتے ہیں کہ ان مقابلوں میں سعودی عرب، قطر اور برونائی کی طرف سے خواتین کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔

خواتین باکسنگ کے مقابلے کو پہلی بار اولمپکس میں شامل کیا گیا۔ ان مقابلوں میں امریکا پہلے، چین دوسرے اور میزبان برطانیہ تیسرے نمبر پر رہا۔

2016ء میں منعقد ہونے والے اولمپک مقابلے جن کو ریو 2016ء (RIO 2016) بھی بولا جاتا ہے۔ برازیل کے مشہور و معروف ریوڈی جیزو میں کھیلے گئے۔ 5/اگست 2016ء سے شروع ہونے والے یہ مقابلے 21/اگست 2016ء تک جاری رہے۔ ان مقابلوں میں 205 نیشنل اولمپک کمیٹیوں سے 11000 سے زائد کھلاڑیوں نے حصہ لیا۔ ان میں سے جنوبی سوڈان، کوسووہ اور رفیوجی اولمپک ٹیموں نے پہلی بار حصہ لیا۔

ریو جنوبی امریکی خطے کا پہلا شہر ہے جس کو اولمپک مقابلوں کی میزبان کا شرف حاصل ہے۔ میزبان شہر کے 33 مختلف مقامات پر یہ مقابلے کھلے گئے۔ 2016ء میں کھیلے جانے والے اولمپکس مقابلوں میں 28 مختلف کھیلیں کھیلی گئیں۔ امریکا نے 46 سونے کے تمغے جیت کر پہلی پوزیشن لی۔ برطانیہ نے دوسری اور چین نے تیسری پوزیشن حاصل کی جبکہ میزبان ملک برازیل نے سات سونے کے تمغے حاصل کیے اور تیرہویں پوزیشن حاصل کی۔

اولمپک مقابلوں نے اس قدر وسعت اختیار کرلی ہے کہ اب ان مقابلوں میں تقریباً ہر قوم کی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس ترقی نے متعدد چیلنجوں اور تنازعات کو بھی جنم دیا ہے، جن میں بائیکاٹ، ڈوپنگ، رشوت ستانی اور 1972ء میں دہشت گردانہ حملہ شامل ہے۔ جنگ عظیم کے باعث 1916ء، 1940ء اور 1944ء کے مقابلے منسوخ کردیے گئے تھے۔ جبکہ سرد جنگ کے باعث بڑے پیمانے پر بائیکاٹ کے نتیجے میں 1980ء اور 1984ء کے مقابلوں میں شرکت محدود رہی۔ تاہم اولمپکس ہر دو سال میں گمنام کھلاڑیوں کو قومی اور بین الاقوامی سطح پر مشہور ہونے اور خود کو منوانے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ مقابلے میزبان شہر، ملک اور قوم کے لیے خود کو دنیا بھر کے سامنے پیش کرنے کا موقع بھی ہوتے ہیں۔

☆☆☆

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح ہندوستان کی فوجوں نے پاکستان کی سرحد عبور کی اور ایک بھرپور حملے کی نیت سے لاہور کی طرف پیش قدمی شروع کی۔ تاہم پاکستانی فوج کے شیر دل جوانوں اور زندہ دلانِ لاہور نے دشمن کا یہ منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ اہلِ لاہور نے اس مشکل گھڑی میں اپنی فوج کا ساتھ دیا اور ان کے شانہ بشانہ لڑتے رہے۔ پوری پاکستانی قوم نے بے مثال اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ کیا۔ ہر طبقے کے افراد اپنی افواج کے حوصلے بڑھانے میں پیش پیش تھے۔ ادبی محاذ پر شعراء و ادباء نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لیے اور ان کے قلم دشمن کے لیے تلوار بن گئے۔ ایسے میں عساکرِ پاکستان سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم کو دوہری ذمہ داریاں نبھانا پڑیں۔ ایک طرف وہ محاذِ جنگ پر مصروفِ عمل تھے اور دوسری طرف قلمی جہاد جاری رکھے ہوئے تھے

اس قلمی محاذ پر جو شاعر پیش پیش تھے ان میں ایک نام جعفر طاہر کا ہے۔ جعفر طاہر نامور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ عساکرِ پاکستان میں ایک طویل عرصہ خدمات انجام دیتے رہے۔ لاہور کی حفاظت کے حوالے سے آپ کی نظم کا ایک بند ملاحظہ ہو:

لاہور کی حفاظت مولا علیؓ کرے گا
دشمن کرے برائی داتا بھلی کرے گا
یہ صرصرِ اجل ہے یہ گردِ خانقاہی
یہ ایک سو سپاہی، یہ شیر دل الٰہی

سراج الدین ظفر اپنے جداگانہ اسلوبِ بیان کی وجہ سے اُردو شاعری میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ آپ پاک فضائیہ میں فلائیٹ لیفٹیننٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کی ایک طویل نظم ''شہیدانِ وطن'' کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

دبے ہیں جو تیرے سینے میں اے زمینِ وطن
تجھے بھی یاد ہیں وہ غازیانِ شعلہ نوا
وہ تیرے دردکشانِ شرابِ آزادی
وہ تیرے خلوتیانِ نگارخانہ زاد
وہ جن کے خون سے سینچے گئے ترے ذرّے
وہ جن کے ہوش سے کانپے ترے نشیب و فراز
وہ جن کی موت نے کی پیش شہرتِ ابدی
وہ جن کو عشق کی درگاہ سے ملا اعزاز

سید عبدالعلی شوکت پاک فضائیہ میں اسکوارڈن لیڈر کے عہدے پر فائز تھے اور عمدہ شعری ذوق رکھتے تھے۔ جنگ ستمبر کے دوران آپ انٹر سروسز سلیکشن بورڈ میں بطور ماہر نفسیات تعینات تھے۔ آپ جنوری ۱۹۸۴ء میں اسکوارڈن لیڈر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ آپ نے پاک فضائیہ کے شاہینوں کو اپنی نظم ''مجاہدین پرفشاں'' میں یوں خراج تحسین پیش کیا:

مجاہدین پرفشاں، بلندیوں کے شہسوار
بعزم جزم و باکیقیں، ہیں عظمتوں کے شاہکار
دیارِ پاک پر بقلب وجان وجسم ہیں نثار
ہیں وسعتیں ہی وسعتیں مکاں سے لامکاں تک
اُڑے چلو اُڑے چلو زمیں سے آسمان تک

منیر نیازی کو بحیثیت شاعر کون نہیں جانتا لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ منیر نیازی قیامِ پاکستان سے قبل رائل نیوی میں سیلر بھرتی ہوئے تھے۔ اگرچہ آپ نے بہت کم عرصہ نیوی میں گزارا تاہم آپ کا نام عساکرِ پاکستان کے اہل قلم میں شامل ہے۔ منیر نیازی نے بھی دیگر شعراء کی طرح جنگ ستمبر کا گہرا اثر قبول کیا۔ آپ نے پاکستان کے شہروں کو جنگ کی ہولناکیوں سے محفوظ رکھنے کی دعائیں مانگیں۔ وہ اپنی نظم ''اپنے شہریوں کے لیے دعا'' میں یوں رقمطراز ہیں۔

پاکستان کے سارے شہرو زندہ رہو پائندہ رہو
روشنوں رنگوں کی لہرو زندہ رہو پائندہ رہو
عظمت وہیبت کی دیوارو زندہ رہو پائندہ رہو
ارضِ خدا پر مہکتے باغو زندہ رہو پائندہ رہو
حق کی رضا ہے ساتھ تمہارے زندہ رہو پائندہ رہو
میری وفا ہے ساتھ تمہارے زندہ رہو پائندہ رہو

سید ضمیر جعفری عساکرِ پاکستان کے نمائندہ شعراء میں سے تھے۔ آپ نے فوج میں ملازمت اختیار کی اور میجر کے عہدے تک ترقی پا کر ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے۔ ضمیر جعفری شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرنے والے جوانوں کو کیسے خراج تحسین پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہو:

کمال پور کا دلیر دستہ وہ شیر لشکر کا شیر دستہ
غنیم کی درکشادہ توپوں کے سر پہ تلوار بن گئے تھے
زمیں کی شمعوں، گواہ رہنا، فلک کے تارو گواہ رہنا
وفا کے بیدار منزلوں میں، غنیم کے سر مقتلوں میں
ہماری تاریخ کی شفق رنگ یادگار و گواہ رہنا
ہمیشہ روشن، ہمیشہ زندہ، کمال پور کا دلیر دستہ

صوبیدار افضل حسین اُردو زبان کے ایک ممتاز شاعر، ادیب، مزاح نگار، مترجم اور صحافی تھے۔ آپ کی نظم کا عنوان ''معرکہ سلیمانکی'' ہے۔ اس نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:

مرے ندیمو مرے رفیقو
یہ پاک کشور کے سرفروشوں کی جرأت انگیز داستاں ہے
جہاں تھی مضبوط قلعہ بندی جہاں پہ مٹی کے تودوں
کی تھی کھڑی بلندی
جہاں مزاحم رکاوٹیں زیرِ آب بھی تھیں
یہیں پہ راجہ نے اور عدالت نے اپنی دکھلائی تھی
شجاعت
بنائی توپوں کی خوب دُرگت، دلاوری کا عجیب منظر
جہاں نے دیکھا
یہیں پہ شہیہ کو ملی نعمتِ شہادت،
بنا جہاں وہ عظیم تر مظہرِ قیادت

ونگ کمانڈر رحمان کیانی کی رزمیہ نظموں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں عالمگیر شہرت حاصل کی۔ آپ اعلیٰ پائے کے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ پاک فضائیہ میں افسر بھی تھے۔

خوش بیاں شاعرو خوش نوا مطربو
تم بھی شامل ہماری دعا میں رہو
حق و انصاف کی ہر لڑائی میں ہم
بحر و بر اور فضا کے سپاہی بہم
ملتِ پاک کی سرزمیں کے لیے
دینِ فطرت کی فتح مبیں کے لیے

جان دیتے رہیں سر کٹاتے رہیں
ہم شہادت کے انعام پاتے رہیں
اور تم شاعرو مطربو دوستو
کارنامے ہمارے سناتے رہو
گیت لکھتے رہو گیت گاتے رہو

☆☆☆

رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

یہ لہو سرخی ہے آزادی کے افسانے کی
یہ شفق رنگ لہو
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
جس کے ہر قطرے میں خورشید کئی
جس کی ہر بوند میں اک صبح نئی
دُور جس صبح درخشاں سے اندھیرا ہوگا
رات کٹ جائے گی گل رنگ سویرا ہوگا،
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
اپنی رفتار کو اب اور ذرا تیز کرو
اپنے جذبات کو کچھ اور جنوں خیز کرو
ایک دو گام پہ اب منزلِ آزادی ہے
آگ اور خوں کے ادھر امن کی آبادی ہے
خود بہ خود ٹوٹ کے گرتی نہیں زنجیر کبھی
بدلی جاتی ہے بدلتی نہیں تقدیر کبھی
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
یہ لہو سرخی ہے آزادی کے افسانے کی
یہ شفق رنگ لہو
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو
رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو

☆☆☆

الہام اور آزادی

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لیے مہمیز!
اس کے نفس گرم کی تاثیر ہے ایسی
ہو جاتی ہے خاک چمنستان شرر آمیز!
شاہیں کی ادا ہوتی ہے بلبل میں نمودار
کس درجہ بدل جاتے ہیں مرغانِ سحر خیز!
اس مردِ خود آگاہ خدا مست کی صحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہ جم و پرویز!
محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز!
(علامہ اقبال)

☆☆☆

۶ ستمبر ۱۹۶۵

چاند اس رات بھی نکلا تھا مگر اس کا وجود
اتنا خوں رنگ تھا جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اس رات بھی چمکے تھے مگر اس ڈھب سے
جیسے کٹ جائے کوئی جسم خسیں قاش بہ قاش
اتنی بے چین تھی اس رات مہک پھولوں کی
جیسے ماں جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش
پیڑ چیخ اٹھتے تھے امواجِ ہوا کی زد میں
نوکِ شمشیر کی مانند تھی جھونکوں کی تلاش
اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات
میری تاریخ کے سینے پر اُتر آئی تھی
اپنی سنگینوں میں اُس رات کی سفاک سپاہ
دُودھ پیتے ہوئے بچوں کو پرو لائی تھی
گھر کے آنگن میں رواں خون تھا گھر والوں کا
اور ہر کھیت پہ شعلوں کی گھٹا چھائی تھی
راستے بند تھے لاشوں سے پٹی گلیوں میں
بھیڑ سی بھیڑ تھی، تنہائی سی تنہائی تھی
تب، کراں تا بہ کراں صبح کی آہٹ گونجی
آفتاب ایک دھماکے سے اُفق پر آیا

اب نہ وہ رات کی ہیبت تھی، نہ ظُلمت کا وہ ظُلم
پرچمِ نُور یہاں اور وہاں لہرایا
جتنی کرنیں بھی اندھیرے میں اُتر کر اُبھریں
نوکِ پر رات کا دامانِ دریدہ پایا
میری تاریخ کا وہ بابِ مُنوّر ہے یہ دن
جس نے اِس قوم کو خود اُس کا پتہ بتلایا
آخری بار اندھیرے کے پُجاری سُن لیں
میں سحر ہوں، میں اُجالا ہوں، حقیقت ہوں میں
میں مُحبّت کا تو دیتا ہوں مُحبّت سے جواب
لیکن اَعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں
امن میں موجۂ نکہت مرا کردار سہی
جنگ کے دور میں غیرت ہوں حمیت ہوں میں
میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں
خاک کا طیش ہوں، اَفلاک کی دہشت ہوں میں
(احمد ندیم قاسمی)

☆☆☆

یوں بدلتی ہے کہیں برق و شرر کی صورت
قابلِ دید ہوئی ہے گل تر کی صورت
زلف کی آڑ میں تھی جانِ نظر کی صورت
رات گزری تو نظر آئی سحر کی صورت
ان کے لب پر ہے تبسم مری آنکھوں میں سرور
کیا دکھائی ہے دعاؤں نے اثر کی صورت
قافلے والو نئے قافلہ سالار آئے
اب بدل جائے گی اندازِ سفر کی صورت
کیا کرشمہ ہے مرے جذبۂ آزادی کا
تھی جو دیوار کبھی اب ہے وہ در کی صورت
اب کوئی حوصلہ افزائے ہنر ہے اختر
اب نظر آئے گی ارباب ہنر کی صورت
(اختر انصاری اکبر آبادی)

☆☆☆

وطن کی سرزمیں سے عشق و الفت ہم بھی رکھتے ہیں
کھٹکتی جو رہے دل میں وہ حسرت ہم بھی رکھتے ہیں
ضرورت ہو تو مر مٹنے کی ہمت ہم بھی رکھتے ہیں
یہ جرأت یہ شجاعت یہ بسالت ہم بھی رکھتے ہیں
زمانے کو ہلا دینے کے دعوے باندھنے والو
زمانے کو ہلا دینے کی طاقت ہم بھی رکھتے ہیں
بلا سے ہو اگر سارا جہاں ان کی حمایت پر
خدائے ہر دو عالم کی حمایت ہم بھی رکھتے ہیں
بہارِ گلشنِ امید بھی سیراب ہو جائے
کرم کی آرزو اے ابرِ رحمت ہم بھی رکھتے ہیں
گلہ نامہربانی کا تو سب سے سن لیا تم نے
تمہاری مہربانی کی شکایت ہم بھی رکھتے ہیں
بھلائی یہ کہ آزادی سے الفت تم بھی رکھتے ہو
برائی یہ کہ آزادی سے الفت ہم بھی رکھتے ہیں
ہمارا نام بھی شاید گنہ گاروں میں شامل ہو
جنابِ جوشؔ سے صاحب سلامت ہم بھی رکھتے ہیں
(جوشؔ ملسیانی)

☆☆☆

اے راہِ حق کے شہیدو وفا کی تصویرو
تمہیں وطن کی ہوائیں سلام کہتی ہیں

قارئین متوجہ ہوں
آپ بھی اس محفل کا حصہ بن کر اپنی منتخب شاعری، آراء پر مبنی خطوط اور مہذب ادبی لطائف ہمیں ہر مہینے کی ۱۰ تاریخ تک بھجوا سکتے ہیں۔ (شکریہ)

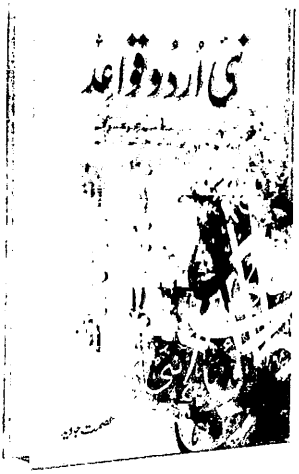

زبان وادب سے شغف رکھنے والوں کے لیے اردو قواعد نگاری ہمیشہ سے ہی ایک دلچسپ موضوع رہا ہے اور کیوں نہ ہو کہ کسی بھی زبان کی عمارت انھی ستونوں کے سہارے کھڑی ہوتی ہے جنھیں قواعد کا نام دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محققین اور نقاد اس موضوع پر تحقیق وتنقید کا بازار گرم کیے رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ مولوی عبدالحق سے شروع ہو کر تادمِ تحریر تسلسل سے جاری ہے۔

کتاب کے ابتدائیہ میں مصنف نے مولوی عبدالحق سے بات شروع کی ہے اور بتایا ہے کہ انھوں نے قواعد کے لیے کیا کام کیا ہے۔ ابتدایہ میں مولوی عبدالحق کا ایک اقتباس کچھ یوں ہے:

''صرف ونحو کی ابتدا یا اس کے متعلق جدوجہد ہمیشہ غیر قوم والوں کی طرف سے ہوئی کیونکہ اہلِ زبان اس سے مستغنی ہوتے ہیں۔ یہی حال اردو زبان کا ہوا۔ اس کی صرف ونحو اور لغت کی طرف اول اول اہلِ یورپ نے بہ ضرورت توجہ کی۔

بعدازاں جب یہ زبان مدارس میں پڑھائی جانے لگی تو صرف طلبہ کے لیے کتابیں لکھیں جانے لگیں۔ چنانچہ آج تک جس قدر کتابیں لکھی گئیں ان اصل غرض یہی تھی۔''

انیسویں صدی تک آتے آتے اگرچہ اردو زبان بہت ترقی کر گئی ہے مگر اس صدی میں آنے والے ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا کے طوفان نے جہاں دیگر اقدار کو ٹھیس پہنچائی ہے وہیں پر زبان خصوصاً اردو زبان بھی اس طوفان کے تھپیڑوں سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ وہ پھر چاہے رومن طرزِ تحریر میں وٹس ایپ، ایس ایم ایس اور فیس بک پر موجود تحاریر ہوں یا الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کی اپ ڈیٹس ہمیں ہر جگہ ہر زبان وبیان کی فاش غلطیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ پرنٹ میڈیا پر بھی اس رجحان کے اثرات نمایاں ہونے لگے ہیں۔ ایسے میں معیاری زبان کو کیسے لکھا اور بولا جائے کا سوال از سرِ نو شد ومد سے اٹھایا جانے لگا ہے۔

اس سوال کا جواب ہمیں جہلم بک کارنر کی جانب سے شائع ہونے والے مصنف عصمت جاوید کی کتاب ''نئی اردو قواعد'' میں ملتا ہوا نظر آتا ہے۔

عصمت جاوید کی اس کتاب میں پانچ ابواب شامل ہیں جن میں صوت، حرف اور نحو، مشتقات ومرکبات کے علاوہ اردو انگریزی اور انگریزی اردو اصطلاحات بھی شامل ہیں۔

اس میں عصمت جاوید قواعد کے متعلق ماضی کے نظریات پر بحث کے بعد رقمطراز ہیں کہ ''انیسویں صدی میں مختلف زبانوں کے یک زمانی ومطالعے اور تقابلی لسانیات کی ترقی نے قواعد سے متعلق اس نقطہ نظر کو کہ وہ منطق کے مماثل ہے حرف غلط قرار دے دیا اور یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ قواعد کے

اصول منطق کے پابند نہیں ہوتے۔ ہنری سویٹ غالباً پہلا شخص ہے جس نے قواعدی اور منطقی اقسام کی عدم مطابقت پر زور دے کر علم قواعد میں سائنٹفک روح پھونکی۔ آٹو لیسپر ین نے سویٹ کی ہئیت وظیفہ اور معنی والے طریقہ کار کو آگے بڑھایا اور ان تینوں کے درمیان زیادہ بہتر طریقے سے امتیاز قائم کیے۔"

فاضل مصنف نے قواعد نگاری پر بحث کے آغاز سے قبل ایک جامع ابتدائیہ میں قواعد کی اہمیت پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں ہر باب کے ذریعے درجہ بدرجہ زبان کو آواز، گرائمر، جملے اور مشتقات، مرکبات سے لاتے ہوئے ایک عمدہ تحریر نویسی کے نمائندہ اصول مرتب کیے ہیں۔

یہ کتاب اپنے موضوع اور ابواب کی تقسیم کے لحاظ سے اگرچہ خشک معلوم ہوتی ہے مگر مصنف نے اپنے دلچسپ اسلوب اور انداز بیاں سے اس کتاب کو نا صرف اردو زبان وادب کے باقاعدہ طالب علموں بلکہ عام قارئین کے لیے بھی سہل المطالعہ بنا دیا ہے۔ یہ کتاب آج کل کے پڑھنے والوں کی نسبت لکھنے والوں کو ترجیحی طور پر اپنی لائبریری میں شامل کرنا چاہیے اور جیسا کہ جون ایلیا نے کہا تھا جنھیں پڑھنا چاہیے وہ لکھ رہے ہیں، اس المیے سے بچاؤ اسی صورت ممکن ہے اگر ہمارے صحافی اور ادیب قواعد نگاری کے مسلمہ اصولوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے تحریر لکھیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے مطالعے کے بعد قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ زبان کا ارتقا ایک عمل مسلسل ہے۔ دنیا بھر کی زبانیں اپنی پیدائش کے دن سے لے کر آج تک اس ارتقائی عمل سے گزر رہی ہیں۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے اس زمین پر مختلف طرح کی مخلوقات نے جنم لیا مگر ارتقا کے عمل کے آگے صرف وہی مخلوقات بچ سکیں جن کے اندر نا صرف تبدیلیوں کے ساتھ ڈھلنے کی قوت تھی بلکہ بیرونی حملوں سے مدافعت بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ یونہی آج کی دنیا پر نظر دوڑائیں تو س

ہیں بولیوں سے زبان اور زبان سے پائیدار زبان بناتے ہیں۔ اس زبان کے قواعد نے ہی قوتِ مدافعت فراہم کی ہے۔ اردو زبان کو نا صرف اپنے پرانے قواعد کی تاریخ کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بھی قواعد میں تبدیلیاں لا کر "نئی قواعد" مرتب کرتے رہنا چاہیے۔ تا کہ اردو عالمی زبانوں کے مقابلے میں پورے قد سے کھڑی رہ سکے۔

یہ کتاب تحقیق کا ایک اعلیٰ نمونہ بھی کہی جاسکتی ہے کہ فاضل مصنف نے ہر باب کے آخر میں حواشی اور کتابیات درج کرنے کا پورا پورا اہتمام کیا ہے جس سے ان کی محنت اور اس کام سے اخلاص کا کھوج بآسانی لگایا جاسکتا ہے۔

اردو تحقیق صدیوں سے جاری وساری ہے اور لوگ مختلف اوقات میں اپنی بساط کے مطابق آئے دن نئی تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ اپنے دیباچہ میں مصنف نے بھی اپنی بات کو سمیٹتے ہوئے یہی کہا ہے کہ:

"یہ کتاب قواعد پر حرفِ آخر نہیں ہے اگر کوئی سرِ پھرا اس کام کو آگے بڑھائے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت اکارت نہیں گئی۔"

کتاب کے ٹائٹل پر احمد وصی کا خوبصورت شعر تحریر ہے:

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے
ایسی بولی وہی بولے جسے اُردو آئے

بک کارنر پرنٹرز، پبلشرز اینڈ بک سیلرز جہلم نے نہایت عمدہ کاغذ پر یہ کتاب چھاپی ہے۔ کتاب کی قیمت صرف ٦٠٠ روپے ہے۔ صفحات کی تعداد ۳۴۴ ہے۔ سرورق پر اردو زبان کے حروفِ تہجی نہایت نادر خط میں تحریر کیے گئے ہیں۔ اردو زبان کو سمجھنے کے لیے آج ہی اپنی لائبریری کا حصہ بنائیں آپ اس نمبر پر رابطہ کر کے براہِ راست منگوا سکتے ہیں۔

PakistaniPoint
www.pakistanipoint.com

ڈاکٹر صاحب کی تمام کتب کو میں نے ہمیشہ اپنے اندر ایک جہان لیے ہوئے ہی پایا۔ یہ کتاب بھی بہت اہم اور مختلف موضوعات کا خزانہ لیے ہوئے ہے۔ اس کتاب کے چیدہ چیدہ ابواب پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے خود ہی اس کا مکمل تعارف کروادیا ہے۔

دنیا کے 4200 مذاہب میں سے حق کی تلاش ایک مشکل کام ہے۔ پہلا باب ہمیں بتاتا ہے کہ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک ایک ہی دین قیامت تک کے لوگوں پر اُتارا گیا ہے۔ اس باب میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تمام انبیا کرام توحید کا ہی پیغام لے کر آئے تھے۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا میں ایک ہی دین ہوگا جس کی لوگ پیروی کریں گے اور وہ ہے صرف اور صرف اسلام۔

اس باب میں ہزاروں سال پرانی ان پیش گوئیوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جس کے مطابق موجودہ صدی یعنی اکیسویں صدی انقلابات کی صدی ہے۔ اس صدی میں ایک روحانی دور کا آغاز ہوگا۔ محبت اکسیر اعظم ہے اور محبت ہر چیز فتح کر لیتی ہے۔ ہمیں آپس میں محبت کو فروغ دینا چاہیے۔

دوسرے باب میں ان سوالات کے جوابات دینے کی کوشش کی گئی ہے جو لوگوں کے ذہنوں میں اُٹھتے ہیں کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جانا ہے؟ اس باب میں وجود ہستی باری تعالیٰ کے بارے میں دلائل پیش کیے گئے ہیں تاکہ وہ لوگ جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے ان کی راہنمائی ہو سکے۔ خاص طور پر اس باب میں ان بڑے بڑے سائنسدانوں اور اعلیٰ ماہرین کی آراء لکھی گئی ہیں جو اللہ کی ذات پر ایمان نہیں لاتے تھے مگر جب انھوں نے اپنے اپنے شعبوں میں ریسرچ کی تو وہ یہ بات ماننے پر مجبور ہوگئے کہ دنیا میں کوئی ایسی عظیم ہستی موجود ہے جس نے یہ کُل کائنات تخلیق کی ہے اور اس انتظام کو اکیلے، یکتا اور تنہا بڑی خوبی سے چلا رہی ہے۔

تیسرا باب انتہائی اہم موضوع لے کر سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ تلاش حق کے لیے تقابل ادیان کا مطالعہ بہت ضروری ہے کیونکہ یہ بات تو کسی کتاب میں نہیں لکھی کہ آپ جس مذہب میں پیدا ہوگئے وہی سچا ہے۔ جب ایک انسان یہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں ۴۰۰۰ سے زیادہ مذاہب ہیں تو وہ پریشان ہو جاتا ہے کہ شروعات کہاں سے کرے؟ اس باب میں ایسے ہی لوگوں کی مشکل آسان کرتے ہوئے دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے بارے میں بنیادی معلومات اور ان کا موازنہ اسلام کے ساتھ کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کا وقت بچ جائے اور وہ جلد از جلد صحیح اور درست راستے کا انتخاب کر لیں۔

چوتھے باب میں اللہ کا پیغام قیامت تک آنے والے انسانوں کے نام کے بارے میں ہے۔ اس باب میں قرآن کریم کے ۱۰۰ مختصر پیغامات بھی شامل کیے گئے ہیں تاکہ

لوگوں کو پتا چل سکے کہ اللہ ہمیں کیسی زندگی گزارنے کا حکم دیتا ہے۔

پانچویں باب میں یہ بتایا گیا کہ اللہ کے سب سے بڑے مجرم خود ساختہ اجارہ دار ہیں جو تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ جنہوں نے اللہ کے ایک دین کو ہزاروں ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور لوگوں کی دنیا اور آخرت، دونوں کو برباد کر دیا۔ اس کے بعد یہ ثابت کیا گیا ہے کہ فرقہ پرستی کتنا بڑا گناہ ہے۔ عام طور پر لوگ جانتے ہیں کہ شرک سب سے بڑا گناہ ہے لیکن قرآن کریم میں فرقہ پرستی کو کفر، عذاب اور شرک قرار دیا گیا ہے یعنی شرک فرقہ پرستی کا ایک حصہ ہے۔ اس کے بعد فرقہ پرستی کی تباہ کاریوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں بتایا گیا کہ اس زندگی کے بعد ایک لافانی زندگی ہمارا انتظار کر رہی ہے۔ یہ باب ان لوگوں کے لیے بہت اہم ہے جو کسی مذہب کے پیروکار تو ہیں مگر ان کے اعمال اچھے نہیں۔ اُمید ہے کہ یہ باب ان کی ہدایت کا باعث بن جائے گا۔ یہ باب اسلام کی سچائی کا بھی سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ساتویں اور آخری باب میں تخلیق انسان اور مقام انسانیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف بخشا اس لیے ہمیں اپنے مقام کی قدر کرنی چاہیے۔ خاص طور پر اس باب میں غیر مسلموں کی راہنمائی کے لیے اُن حیران کن پیش گوئیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو حضور ﷺ کے بارے میں تمام مذاہب کی مقدس کتابوں میں موجود ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے مسلم مفکر اور دانشوروں کا کہنا ہے کہ اسلام امن و آشتی کا پیغام ہے اور اسلام کا سنہری اصول زندہ رہو اور زندہ رہنے دو ہے۔ جارج برنارڈ شاہ نے تقریباً سو سال قبل پیش گوئی کی تھی کہ ''دنیا کا مستقبل مذہب اسلام ہے۔ وہ اس کی توانائی ہے۔ وہ زندگی کے بدلتے ہوئے ادوار کے تمام تقاضے بطریق احسن پورے کر سکتا ہے۔ بنی نوع انسان کے تمام مسائل حل کر سکتا ہے۔ فلسفہ و سائنس کی ترقی کو جذب کرنے ہی بڑی ہی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگلے سو سالوں میں انگلستان ہی نہیں پورا یورپ اسلام کی آغوش میں آ جائے گا اور انگلستان کا شاہی خاندان اسلام قبول کر لے گا۔''

بابا گرونانک فرماتے ہیں تورات، زبور، انجیل اور وید کی ہر کتاب کو خود بھی پڑھا اور دوسروں سے پڑھوا کر سنا، اس یُگ کے دور میں اگر ایک کتاب دنیا کو گناہوں سے پاک رکھ سکتی ہے تو وہ صرف قرآن ہے۔

بھارت کے مشہور ہندو لیڈر لالہ لاجپت رائے فرماتے ہیں کہ میں مذہب اسلام سے سچے دل سے محبت کرتا ہوں اس اسلام کے پیغمبر ﷺ کو دنیا کا مہا پرش (بہت عاقل اور بزرگ انسان) سمجھتا ہوں۔ میں قرآن کی معاشرتی، اخلاقی، روحانی اور سیاسی تعلیم کا دل سے مداح ہوں۔

اہل مغرب کے اسلام قبول کرنے میں صرف ایک رکاوٹ ہے۔ وہ یہ کہ انھیں اسلام کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ ایک ایسا مذہب بھی ہے جو عقل کو اہمیت دیتا ہے، حصولِ علم کا بھی داعی ہے اور تحقیق کے کام کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔ یہ سراسر ہمارا قصور ہے کہ ہم نے تبلیغ اسلام میں کوتاہی کی ہے۔

مختصراً یہ کہ اس کتاب کا بھرپور جائزہ اور تعارف محض دو صفحات پر کرنا ممکن نہیں۔ یہ اس کتاب کے ساتھ ناانصافی ہو گی۔ میری رائے ہے کہ اس کتاب کو ہر گھر کی ذاتی لائبریری میں موجود رہنا چاہیے نیز اگر اساتذہ دورانِ لیکچر، ایسی کتب کو شاگردوں کے ساتھ اپنی روزمرہ کی گفتگو کا حصہ بناتے رہیں تو نہ صرف ان کی نصابی بلکہ اخلاقی، معاشرتی اور دینی سطح پر بھی تعلیم و تربیت کی غذا کا اہتمام بخوبی ہو سکتا ہے۔

یہ کتاب اس نمبر پر رابطہ کر کے منگوائی جا سکتی ہے۔

03335 242146

Mind Masters کی پیشکش ڈاکٹر اختر احمد کے قلم سے

غلبہ اسلام کو مستقبل سے کھینچ کر حال میں لانے کا لائحہ عمل

اللہ کا پیغام اس کے بندوں کے نام

غلبہ اسلام کو مستقبل سے کھینچ کر حال میں لانے کا لائحہ عمل جو آپ کے اندر جوش و جذبہ پیدا کر دے گا۔ اسلام کا عروج قرآن سے ولادت تک انتہائی ایمان افروز معلومات۔

دنیا کو ہلا کر رکھ دینے والی تہلکہ خیز کتاب

تلاش حق

دنیا میں چھوٹے بڑے چار ہزار سے زائد مذاہب ہیں ایک انسان کے لیے مشکل ہے کہ وہ چار ہزار مذاہب میں سے یہ تلاش کرے کہ آج سچائی یا حق کدھر ہے اسی مشکل کو اس کتاب میں آسان بنایا گیا ہے۔

دنیا میں بیماریوں کی وجہ سے ڈاکٹروں، دواؤں پر خرچ ہونے والے اربوں روپے بچانے کا منصوبہ

صحت ہزار نعمت ہے

یہ کتاب آپ کو ڈاکٹروں کی فیسوں، دوائیوں کے خرچوں اور بیماریوں کی تکالیف سے بچائے گی پاکستان میں تقریباً 80% امراض غذا کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اس لیے ان کا علاج بھی قدرتی غذا سے ہونا چاہیے اس سلسلے میں مکمل راہنمائی کتاب میں موجود ہے۔

تمام مذاہب کے لیے حق کی طرف رہنمائی کرنے والی ایک راہنما کتاب

دنیا پر کون سا دین غالب آئے گا

تمام مسلمانوں کے ایمان کا جزء ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اسلام دنیا کے تمام مذاہب پر غالب آئے گا۔ تمام مقدس کتابوں کی ایسی حیرت انگیز پیش گوئیوں کا ذکر جس میں اسلام کی سچائی اور اس کے غلبہ کا ذکر موجود ہے۔

2020 انقلابات کا سال

عالمگیر انقلاب

کیا 2020 حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن سال ہے۔ دشمن اسلام تو 2023 کے چکر میں ہیں لیکن امت مسلمہ ان کو 2020 میں سرپرائز دے دیگی اب گیم امت مسلمہ کے ہاتھ میں ہوگی۔

غیر مسلموں کو مسلمان اور مسلمانوں کو مومن بنانے والی کتاب

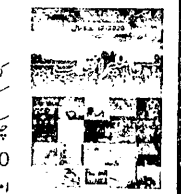

سنہری انقلاب

اس کتاب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمام پہلی مقدس کتابوں میں پیش گوئیوں کا ذکر موجود ہے، اسلام پر اعتراضات کا جواب بھی موجود ہے اور سنہری انقلاب کا ذکر موجود ہے جس کا انتظار دنیا کر رہی ہے۔

اہل اسلام کے ایمانوں کو تازہ کرنے اور مخالفین اسلام کے ایوانوں میں تہلکہ مچانے والی کتاب

اسلام کا دنیا پر بہت جلد دوبارہ عروج

اس کتاب میں ہزاروں سال پرانی پیش گوئیوں کے علاوہ بڑے بڑے مذہبی راہنماؤں اور تجزیہ نگاروں کی پیش گوئیوں کا بھی ذکر موجود ہے جو کہ اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام دنیا پہ غالب آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے دنیا میں انقلاب برپا کرنے والی کتاب

قرآن کا آفاقی اور انقلابی پیغام

سائنسدان سال ہا سال کی ریسرچ کے بعد جو دعوے آج کر رہے ہیں قرآن کریم نے 1400 سال پہلے بیان کر چکا ہے۔ اس کی حیرت انگیز تفصیل کتاب میں موجود ہے۔

حیران کن طلسماتی اور معجزاتی علم جو آپ کے خوابوں کو حقیقت میں بدل سکتا ہے

مائنڈ سائنس

مائنڈ سائنس آپ کی دماغی صلاحیتوں کو بہترین طور پر استعمال کرنے کا سائنسی طریقہ بتاتی ہے اس کے ذریعے آپ کے سارے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔

دنیا کے 99% لوگوں کی زندگیوں میں انقلاب لانے والی کتاب

دنیا سے غربت اور جہالت کے خاتمے کو عالمگیر منصوبہ

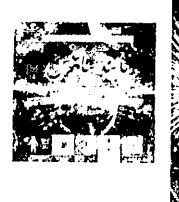

یہ کتاب آئیڈیاز کی کتاب ہے اس میں سینکڑوں آئیڈیاز ہیں جو کہ آپ کی زندگی میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ کتاب میں لاکھوں کروڑوں کے ساتھ ساتھ بلین ڈالرز کا آئیڈیا بھی ہے جو کہ پوری دنیا کی غربت اور جہالت کو ختم کر سکتا ہے۔

www.Gioquranmove.blogspot.com
www.Thinknget.blogspot.com

مائنڈ ماسٹرز لاہور۔ 0333-5242146
Visit.www.Gloyouthmove.blogspot.com

Tender documents are available at above mentioned offices and can be purchased on payment of printing & provision of documents charges as per PPR Rules 25 (7) in shape of CDR.

The undersigned may reject all bids proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposals, but is not required to justify those grounds.

In case of Public Holiday the sale & opening will be changed to next working day. The tenders will be opened 30 minutes after the closing as per PPRA Rules 30(I).

As per PPRA rules 25 (1) the bidding documents will be available after date of publication.

Sl #	Name of Work	Estimated Cost (Rs) in (M)	Time Limit	Bid Security (Earnest Money).	T.S. No.& Date	Publication & Photo Charges.	Last Date for issuance of tenders	Date & time for receipt opening of tenders
1.	Provision of Confident of external area (Iron chain fence) and provision boards in Judicial Complex, Narowal)	6.870	03-Month	5% of Estimated Cost	E.E.No. 170/DB dt: 12.08.2020	10000	21.09.2020	23.09.2020 01:30PM 02:00Pm

JPL-7850

Superintending Engineer,
Buildings Circle No.2
Gujranwala

Executive Engineer,
Building Division,
Narowal

TENDER NOTICE

Sealed tenders based on item rates are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors firms enlisted/renewed with C&W Department for the current financial year in the field of Buildings works.

Tender documents can be obtained, from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment upto date renewal letter/receipt of Professional Tax/PEC License Identity Card of contractors/manging partner/director of the firm along with registered power of attorney and prescribed printing and publication charges in the form of CDR/Bank Draft/Cashier's Cheque of any scheduled bank:-

i) Superintending Engineer, Buildings Circle No.2 Gujranwala/Division Head.
ii) Executive Engineer, Buildings Division Narowal.
iii) Deputy Director Development Narowal.

Tendered rates and amounts should be filed in figures as well as in words tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No. rebate on tendered rates will be acceptable.

Tenders will be received in the offices of Commissioner Gujranwala Division, Gujranwala Hall of Courts Council and will be opened simultaneously fixed date and time by the respective tenders/opening committee at the above venues in the presence of intending contractors or their representatives.

Conditional tenders and tenders not accompanied with earnest money@ 5% of the estimated cost in shape of CDR/Bank Draft/Cashier Cheque of any schedule Bank and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

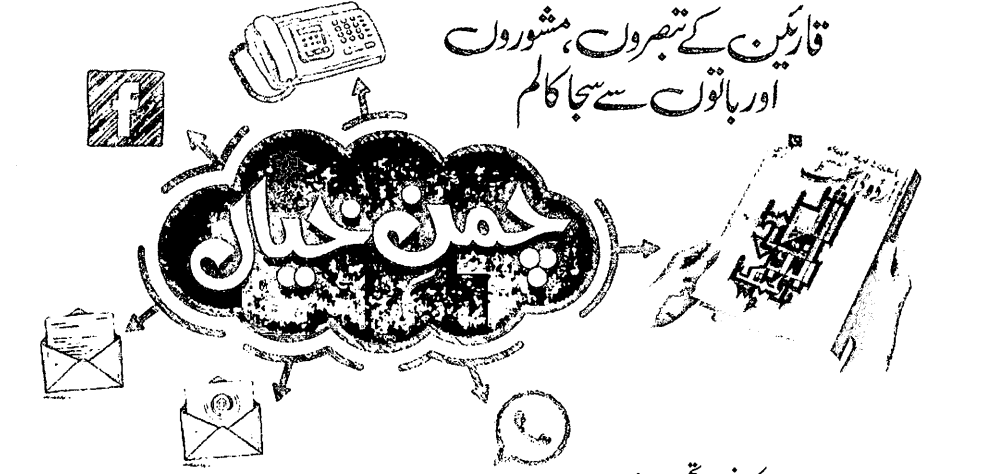

قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سجا کالم

پاک فوج تجھے سلام!

ہماری فوج دنیا کی بہترین افواج میں شمار ہوتی ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہو یا دشمن کے ساتھ دوبدو مقابلہ ہمارے شیر دل جوانوں نے ہمیشہ اپنے سینوں پر گولیاں کھائی ہیں لیکن ملکی پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ ہمیں اپنے سپاہیوں سے لے کر جرنیلوں تک کی پامردی اور شوق شہادت پر فخر ہے۔ ایسا کیوں ہے اس لیے کہ ہماری افواج کی پیشہ ورانہ تربیت کا ایک اعلیٰ اور منفرد معیار ہے اور یہی وہ معیار ہے جس بنا پر محفوظ شہید جیسے جوان چھوٹا رینک رکھنے کے باوجود نشانِ حیدر جیسے اعلیٰ ترین ایوارڈ کے حقدار ٹھہرتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ افراد آتے جاتے رہتے ہیں مگر ادارے قائم رہتے ہیں۔ یہ مقولہ افواج پاکستان جیسے مضبوط منظم ادارے پر بجا طور پر پورا اُترتا ہے۔ جب کوئی جرنیل ریٹائر ہوتا ہے تو اس کی جگہ لینے والا جرنیل اپنی پیشہ ورانہ صلاحیت اور قابلیت کے اعتبار سے اپنے پیش رُو سے کم نہیں ہوتا کیونکہ اس کی اور اس کے پیش رُو کی گرومنگ (Grooming) کا انداز یکساں ہے اور یہی وہ انداز ہے جو افواج پاکستان کی عزت و افتخار کا سرچشمہ ہے

(م ش ضیاء اسلام آباد)

☆☆☆

اقلیتی کمیشن کے لیے کچھ تجاویز

اقلیتی آبادی کے لوگ ہمارے برادران وطن ہیں۔ ریاستی معاملات میں ہم انھیں برابری کے حقوق دینا چاہتے ہیں۔ نہ کم نہ زیادہ۔ کمی اور زیادتی سے تلخی پیدا ہوتی ہے۔ اس خاکسار کی رائے میں اکثریت کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے جبکہ انڈیا جیسے ملک میں مسلمان اقلیت پر ظلم ہو رہا ہے۔ میری رائے میں تمام ممکنہ مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔

۱۔ اقلیتوں کے ساتھ برابری کا سلوک۔ نہ کبھی سودی کا ظلم، نہ کبھی مسلمانوں سے زیادہ حقوق، انصاف، برابری، مساوات۔

۲۔ سندھ میں ہندو کی آبادی تقریباً 7 فیصد ہے۔ سرکاری کالجوں، میڈیکل، انجینئرنگ وغیرہ میں ان کا کوٹا 7 فیصد ٹھیک مگر انھیں عام سیٹوں میں مقابلے کے ذریعے مزید سیٹیں لینے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیے۔

۳۔ انتخابات میں اپنے کوٹے سے اپنے نمائندے منتخب کرنے کے علاوہ ان کا عام انتخابات میں مسلمان اُمیدواروں کو ووٹ دینے کا حق واپس لینا چاہیے۔

۴۔ مغربی ممالک کی امداد سے چلنے والی NGO کو نکیل ڈالی جائے۔

۵۔ اقلیتی کمیشن میں قادیانی رکن شامل ہو اور اس سے پوچھا جائے کہ وہ اقلیت ہیں یا نہیں اور کیا وہ مسلمانوں کو مسلمان مانتے ہیں یا نہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ ہمیں غیر مسلم کہتے ہیں اور خود کو اقلیت بھی نہیں مانتے۔

(پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم)

☆☆☆

علم وہ ہوتا ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ علم تبدیلی لاتا ہے۔ علم شعور لاتا ہے۔ انسان کو حوصلہ دیتا ہے۔ خود اعتمادی دیتا ہے۔ علم انسان کی خودی کو اُجاگر کرتا ہے۔ آج کے سند یافتہ نوجوان کے پاس نہ شعور ہے، نہ حوصلہ ہے، نہ خود اعتمادی اور نہ ہی خودی۔ آج کے نوجوان کے پاس تو صرف اور صرف سند کا ڈھیر ہے۔ ایم۔ ای۔ سی کی سند، ایم۔ بی۔ بی۔ ایس، ایل۔ ایل۔ بی، ایم۔ کام، ایم۔ بی۔ اے۔ سندوں کے ڈھیر کے نیچے دب کر آخری سانسیں لیتے ہوئے نوجوانوں کو بچا کر اپنا مستقبل بچانا ہوگا۔

اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو،
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ طالب علم کے مستقبل کا تعین اس کا تعلیمی رجحان اور شوق دیکھ کر نہیں بلکہ والدین کی خواہشات اور زمانے کے رواج سے کیا جاتا ہے۔ ماں اپنے لعل کو ڈاکٹر دیکھنا چاہتی ہے اور باپ کو اپنے بیٹے میں ایک کامیاب بزنس مین نظر آتا ہے جبکہ دادا جان اپنے پوتے کو پاکستانی فوج کا جانباز سپاہی بلاتے ہیں۔ ان حالات میں جب کوئی پیشن ڈاکٹر جو جز وقتی کاروبار بھی کرتا ہو مگر وہ بطور یوٹیوبر اپنے کمالات دکھانے میں شہرت رکھتا ہو تو سمجھ جانا چاہیے کہ اس کے پاس ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی سند ہے مگر اس کا شوق اور علم قلم میکنگ کا ہے۔

☆☆☆

دنیائے کفر کا بائیکاٹ ناگزیر ہو چکا

گزشتہ 70 برس سے ہندو تواکے پیروکار ہمارے مسلمان بھائیوں کو مقبوضہ کشمیر میں اذیتیں دے رہے ہیں۔ اس دوران اقوام متحدہ اور او آئی سی نے کئی قراردادیں کشمیری مسلمانوں کے حق میں پاس کیں مگر آج تک کسی بھی قرارداد پر عمل تو دُور کی بات، اس جانب توجہ ہی نہیں دی گئی کہ اس مسئلہ کو بھی حل کرنا ہے۔ ہر طرف سے مسلمانوں کو معاشی معاشرتی اخلاقی لحاظ سے گھیر کر اپنا غلام بنا رہی۔ کہیں گولے بارُود کے ذریعے کفّار اپنے مظالم کا نشانہ بنا رہے اور کہیں آئی ایم ایف کے دجالی نظام سود کے ذریعے مسلم ممالک کی معاشی صورتحال کو خراب کیا جا رہا ہے۔ یہ بات تو طے ہے کہ کفار کبھی مسلمانوں کے دوست ہو نہیں سکتے۔ یہ قرآن حکیم کا فیصلہ ہے اور جہاں قرآن وحدیث کا فیصلہ آجائے تو پھر ایک عام انسان کی وہاں رائے بے معنی ہوتی ہے۔ یہ بات ہمیں سمجھنے کی ضرورت ہے اور علمائے کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس مسئلہ کو مکمل تشریح کے ساتھ عوام اور حکمرانوں کے سامنے بیان کریں۔

امریکی صدر جو کئی مرتبہ مسئلہ کشمیر پر ثالثی کا کہہ چکا میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب مسلمانوں کو چکما دینے کے حربے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ امریکا بھارت کو نت نئی ٹیکنالوجی اور اسلحہ دے رہا مگر پاکستان جو کہ امریکی مفادات کی جنگ لڑتا رہا، نیٹو کی سپلائی بھی جاتی رہی، انفراسٹرکچر بھی تباہ ہوا، اسے امریکی حکومت یکسر نظر انداز کیے ہوئے ہے۔ حالانہ قربانیاں زیادہ پاکستان نے دیں۔ لاکھوں سپوت قربان کیے مگر پھر بھی امریکی بھارت کا ہی ساتھ دے رہے۔ یہاں پر یہی ضرب المثل صادق آتی ہے کہ ''بھینسیں بھینسوں کی ہی بہنیں ہوتی ہیں۔'' کفار کے ہی دوست ہیں مسلمانوں کے نہیں۔ اگر کفار مسلمانوں کے دوست ہوتے تو پھر نہ معرکہ بدر وحنین کی ضرورت پیش آتی اور نہ ہی طارق بن زیاد سپین کے ساحل پر کشتیاں جلا کر سپین فتح کرتے۔ کفّار ازل سے ہی مسلم قوم کے دشمن ہیں۔ ہر دور میں طاغوت قوتوں نے مسلمانوں کی تباہی کی منصوبہ بندی کی مگر جب تک اُمت مسلمہ کی صفوں میں اتحاد موجود تھا، تب تک مسلمانوں نے خدا کی نصرت سے کفار کو شکست سے دوچار کیا مگر جیسے ہی ہم پتنگوں کی طرح بکھرنے لگے تو پھر کفار نے ہمیں

لتاڑنا شروع کر دیا۔ بقولِ علامہ محمد اقبالؒ:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
ہم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

جب تک ہم نے تعلیمات قرآن کو اپنائے رکھا، اُس وقت تک ہماری قوم فتح و نصرت سے ہمکنار ہوتی رہی۔ جب ہم نے احکام خداوندی کو پس پشت ڈال دیا، ذلت و رسوائی ہمارا مقدر بن گئی۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

صرف فضائے بدر پیدا کی ضرورت کشمیر تو کیا پوری دنیا ہم فتح کر سکتے ہیں۔ اپنے اندر جذبہ جہاد کو پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر جا کے کہیں فتح و نصرت ہمارا مقدر ہوگی۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام اسلامی ممالک آپس میں متحد ہو کر دنیائے کفر کا بائیکاٹ کریں اور اپنے مقبوضہ مقامات واپس لیں تاکہ کفار کو پتا چلے کہ اب بھی مسلمانوں کی صفوں میں فاروق اعظمؓ، خالد بن ولیدؓ، محمود غزنوی کی روحیں موجود ہیں۔

اگر اسی طرح کفار مسلمانوں کو یونہی تہ تیغ کرتے رہے تو پھر تو نہ ہم کبھی سر پاور بن سکیں اور نہ ہی ہمارے ممالک ترقی کر سکیں گے۔

(محمد اکرام الحق، جہلم)

☆☆☆

ماہ اگست کے شمارے کا ایک جائزہ

اس دفعہ آزادی نمبر انتہائی شاندار رہا۔ سرورق نے دل موہ لیا۔ اُردو ڈائجسٹ کے پرانے ادوار کی یاد دلا دی۔ جب سرورق ایسے ہی خطاطی، مصوری یا خوبصورت مناظر سے سجا ہوتا تھا۔ شخصیات کے چہرے سرورق پر دیکھ دیکھ کر اب دل اوب سا چکا تھا۔ ایسے میں ماہ جولائی اور اگست کے سرورق خوشگوار تبدیلی کا احساس لیے محسوس ہوئے۔

پہلے صفحے پر نظر پڑتے ہی ڈوبتے جہاز کے فرسٹ کلاس مسافر کا خوبصورت ڈیزائن سامنے آیا۔ دل کو عجیب حیرت نے آن گھیرا۔ وجہ یہ کہ اس کتاب کا سرورق میں نے کسی ویب سائٹ پر دیکھا تھا۔ غالباً کوئی کتب کی سائٹ ہوگی۔ اس وقت یہ کتاب پڑھنے کی دلی خواہش جاگی مگر ایک تو انگریزی کی بہت زیادہ شدبد نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواہش ادھوری رہی کیونکہ جب انگریزی پر عبور نہ ہو تو کتاب پڑھنے میں وہ فراوانی نہیں رہتی جو ہونی چاہیے۔ نتیجہ، لطف نہیں آتا اور پھر صاف سی بات ہے ہم ٹھہرے اُردو کے قدر دان۔ جو مزا اپنی میٹھی زبان میں مضمون پڑھنے کا ہے، وہ انگریزی میں کہاں۔ من کی مراد پوری ہوئی تو فٹافٹ صفحہ ۴۶ پر پہنچ گیا۔ انتہائی خوبصورت سلیس اُردو ترجمے میں زبردست تاریخی معلومات، رونگٹے کھڑے کر دینے والی بھیانک تلخ سچائیاں اور خوفناک مگر سچائی کی عکاسی کرتی تصاویر نے بھوک پیاس اُڑا دی۔

ہم نے تو یورپ کو ہمیشہ مہذب قوموں کا مجموعہ ہی گردانا مگر یہ تو وحشیت اور بربریت میں سب کے باپ نکلے۔

آج کے دور میں ایشیائی ممالک، کمزور اور ترقی پزیر، دونوں کے لیے سخت دلی کا مظاہرہ کرنا، شاید ان کی اسی اندرونی فطرت کی ہلکی سی جھلک ہے۔ کیونکہ انسان جتنا بھی تعلیم یافتہ، مہذب اور سونے کا بن جائے، اس کی فطرت کبھی نہیں بدلتی۔

ہجرت کے المناک نقوش کے تحت شائع ہونے والی تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ عام خون خرابے کی داستانوں سے ہٹ کر کچھ الگ تھا اس مجموعے میں۔ خاص طور پر خط بے نشاں، پتلی بائی۔ پتلی بائی کی کہانی چھوٹا پاکستان، لازوال کہانی لگی۔ عنوان پڑھ کر پہلے تو حیرت ہوئی کہ آج کل نیا پاکستان کا شور و غوغا تو سن ہی رہے مگر اب یہ چھوٹا پاکستان کیا ہے؟ عنوان کے اچھوتے پن نے پوری کہانی پڑھنے پر مجبور کر دیا۔ پتلی بائی کا کردار رُلا گیا۔ پھر سمجھ میں آیا کہ معصوم پتلی بائی کے نزدیک کسی بھی ملک میں بنا پاکستان کا سفارت خانہ اس کے لیے چھوٹے پاکستان کی حیثیت رکھتا ہے۔ بات دل کو لگی۔ تمام مضامین اور مزاح بھی کمال کا انتخاب تھے۔ ہو سکے تو بچوں کے لیے کچھ صفحات مختص کر دیں تاکہ ہم اپنے بچوں کو ابھی سے اس ڈائجسٹ سے متعارف کروا سکیں جیسے ہمارے بڑوں نے ہمیں کروایا۔ (محمد اویس قرنی، اسلام آباد)

◇◇◇

Name of work	Estimated Cost	T.S No & Date	Tender Fee	Completion Period	Last Date for submission of application to purchase	tenders Date & time for receipt/opening of Tenders
2	3	5	6	7	8	9
CONSTRUCTION OF 10 NOS PHP IN DISTRICT SARGODHA PHASE I ADDITIONAL FACILITEIS				3 Month		
One at 04 SB District Sargodha (Balance work)	0.939 (M)	2013-14.399 Dev Dated 24.04.2014	10000.-	3-Month		
One at Doda District Sargodha (Balance Work)	0.826 (M)	2013-14 399 Dev Dated 24.04.2014	10000.-	3-Month	14.09.20	
One at Nishtarabad District Sargodha (Balance Work)	1.011 (M)	2013-14.399 Dev Dated 24 04.2014	10000.-	3-Month		17.09.20 Receipt 12:30PM
One at Shaheenabad District Sargodha (Balance Work)	0.785 (M)	2013-14.399 Dev Dated 24.04.2014	10000/-			Opening 1:00 PM
One at Chak No. 93 NB District Sargodha (Balance Work)	0.854 (M)	2013-14 399 Dev Dated 24.04.2014	10000	3-Month		
One at Chak Saida (Bhalwal) District Sargodha (Balance Work)	0.269 (M)	2 013-14 399 Dev Dated 24 04 2014	10000			
Construction of Deputy Commissioner Office Complex Sargodha ADP No. 3131 2020-21	389 759 (M)	CEBNZ 1803 D dated 18.08 2020	10000			

IPL-7285

Executive Engineer
Buildings Division Sargodha

TENDER NOTICE

1. Sealed Tenders based on item rates/ percentage above or below the approved estimated (DNIT) are hereby invited, for the works mentioned below from the contractors/firms enlisted/renewed with C&W Department in the field of Buildings works for the year 2020-21.

2. tender documents can be obtained from the date of publication of invitation to bids in the press from any of the below mentioned offices, upon written request accompanied with attested copies of enlistment/ upto date renewal letter, PEC license, Identity Card of Contractor/Managing Partner/Director of the firm along with registered power of attorney and on payment of prescribed tender fee in the form of CDR/Bank Draft/ Cashier's Cheque from any Scheduled Bank:-

i)Chief Engineer, Punjab Buildings Department (North Zone), Lahore.
ii) Commissioner, Sargodha Division, Sargodha.
iii) Superintending Engineer, Buildings Circle, Sargodha.
iv) Deputy Commissioner Sargodha.
v) Executive Engineer, Buildings Division, Sargodha.
vi) Assistant Commissioner Concern.

3. Tender rates and amounts should be filed in figures as well as in words and tenders should be signed as per general directions given in the tender documents. No rebate on tendered rates will be acceptable.

4. Tenders will be received in the offices of Chief Engineer, Punjab Buildings Department (North Zone), Lahore and Commissioner, Sargodha Division, Sargodha and will be opened simultaneously on fixed date and time by the respective Tender Opening Committee at the aforementioned venues in the presence of intending contractors or their representatives who wish to be present.

5. Conditional tenders and tenders without earnest money @2% of Estimated cost in shape of CDR/Bank Draft/Cashier's Cheque from any scheduled Bank not exceeding five percent of the estimated Cost and attested copies of registered partnership deed and power of attorney in case of firms will not be entertained.

6. The procuring agency may reject all bids or proposals at any time prior to the acceptance of a bid or proposal.

All PPRA Rules shall be observed strictly.